فلسطین:

ایک مختصر تاریخ

صیہونیت کی جڑوں سے آج تک

محمد الہامی

ترجمہ کردہ:

رمیشہ وقار

نگرانی از: طیبہ الخزامی

فلسطین کی کہانی کا خلاصہ

Kolasa Kisat Filistin

مصنف: محمد الہامی

Twitter.com/melhamy

t.me/melhamy

youtube.com/melhamy

melhamy.blogspot.com

fb.com/profile.php?id=100091925270490

goodreads.com/author/show/4479089

فلسطین کی کہانی کا حصہ

بیان حلفی

اس کتاب کا اردو میں ترجمہ رمیشہ وقار نے کیا ہے اور اس کی نگرانی طیبہ الاخزامی نے کی ہے۔ اس کی اجازت مصنف محمد ثانی نے 30 محرم 1447 ہجری 25 جولائی 2025 کو دی ہے۔ ترجمہ فلسطین کی کہانی پڑھانے اور اسے اپنی روزمرہ کی دعا میں شامل کرنے کے لیے ہے۔

ہم، رمیشہ اور طیبہ، ہم کتاب کے مواد میں کسی قسم کی ترمیم کی اجازت نہیں دیتے اور نہ ہی اس کی فروخت یا تجارتی استحصال کی اجازت دیتے ہیں۔

الیکٹرانک ایڈیشن مفت ہے۔

غزہ اور فلسطین کے لوگوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

طیبہ الخزامی

رمیشہ وقار

عمان، مسقط

5-صفر 1447ھ، ہجری

بسم الله الرحمن الرحيم

درجہ بندی

تعارف

میری تصنیف کردہ تمام کتابوں میں، میں اس مطالعہ کو سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا اور مطالبہ کرنے والا سمجھتا ہوں۔ شروع سے، میں جانتا تھا کہ یہ ایک مشکل کام ہو گا، لیکن جیسے جیسے میں نے گہرائی میں جانا، مجھے یہ اس سے بھی زیادہ مشکل معلوم ہوا جتنا میں نے شروع میں سوچا تھا۔ کئی مواقع پر، میں نے اسے روکنے اور ملتوی کرنے پر بھی غور کیا لیکن جلد ہی اس سوچ کو شیطانی فتنہ قرار دے کر رد کر دیا۔ کتنے کاغذات میرے وقت اور محنت کو جذب کر چکے ہیں، صرف شیلف ہونے کے لیے، انھیں ختم کرنے کے لیے 'صحیح وقت' کا انتظار کر رہے ہیں؟ پھر بھی جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، فارغ وقت کم ہوتا جاتا ہے، ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں، اور توانائی اور صحت دونوں میں کمی آتی جاتی ہے۔ ایک مصنف کے لیے کام کو ملتوی کرنے سے بڑھ کر کوئی فیصلہ برا نہیں ہے۔ ملتوی کام شاذ و نادر ہی مکمل ہوتا ہے۔

میں چھوٹی عمر سے ہی مسئلہ فلسطین سے واقف ہو گیا تھا، اور یہ میری زندگی کے ہر مرحلے میں میرے لیے گہری تشویش رہا ہے۔ یہیں سے میں نے سب سے پہلے اس مسئلے کی گہری پیچیدگی اور حساسیت کو سمجھنا شروع کیا جس کی وجہ سے اسے کتاب میں خلاصہ کرنا ایک مشکل کوشش ہے۔ اصل میں، یہ مطالعہ اسلامی تاریخ کے پراجیکٹ میں جدید اور عصری ادوار تک پہنچنے کے بعد، بعد میں لکھا جانا تھا۔ تاہم، الاقصیٰ کے بحران (طوفان الاقصیٰ) کے پھوٹنے کی ضرورت تھی کہ اسے جلد از جلد حل کیا جائے، کیونکہ یہ اب ہمارے دور کا اہم مسئلہ بن چکا ہے۔۔

اس مسئلے سے وابستہ زیادہ تر رہنماؤں نے اپنے تجربات کو یادداشتوں اور ڈائریوں میں درج کیا ہے، یا یہ ریکارڈ مرنے کے بعد مرتب کیے گئے تھے۔ یہ مجموعہ فلسطینیوں، عربوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ صیہونیوں، برطانویوں اور امریکیوں پر محیط ہے۔ اس موضوع سے متعلق تقریباً ہر اہم شخصیت کم از کم ایک مطالعہ کا مرکز رہی ہے۔ مزید برآں، مؤرخین اور محققین نے اس مسئلے کا تجزیہ کرنے اور حل کرنے کے لیے کافی کوششیں کی

ہیں۔ ان کی تعداد، اور ان کی اشاعتیں، بے شمار ہیں۔ یہ ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط دستاویزات اور اخبارات کے وسیع ذخیرہ کے علاوہ ہے۔

اس بات کا اعادہ کرنے کے لیے، اسلامی تاریخ کی سیریز کا مجموعہ مورخین یا علمی محققین کو اپیل کرنا نہیں ہے بلکہ اس عقیدے کے مشن میں مصروف لوگوں کے لیے ہے۔ اس کا مقصد انہیں اسلامی تاریخ کے اہم موضوعات، اسباق اور بصیرت کو سمجھنے کے لیے ایک مختصر جائزہ فراہم کرنا ہے۔ یہ مقصد براہ راست تحریری انداز، انداز اور لہجے کو متاثر کرتا ہے جو میں نے یہاں اختیار کیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مختصر ہونا ضروری ہے۔ اس مطالعہ کو تیار کرنے میں اس طرح کی اختصار کو حاصل کرنا سب سے بڑا چیلنج ہے، اس کام کے پیش نظر ایک وسیع و عریض تاریخ کو بھرپور تفصیلات اور لاتعداد ذرائع سے کم کرنا ہے۔

اس موضوع کے اندر کوئی مسئلہ، واقعہ یا شخصیت نہیں ہے جس میں متعدد متضاد اور مختلف آراء ہوں۔ اکثر، یہ نقطہ نظر مکمل طور پر مخلص سے کم ہوتے ہیں، کیونکہ مصنفین کے محرکات اور سیاسی منظرنامے میں ان کی پوزیشن کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ایماندار ہونے کی کوشش کی وہ ہمیشہ اندرونی اور بیرونی حساسیت کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ سب کچھ ظاہر کرنے کے قابل نہیں تھے جو وہ جانتے تھے۔ کچھ خاموش رہے، جب کہ دوسروں نے اشارہ کیا- اشارے جو صرف ایک باخبر ہم عصر ہی سمجھ سکتا ہے۔ وقت سے دور قاری کے لیے ان باریکیوں کو سمجھنا اور بھی مشکل ہے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے، اتنے وسیع و عریض سمندر سے اس تاریخ کا خلاصہ نکالنا اس سے بڑا چیلنج کیا ہو سکتا ہے؟

میں اسے تسلیم کرتا ہوں، چاہے میں نے مطالعہ میں کتنی ہی کوشش کی ہو۔ اس طرح، بہت کچھ لامحالہ چھوڑ دیا جائے گا. غلطیاں بھی، ان سے بچنے کی میری بھرپور کوششوں کے باوجود پھسل جائیں گی۔ حالات نے مجھے اس مطالعے کو ان ذرائع کی فہرست سے ختم کرنے پر مجبور کیا جن کا میں جائزہ لینے میں کامیاب رہا۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی —حالانکہ یہ معمولی ہے —اس تاریخ کی پیروی کرنے، سمجھنے اور خلاصہ کرنے کے لیے۔ اگرچہ میں

چھوٹی عمر سے ہی اس مسئلے سے منسلک رہا ہوں، پڑھنا، لکھنا، اور باخبر رہنا، ہر نئے ذریعہ نے مجھے مزید چونکا دیا اور تباہ کیا۔ دھوکہ دہی کا پیمانہ آپ کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اور المیہ زیادہ ہولناک ہے۔ اس سے ہماری قوم اور فلسطین کو آزاد کرنے کے لیے درکار کوششیں توقع سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

میں نے تاریخ کا ایک متوازن اکاؤنٹ فراہم کرنے کے لیے کام کیا ہے، مذہبی، سیاسی اور سماجی جہتوں کو حل کیا ہے جو اس مسئلے سے پیچیدہ طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے اس تاریخ سے اہم اسباق اور بصیرت کے ساتھ داستان کا اختتام کیا۔ ان لوگوں کے لیے جن کے پاس پوری کہانی پڑھنے کے لیے وقت یا صبر نہیں ہے، وہ براہ راست ان خلاصوں کی طرف جاسکتے ہیں، جو کہ ان شاء اللہ کافی ہونا چاہیے۔

قارئین کو طریقہ کار اور سائنسی تفصیلات کی بھول بھلیاں میں ڈوبانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس مطالعے کا مقصد مختصر ہونا ہے، اور غیر ضروری طور پر طویل نہیں ہے۔ لہذا، میں یہ نوٹ کرتے ہوئے مطالعہ کے نقطہ نظر کا مختصر خاکہ پیش کروں گا کہ قارئین فوٹ نوٹ پر غور کیے بغیر مرکزی متن پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں، جو بنیادی طور پر ان لوگوں کے لیے ہیں جو مزید تلاش کرنا چاہتے ہیں یا اس کے ماخذ سے معلومات کی جانچ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر قارئین کو ضرورت سے زیادہ فوٹ نوٹس کی توجہ ہٹائے بغیر بیانیے کے بہاؤ کو برقرار رکھنے میں مدد کرتا ہے۔ اگرچہ میں نے فوٹ نوٹ کے زیادہ استعمال سے گریز کیا ہے، لیکن مجھے احساس ہے کہ کچھ تفصیلات قارئین کو حیران کر سکتی ہیں، جس سے حوالہ جات ضروری ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ذرائع بنیادی ہیں، خاص طور پر عینی شاہدین کی یادیں۔ اگرچہ میں نے موضوع سے ہر فرد کی شمولیت یا تعلق کی تفصیل نہیں بتائی ہے، لیکن ان اعداد و شمار سے واقف یا تصدیق کرنے کے خواہاں افراد کے لیے سیاق وسباق قابل فہم ہے۔[1]

[1] اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے، میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ میں نے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لیے محمود الصباغ کی کتاب The Truth About the Special Organization and Its Role in the Muslim Brotherhood's Call کا حوالہ دیا۔ پہلی نظر میں، قاری سوچ سکتا ہے کہ محمود الصباغ کون ہے اور عبد القادر الحسینی اور امین الحسینی کے بارے میں بحث سے ان کی کیا مناسبت ہے۔ یہ تجسس ممکنہ طور پر السباغ کے پس منظر کے بارے میں معلومات کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے - اس نے اخوان المسلمون اور عرب اعلیٰ کمیٹی کے درمیان رابطہ افسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ عبد القادر الحسینی کے قریبی دوست اور معاون بھی تھے، اسلحہ سازی کی کوششوں کی نگرانی کرتے تھے اور فلسطین بھیجے گئے اخوان کے پہلے رضاکار یونٹ کی قیادت کرتے تھے۔ ان سب کو تفصیل سے بیان کرنا مرکزی متن یا اس کے فوٹ نوٹ کے دائرہ کار سے باہر ہو جائے گا۔ اسی طرح، میں نے ملیکہ اوفکر کی کتاب کا حوالہ دیا، جو شاید ابتدائی طور پر قارئین کو حیران کر دے کیونکہ

میں یہ واضح کرنے سے بھی قاصر تھا کہ میں نے اس مخصوص اکاؤنٹ کی شناخت کیوں کی اور اسے دوسروں پر ترجیح دی، کیوں کہ اس طرح کی وضاحت بہت طویل اور خلاصہ کے لیے موزوں نہیں ہوگی۔ تاہم، میں کبھی کبھار اس معاملے پر فوٹ نوٹ میں ایک مختصر نوٹ کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی ماخذ بنیادی یا عینی شاہد کی یادداشت نہیں ہے، تو یہ عام طور پر ایک سرکردہ مورخ کا مطالعہ ہے جس نے کافی اور اعلیٰ معیار کی تحقیق کی ہے، یا تو عام طور پر مسئلے کی تاریخ پر یا خاص طور پر زیر نظر موضوع پر۔ یہ مورخین اکثر محفوظ شدہ دستاویزات پر انحصار کرتے ہیں جو یا تو ناقابل رسائی ہیں یا حاصل کرنا مشکل ہیں۔ میں نے کسی بھی ایسے ذرائع سے مکمل طور پر اجتناب کیا ہے جو جذباتی یا علمی اعتبار سے قابل اعتبار نہ ہوں۔

جو کوئی بھی فوٹ نوٹ اور ان کی ترتیب پر غور کرے گا وہ سمجھے گا کہ میں نے مختلف تکنیکی، علمی اور تاریخی عوامل پر غور کیا ہے جن کی یہاں مکمل وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر، عثمانی دور پر بحث کرتے وقت، میں اسلامی شخصیات کے بجائے کسی قوم پرست عرب رہنما کے الفاظ کا حوالہ دے سکتا ہوں، یا میں کسی ایسے شخص کا حوالہ دے سکتا ہوں جس کی گواہی کسی خاص واقعہ کے بارے میں ناقابل تردید ہو، براہ راست عینی شاہد کے اصول پر قائم ہو۔ مشہور واقعات سے خطاب کرتے ہوئے، میں عام طور پر ماخذ کا حوالہ دینے سے گریز کرتا ہوں جب تک کہ اس میں سانحہ یا قتل عام شامل نہ ہو۔ ایسے معاملات میں، میں قارئین کو رپورٹ کے بجائے کسی یادداشت کی طرف ہدایت دینا پسند کرتا ہوں، کیونکہ رپورٹس میں پائے جانے والے خشک اعداد و شمار کے مقابلے یادداشتیں زیادہ ذاتی، جذباتی پہلو کو پکڑتی ہیں۔ اگر قارئین مزید دریافت کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ کسی ایسے ماخذ سے رجوع کیا جائے جو واقعہ کے جذباتی وزن اور سانحہ کو سرد، منظم انداز میں بیان کرنے کے بجائے بیان کرے۔

اس میں ایک مراکشی خاتون کی قید کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ تاہم، میرا حوالہ یہودیوں اور مراکش کی حکومت کے درمیان تعلقات سے متعلق ہے۔ اپنی کتاب میں، اوفکر نے اپنے والد، جنرل محمد اوفکر کے بارے میں کم معلوم تفصیلات شامل کی ہیں، جو اس وقت مراکش کی حکومت کی دوسری سب سے طاقتور شخصیت تھے۔ اس طرح کی بصیرتیں، اگرچہ بنیادی بیانیہ کے لیے مماس ہیں، قیمتی سیاق و سباق فراہم کرتی ہیں۔

میں نے بڑے پیمانے پر فوٹ نوٹ اور حوالہ جات کا استعمال کیا ہے، جن کا میں اعادہ کرتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس مطالعے کے عام قارئین کے لیے نہیں ہیں، جہاں بھی مجھے یقین ہے کہ وہ مددگار ثابت ہوں گے، اور جہاں میں نے سوچا کہ یہ زیادہ فائدہ مند ہوں گے انہیں کم سے کم کر دیا ہے۔ اس نقطہ نظر کے پیچھے جو طریقہ کار ہے وہ یہاں بیان کرنے کے لیے بہت وسیع ہے، لیکن جو بھی اس پر غور کرنے کے لیے وقت نکالے گا وہ سمجھ جائے گا۔ میں نے جو بھی کامیابی حاصل کی ہے وہ صرف خدا کی وجہ سے ہے، اور کوئی بھی غلطی یا نگرانی میری اپنی ہے یا شیطان کی طرف سے۔ خدا اور اس کا رسول ایسے عیبوں سے پاک ہیں۔

صیہونیت کی جڑیں

جروشلم اور فلسطین پر یہودیوں کا دعویٰ ان کے عقیدہ پر مبنی ہے کہ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جہاں ان کے انبیاء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب رہتے تھے۔ موسیٰ اور ہارون نے بھی وہاں کا سفر کیا، جیسا کہ ان کے بعد نبی آئے تھے۔ یہ اسی سرزمین میں تھا کہ انہوں نے اپنی شان کی بلندی کا تجربہ کیا: داؤد اور سلیمان کا دور، جو یروشلم سے حکومت کرتے تھے۔ ان کی موت کے بعد، بادشاہی کمزور ہو گئی اور تقسیم ہو گئی، بالآخر بابل، مصری اور رومی سلطنتوں کی پے در پے فتوحات کے نتیجے میں بکھر گئی۔ اس زمانے میں یہودی یا تو اس سرزمین میں مظلوم اور شکست خوردہ لوگوں کی طرح رہتے تھے یا پھر نکال کر غلام بنا کر قید کر لیا جاتا تھا۔

یہودیوں کی جروشلم واپسی کی کوشش

تین ہزار سالوں سے یہودیوں نے مقدس سرزمین پر واپسی اور وہاں اپنی ریاست دوبارہ قائم کرنے کا خواب دیکھا ہے۔ پوری تاریخ میں، انہوں نے متعدد کوششیں کی ہیں، جن میں سے سب بالآخر ناکام ہو گئے، جس سے ان کی سنجیدگی اور فزیبلٹی پر سوالات اٹھتے ہیں۔ قابل ذکر کوششوں میں شامل ہیں۔

1. ڈیوڈ روبنی کی کوشش (1523): یہ کوشش اسرار سے گھری ہوئی ہے، اس کی زیادہ تر داستان ایک افسانوی کردار کو لے رہی ہے۔[1]
2. جوزف ناسی کی کوشش (1561): ایک یہودی آدمی جو ہسپانوی تحقیقات سے بھاگ گیا اور بعد میں عثمانی سلطان کے دربار میں داخل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہودی گروہوں کو تبریاس میں لانے کی کوشش کی، ایک شہر جسے اسے انتظامیہ اور تعمیر نو کا حق دیا گیا تھا۔[2]

ان کوششوں کے سیاق و سباق اور تفصیلات پر غور کرتے ہوئے، انہیں واپسی کی حقیقی کوششوں کے طور پر شمار کرنا مشکل ہے۔ اس کے بجائے، ایسا لگتا ہے کہ وہ عثمانی سلطان سے تعلق رکھنے والی ایک دولت مند یہودی شخصیت کی سرپرستی میں پناہ گاہ پیش کرکے انکوزیشن سے بھاگنے والے یہودیوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مکان ہے کہ یہ سب کچھ بھلا دیا جاتا اگر اسرائیل کے قیام نے صیہونیوں اور مورخین کو اپنی تاریخ میں کھوج لگانے اور پرانی کوششوں کے آثار تلاش کرنے کی ترغیب نہ دی ہوتی۔ تین عثمانی دستاویزات، مورخہ 989 AH/1581 CE، 991 AH/1583 CE، اور 993 AH/1585 CE، نے جزیرہ نما سینائی میں یہودیوں کو آباد ہونے سے روکنے کے لیے عثمانی حکام کی کوششوں پر روشنی ڈالی، خاص طور پر کوہ سینا کے آس پاس۔[3]

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور سلطنت عثمانیہ میں تبدیلیاں آتی گئیں جب کہ مغربی سلطنتیں عروج پر تھیں، یہودیوں نے ان تبدیلیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ یورپ میں، یہودیوں کی صورت حال میں بہتری آئی، قرون وسطی کے دوران ان کے حالات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مزید بر آں، ایک نیا عیسائی فرقہ — پروٹسٹنٹ

---

[1] ڈیوڈ ریوبنی کی ڈائری کا تعارف دیکھیں، ڈیوڈ روبنی کی [عربی ایڈیشن]

[2] Stanford J. Shaw، The Jews of the Ottoman Empire and the Turkish Republic، p.89. نیز ملاحظہ ہو عصام سخنی، طبریہ: تاریخ معاوذ، ص252ف۔

[3] دیکھیں: ابراہیم عبداللطیف، من وثاق التاریخ العربي (عرب تاریخ کی دستاویزات سے،) قاہرہ یونیورسٹی کے میگزین خرطوم میں دستاویزات اور تفسیر کے متن، شمارہ2، 1971، صفحہ 94ff

ازم —ابھرا اور کئی ممالک میں اس نے کنٹرول حاصل کر لیا، جس نے ایک ایسا نظریہ لایا جو یہودیوں کے لیے زیادہ پسندیدہ تھا۔ اس پر جلد ہی مزید تحقیق کی جائے گی۔ ان پیش رفت نے یہودیوں کی امیدوں کو تازہ کر دیا کہ شاید ان کی فلسطین واپسی قریب آ رہی ہے۔ ایسی امیدیں اپیلوں، نظموں، تحریروں اور بالآخر فلسطین میں یہودیوں کو جمع کرنے کی تحریکوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔[1]

ایک اہم پہلو جو اس معاملے کی حساسیت اور پیچیدگی کو بڑھاتا ہے وہ یہ ہے کہ عصری یہودیوں کا خیال ہے کہ ہیکل (عظیم ہیکل) جو سلیمان نے بنایا تھا، جو مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا، وہیں واقع تھا جہاں اب مسجد اقصیٰ کھڑی ہے۔ اس کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر نو کے لیے مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنا پڑے گا، جو کہ قبلہ اول اور اسلام کی تیسری مقدس ترین مسجد ہے۔ اس طرح، اس کی اصل میں، تنازعہ مذہبی ہے، اور اسے صرف ایک فریق کی دوسرے پر یقینی فتح کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ مقدس مقامات سمجھوتہ یا تقسیم کی اجازت نہیں دیتے ہیں، اور کسی کو ان پر عمل کرنے یا ترک کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

صیہونی عیسائیت

عیسائیوں کا خیال ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش فلسطین میں خاص طور پر بیت المقدس میں ہوئی۔ یہیں وہ نبی بنا کر بھیجا گیا، انسانیت کی نجات کے لیے مصلوب کیا گیا، اور ان کی قبر میں سپرد خاک کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر، وہ اس سرزمین کو مقدس سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ "مسیح کی قبر کو کافروں (یعنی مسلمانوں) کے قبضے سے آزاد کرائیں"۔

عیسائیت کو باضابطہ طور پر رومی سلطنت نے شہنشاہ قسطنطین کے تحت، مسیح کی موت کے تین صدیوں بعد اپنایا۔ سلطنت بعد میں دو شاخوں میں بٹ گئی۔ مشرقی بازنطینی سلطنت کا قسطنطنیہ (جدید دور کا استنبول) اس کا دارالحکومت تھا، ہاگیا صوفیہ اس کا چرچ تھا، یونانی اس کی زبان تھی، اور آرتھوڈوکس عیسائیت اس کے نظریے کے

[1] ریجینا شریف، غیر یہودی صیہونیت (عربی ایڈیشن)، صفحہ 39 ایف ایف، پی پی 59-60، 64 ایف ایف۔ الموسوعہ السیاء، عبد الوہاب الکیالی (ایڈیٹر)، جلد 3، ص 659

طور پر تھی، جب کہ مغربی رومن سلطنت کا روم اس کا دارالحکومت تھا، ویٹیکن اس کا مذہبی مرکز تھا، اور لاطینی اس کی زبان تھی۔

ریٹر سیریا کا خطہ، بشمول جروشلم، کئی صدیوں تک مشرقی رومی (بازنطینی) سلطنت کے زیر تسلط رہا، سوائے فارسی اثر ورسوخ کے مختصر وقفوں کے۔ ساتویں صدی میں شام اور مصر کی اسلامی فتوحات کے بعد ان علاقوں میں بارہ صدیوں سے زائد عرصے تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔

تاہم، صلیبی جنگوں کے دوران، مغربی عیسائی، خاص طور پر کیتھولک لاطینیوں نے ویٹیکن کے ساتھ اتحاد کیا، مختصر مدت کے لیے یروشلم کو کنٹرول کرنے میں کامیاب رہے۔ لیونٹ میں صلیبیوں کی موجودگی تقریباً دو صدیوں تک جاری رہی، لیکن خود یروشلم پر ان کی گرفت تقریباً ایک سو سال تک محدود تھی۔ 12ویں صدی کے آخر میں، عظیم مسلم رہنما صلاح الدین الایوبی (صلاح الدین) نے یروشلم کو آزاد کرایا، اور مملوکوں نے بعد میں صلیبیوں کو مکمل طور پر بے دخل کرنے کا کام مکمل کر لیا، اس طرح مسلمانوں کے لیے اس علاقے کو دوبارہ حاصل کر لیا۔

سو سال پہلے تک صورت حال ایسی ہی رہی جب دسمبر 1917 میں انگریزوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا، اس دن ایک برطانوی اخبار نے مشہور اعلان کیا کہ "صلیبی جنگیں اب ختم ہو چکی ہیں۔"[1]

تاہم، برطانوی داخلے کی قیادت آرتھوڈوکس یا کیتھولک نہیں بلکہ ایک نئے مذہبی گروہ: پروٹسٹنٹ کے ذریعے کی گئی۔ پروٹسٹنٹ ازم کا آغاز کیتھولک چرچ سے وقفے کے طور پر ہوا، جسے جرمن پادری مارٹن لوتھر (1483-1546) نے شروع کیا۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد بالآخر پروٹسٹنٹ ازم نے سب سے طاقتور مغربی ممالک میں غلبہ حاصل کر لیا، جس کا آغاز برطانیہ سے ہوا اور بعد میں امریکہ تک پھیل گیا۔

---

[1] یہ بیان جنرل ایڈمنڈ ایلنبی سے 11 دسمبر 1917 کو شہر پر برطانوی قبضے کے بعد یروشلم میں داخل ہونے کے بعد دیا گیا ہے۔ (ARK)

اس پروٹسٹنٹ گروپ نے کئی نئے عقائد متعارف کرائے، جن میں یہودیوں کے بارے میں ایک منفرد نقطہ نظر بھی شامل ہے، جو یہاں خاص طور پر متعلقہ ہے۔ کیتھولک روایتی طور پر مانتے ہیں کہ، مسیح کے آنے کے بعد، یہودی لوگ "چندے ہوئے لوگ" کے طور پر اپنا مقام کھو چکے ہیں کیونکہ انہوں نے مسیح کو مسترد کر دیا تھا۔ نتیجتاً، کیتھولکوں نے چرچ کو تورات میں مذکور وفاداروں کے جائز تسلسل کے طور پر دیکھا، جو تورات اور انجیل دونوں پر یقین رکھنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے، کیتھولک چرچ نے تورات میں یہودیوں کی مقدس سرزمین پر واپسی کے تذکروں کی تشریح کی ہے جو کہ تاریخی طور پر یا علامتی طور پر خود کیتھولک چرچ کی نمائندگی کرتے ہوئے تورات کے وفاداروں کے حقیقی روحانی جانشین کے طور پر کی گئی ہے۔

جب پروٹسٹنٹ نمودار ہوئے، تو انہوں نے ایک ایسا نقطہ نظر متعارف کرایا جس نے عصری یہودیوں کو انحراف کے طور پر نہیں بلکہ بائبل میں بیان کردہ وفادار نسب کے تسلسل کے طور پر دیکھا۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ جدید یہودیوں سے مقدس سرزمین پر واپسی کا وعدہ کیا گیا تھا-ایک واپسی کو مسیح کی دوسری آمد کے لیے ضروری تیاری کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

پروٹسٹنٹ نے بائبل کو پڑھنے اور اس کی تشریح کرنے پر پادریوں کی اجارہ داری کو بھی چیلنج کیا، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ صحیفہ ہر کسی کے لیے قابل رسائی ہونا چاہیے۔ ہر فرد مذہبی ثالثی کی ضرورت کو ختم کرتے ہوئے، خدا کے کلام کی آزادانہ تشریح کر سکتا ہے۔ اس تحریک کی وجہ سے مقامی یورپی زبانوں میں بائبل کا وسیع تر ترجمہ ہوا، اور اس کی تقسیم کو آسان بنایا گیا۔ نتیجے کے طور پر، یہودی تاریخ اور مقدس سرزمین میں اسرائیلی انبیاء کی داستانوں پر نئی توجہ مرکوز ہوئی، اکثر روایتی کیتھولک سنتوں اور تاریخی شخصیات کی قیمت پر۔ اس اجتماعی دوبارہ پڑھنے نے یسوع کو اسرائیل کے نسب میں ایک نبی کے طور پر اجاگر کیا، اس بات پر زور دیا کہ عیسائیت کی "الٰہی شخصیت" درحقیقت یہودیوں میں پیدا ہوئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ، مختلف خیالات نے جڑ پکڑ لی اور یورپی تخیل کے اندر بات چیت کی۔ پروٹسٹنٹ ازم کے زیر تسلط خطوں میں - خاص طور پر برطانیہ، جو بعد میں ایک عالمی طاقت بن جائے گا - ایک تاریخی نظریہ تیار ہوا جس نے فلسطین کی شناخت یہودیوں کی آبائی سرزمین کے طور پر کی۔ اس تناظر نے یہودیوں کو اپنے وطن سے جلاوطن ہونے والے لوگوں کے طور پر دیکھا اور بائبل کی اس مقدس سرزمین پر واپسی کی پیشین گوئی اور تصدیق کے طور پر تشریح کی۔ 17ویں صدی کے آغاز سے، کتابیں اور ادب اس تصور کی حمایت اور فروغ کے لیے سامنے آئے۔[1]

اس نے اسے ابھارا جسے اب "غیر یہودی صیہونیت" یا "عیسائی صیہونیت" کہا جاتا ہے، عقائد کا ایک امتزاج اس یقین کے ساتھ کہ یہودیوں کو فلسطین میں بحال کیا جانا چاہیے۔ بدقسمتی سے، مسئلہ کا یہ مذہبی پہلو اسلامی دنیا میں اتنا نمایاں نہیں ہے، جہاں سیکولر حکومتیں اور ان کے میڈیا، تعلیمی اور ثقافتی نظام مذہبی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اکثر سیاسی جہتوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک باریک بینی سے جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائی صیہونیت ایک گہرائی سے جڑا ہوا نظریہ ہے، جو مختلف مغربی اشرافیہ کے درمیان وسیع ہے، چاہے سیاسی، ثقافتی، یا اقتصادی۔ خلاصہ یہ کہ صیہونیت قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کے جدید تسلسل کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہ عیسائی صہیونی عقائد سیاسی نظریات کے ساتھ گھل مل گئے، مختلف شعبوں میں ایجنڈے کی تشکیل۔ حامیوں کا مقصد ان عقائد کو براہ راست نافذ کرنا تھا یا سیکولر سیاست دانوں کو ان کو پالیسی میں ضم کرنے پر راضی کرنا تھا۔ بہت سے سیکولر یا غیر مذہبی سیاست دانوں نے، اگرچہ ذاتی طور پر ان عقائد میں سرمایہ کاری نہیں کی، صہیونی نظریات کو علاقائی توسیع اور اسٹریٹجک اثر و رسوخ کے اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے فائدہ مند ہتھیاروں کے طور پر تسلیم کیا، ان خیالات کو مختلف وسائل اور توانائیوں کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس دوران

[1] یہودیوں کی فلسطین واپسی کی وکالت کرنے والے عیسائیوں کے کاموں کی مثالوں کے لیے، ریجینا شریف، غیر یہودی صیہونیت، خاص طور پر صفحہ 30-31، ff42، اور p.55 اور اس سے آگے دیکھیں۔

ایک تیسرے گروہ نے صہیونیت کو یورپ میں یہودیوں کے سوال کے طور پر ایک مؤثر حل کے طور پر دیکھا اور اسے یورپ سے یہودی آبادیوں کو ان کے مطلوبہ وطن واپس منتقل کرنے کا طریقہ قرار دیا۔[1]

نظریاتی، سیاسی اور تزویراتی مفادات کے اس سنگم نے اسلامی تاریخ کے سب سے اہم ادوار میں ایک ساز گار لمحہ پایا: محمد علی پاشا کی طرف سے لیونٹ پر قبضہ

اسرائیل کے نظریہ کو زندہ کرنے میں فیصلہ کن دہائی

مغرب کے حوالے سے اسلامی تہذیب کے زوال اور کمزوری کا آغاز اکثر مصر اور شام میں نپولین کی مہم کے لمحے سے ہوتا ہے۔ فرانسیسی افواج کی قیادت کرتے ہوئے، نپولین نے کامیابی کے ساتھ مصر پر قبضہ کر لیا اور شام میں پیش قدمی کرتے ہوئے ایکر تک پہنچ گئے۔ مصر میں مملوک، سلطنت عثمانیہ کے جاگیر دار، اپنے عثمانی اتحادیوں کے ساتھ، غیر ملکی فوجوں کو پسپا کرنے میں ناکام رہے۔ قاہرہ کے قیام کے بعد غیر مسلم افواج کا کامیابی سے قبضہ کرنے اور اسلامی فتح کے بعد مصر میں اسلامی دارالحکومت پر قبضہ کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ مسلم دنیا کے لیے ایک گہرا صدمہ تھا اور ایک نئے دور کے آغاز کی علامت تھا۔

فرانسیسی پریس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ نپولین - اگرچہ عقیدہ کے لحاظ سے ایک ملحد تھا جس نے سیاسی طور پر ضروری ہونے پر مذہبی عقیدت کا دعویٰ کیا تھا - نے شام کی طرف اپنی مہم کے دوران یہودیوں سے مقدس سرزمین پر واپس جانے کا مطالبہ کیا۔[2] اگرچہ اس دعوے کی صداقت غیر یقینی ہے، لیکن یہ یہودی اور مغربی مفادات کے اتحاد کا پہلا اشارہ ہے۔ تاہم، ایکڑ کے محاصرے میں نپولین کی ناکامی کے نتیجے میں اس اقدام کو عارضی طور پر معطل کر دیا گیا۔

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں ریجینا الشریف؛ عبدالوہاب المسیری، انسائیکلوپیڈیا آف جیوز، یہودیت، اور صیہونیت، جلد۔6، صفحہ 136 اور اس سے آگے

[2] رجینہ شریف، صفحہ 73 اور اس سے آگے

عثمانی برطانوی اتحاد کے ذریعے فرانسیسی افواج کو مصر سے نکالے جانے کے بعد، فرانسیسیوں نے ایک ایسے اتحادی کی تلاش کی جو خطے میں اثر و رسوخ برقرار رکھنے میں ان کی مدد کر سکے۔ انہیں عثمانی فوج کے ایک پرجوش افسر محمد علی میں ایسی شخصیت ملی جس نے فرانسیسیوں کو بھگانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نپولین اور اس کی پالیسیوں سے بہت متاثر ہو کر، محمد علی نے فرانسیسیوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا۔ فرانسیسی حمایت اور مقامی رہنماؤں اور مذہبی شخصیات کی حمایت کے ساتھ، محمد علی نے بالآخر مصر پر قبضہ کر لیا۔[1]

محمد علی کو گزشتہ دو صدیوں کے دوران مشرق وسطیٰ کی تاریخ کی سب سے بااثر شخصیات میں سے ایک کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مصر میں نپولین کی کامیابیوں سے کہیں زیادہ تھیں، جہاں اس نے تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ ایک بے رحم اور پرجوش رہنما، اس نے مصر میں ایک مرکزی، جدید ریاست قائم کی، جو مغربی طاقتوں کے مطابق تھی۔ تاہم، اس کے دور حکومت میں شدید جبر کا نشان تھا، اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ وفاداری کا دعویٰ کرنے کے باوجود، اس کی آمرانہ حکمرانی اکثر نپولین سے بھی زیادہ تھی۔

محمد علی کو غیر مسلم قوتوں کے خلاف ہر لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا، جو اکثر ان پر مجبور ہوتی تھیں۔ تاہم، اس کی فتوحات ساتھی مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں آئیں، جس نے حجاز، سوڈان، مصر اور شام میں قتل عام کی تاریخ چھوڑی۔ اس کی سب سے اہم فوجی مہم لیونٹ میں ہوئی، جہاں مصریوں کی فوج کا استعمال کرتے ہوئے، اس نے سلطنت عثمانیہ سے شام کو فتح کیا، اس کی افواج کو شکست دی اور تقریباً قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نے مغرب کے لیے ایک سنگین چیلنج کا سامنا کیا، جس نے مصر اور شام پر عثمانی حکومت کو بحال کرنے کے لیے برطانیہ، روس اور فرانس کی مداخلت کا اشارہ دیا۔ بالآخر، دس سال کی جدوجہد کے بعد، محمد علی کو شام کا کنٹرول چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا، اور مصر کو اپنی اولاد کے لیے موروثی بادشاہت کے طور پر محفوظ کر لیا۔

[1] الیاس العیوبی، تاریخ مصر فی احد الخذیوی اسماعیل، جلد 1، صفحہ 328 اور اس سے آگے، جس میں وہ فرڈیننڈ ڈی لیسپس کی یادداشتوں سے نقل کر رہے ہیں، جو فرانسیسی قونصل کے بیٹے اور محمد علی کے قریبی دوست، نیز کنسیئر کے کنسیئر تھے۔

دس سال محمد علی نے شام پر حکمرانی کی، جس میں جروشلم پر اس کا کنٹرول بھی شامل ہے، اسرائیل کے نظریہ کے احیاء میں ایک اہم کردار ادا کیا، جس نے مستقبل کے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کو متاثر کیا۔

مصر اور لیونٹ میں محمد علی کی پالیسیوں پر جارحانہ قبضے تھے، جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے استعمار سے الگ نہیں تھے۔ اس کی مسلم شناخت اور سلطنت عثمانیہ سے برائے نام وفاداری نے اس کی حکمرانی کو مزید سفاک اور خطرناک بنا دیا، اس کے خلاف مزاحمت کو پیچیدہ بنا دیا۔ شام میں ان کی پالیسی کا خلاصہ ایک ہی فقرے میں کیا جا سکتا ہے: محمد علی نے اپنی رعایا کی قیمت پر غیر ملکی تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے کام کیا، یہودیوں اور عیسائیوں کے مفادات کو مسلمانوں کے مفادات پر ترجیح دی۔ یہ ایک اسٹریٹجک تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے جس نے خطے میں زیادہ غیر ملکی اثر ورسوخ کو فروغ دیا، اکثر مقامی مسلم آبادی کو نقصان پہنچا۔

محمد علی نے مصر میں یہودیوں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنی انتظامیہ میں ضم کیا، کلیدی کرداروں میں ان کی موجودگی کو بڑھایا۔[1] ایک قابل ذکر دستاویز، جو شام پر اس کے قبضے سے نو سال پہلے کی ہے، لیونٹ میں ایک یہودی فرد کا خط ہے۔ اس میں شام، عراق اور ایران کے حالات کی تفصیل ہے، جبکہ شام میں مستقبل میں ہونے والی پیش رفت کی بھی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ شام کی فتح کے بعد، محمد علی نے یروشلم جانے والے عیسائی اور یہودی زائرین پر عائد ٹیکسوں کو ہٹا دیا، 3 یونانی آرتھوڈوکس خانقاہوں کی مرمت کی، اور عیسائی زائرین کے لیے قرنطینہ اسٹیشن قائم کیا۔ ایک قابل ذکر دستاویز، جو شام پر اس کے قبضے سے نو سال پہلے کی ہے، لیونٹ میں ایک یہودی فرد کا خط ہے۔ اس میں شام، عراق اور ایران کے حالات کی تفصیل دی گئی ہے، جبکہ شام میں مستقبل میں ہونے والی پیش رفت کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے۔[2] یہ ان علاقوں میں محمد علی کے حق میں کام کرنے والے ایک منظم یہودی نیٹ ورک کی طرف اشارہ کر سکتا ہے۔ شام کی فتح کے بعد، محمد علی نے یروشلم جانے والے عیسائی اور

[1] میخائل فینٹر، حکام اور غیر یہودی معاشرے کے ساتھ یہودیوں کے تعلقات، یعقوب لینڈاؤ میں، عثمانی دور کے دوران مصر کی آزادی، قاہرہ: ترجمہ کا قومی مرکز، 2000، صفحہ 522

[2] اسد رستم، دی مصری رائل آرکائیوز: لیونٹ کے دستاویزات کا بیان اور ان کو سمجھنے میں کیا مدد کرتا ہے اور محمد علی پاشا کے مقاصد کو واضح کرتا ہے، بیروت: امریکن یونیورسٹی، 1940، جلد 1، صفحہ 44

یہودی زائرین پر عائد ٹیکسوں کو ہٹا دیا[1]، یونانی آرتھوڈوکس خانقاہوں کی مرمت کی، اور عیسائی زائرین کے لیے قرنطینہ اسٹیشن قائم کیایونانی آرتھوڈوکس خانقاہوں کی مرمت کی، اور عیسائی زائرین کے لیے ایک قرنطینہ اسٹیشن قائم کیا۔[2] مزید برآں، اس نے ان حاجیوں سے جمع ہونے والے فنڈز راہبوں کے لیے مختص کیے، یہ ایک ایسا عمل ہے جو اس کی دوسری صورت میں مرکزی، ریاست کے زیر کنٹرول مالیاتی پالیسیوں کے برعکس ہے۔

شروع سے ہی، محمد علی نے شام پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے سے پہلے، عبادت گاہوں کی تعمیر اور تزئین و آرائش کو ترجیح دی۔[3] جروشلم میں نو عبادت گاہیں تعمیر کی گئیں،[4] متعدد گرجاگھروں اور خانقاہوں کے ساتھ،[5] یہودی کمیونٹی کے اندر، اس بات پر بحث چھڑ گئی کہ آیا یہودی تارکین وطن کی آمد کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے اضافی عبادت گاہوں یا مکانات پر توجہ مرکوز کی جائے،[6] جیسا کہ جروشلم نے یہودی اور عیسائی دونوں کی آبادی میں مسلسل اضافہ دیکھا۔[7]

عیسائیوں کو بھی عثمانی حکام کی پیشگی اجازت کے بغیر گرجاگھروں کی بحالی اور تعمیر کی اجازت تھی، جیسا کہ پہلے ضرورت تھی۔ غیر ملکیوں نے مقامی تحفظ کے تحت اسلامی مقدس مقامات تک رسائی حاصل کی، پالیسی میں تبدیلی کا اشارہ ہے۔[8] مسلم تجارت پر ٹیکس غیر ملکی تجارت کے مقابلے میں سات گنا زیادہ تھا،[9] اور غیر ملکی تجارت کی نگرانی میں نمایاں طور پر کمی کی گئی تھی۔[10] غیر ملکی تاجروں کو یہاں تک کہ دمشق میں داخلے کی اجازت تھی،

[1] قسطنطین بازیلی، عثمانی حکومت کے تحت شام اور فلسطین، ترجمہ طارق مسرانی، ماسکو: پروگریس پبلشرز، 1989، صفحہ 114-116؛ داؤد برکات، بہادر فاتح ابراہیم، قاہرہ: ہنداوی فاؤنڈیشن، 2014، صفحہ۔35

[2] اسدرستم، ج3، ص134۔

[3] اسدرستم، ج3، ص136۔

[4] Ibid. 2، vol.4، صفحہ 296 اور اس سے آگے۔

[5] لطیفہ سلیم، شام میں مصری حکمرانی، صفحہ 248-250۔

[6] کیرن آرمسٹرانگ، یروشلم: ایک شہر، تین عقائد، صفحہ 564۔

[7] قسطنطین بازیلی، ص117؛ محکرات تاریخ، نامعلوم مصنف، صفحہ 69-70

[8] Ibid., p.162. 6

[9] داؤد برکات، صفحہ 133، 143۔

[10] 8اسدرستم، جلد2۔3، ص۔135 .

[1]جہاں برطانوی قونصل کے لیے ایک رسمی استقبالیہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔[2] عثمانی بحری جہاز، اس دوران، شام میں تجارت سے محروم ہو گئے،[3][علاقے کی اقتصادی حرکیات میں ایک اور تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔

غیر ملکیوں اور یہودیوں کو شام میں اسکول قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی، جہاں امیر یہودی خاندانوں نے ایک تعلیم یافتہ یہودی اشرافیہ بنانے کے لیے جدید ادارے قائم کیے تھے۔ ان اسکولوں کا مقصد مشرقی یہودی نوجوانوں کو بااختیار بنانا تھا کہ وہ مغربی اثر و رسوخ سے آزادانہ طور پر اپنی کمیونٹی کی وکالت کرنے کے لیے بااختیار بنانا تھا۔[4] مزید برآں، عیسائیوں اور یہودیوں کو فوج اور انتظامیہ میں عہدوں پر تعینات کیا گیا، جو عہدے اور القابات حاصل کرتے تھے[5]۔ پہلی بار، یہودیوں، عیسائیوں، آرمینیائیوں اور غیر ملکیوں کو "یروشلم ایڈوائزری کونسل" میں شامل کیا گیا، جو شہر کے معاملات کی نگرانی کرتی تھی[6]. اقتصادی اور تجارتی منصوبوں کا آغاز کرتے ہوئے انہیں اسلامی اوقافی زمینوں اور عثمانیوں کے زیر کنٹرول جائیدادوں تک رسائی فراہم کی۔[7]

1839 میں، جروشلم کی تاریخ میں پہلی بار، انگریزوں نے ایک قونصل خانہ قائم کیا، جو جلد ہی یروشلم اور وسیع تر شامی علاقے میں یہودی اور پروٹسٹنٹ کمیونٹیز کی حمایت میں اہم بن گیا۔ اس قونصل خانے نے نہ صرف برطانوی اثر و رسوخ کے لیے ایک اہم مرکز کے طور پر کام کیا بلکہ مشنری کوششوں کے لیے ایک اڈے کے طور پر بھی کام کیا۔[8] اس وقت کے آس پاس، جافا میں امریکی قونصل نے جروشلم میں ایک نائب قونصل کی تقرری کی بھی کوشش کی[9]، جو کہ شہر میں باضابطہ امریکی شمولیت کا آغاز تھا[1]۔

---

[1] داؤدبرکات، ص132۔

[2] مگکرات تاریخ، ص25، 68-69؛داؤدبرکات، ص189۔

[3] محمد فرید، البجۃالتوفیقۃفی تاریخ مقیسۃالأعلاءالخدویۃ، ص165

[4] داؤدبرکات، ص189

داؤدبرکات، ص189؛ Stanford J. Shaw, The Jews of the Ottoman Empire, p.158; جوناتھن فرانکل، دمشق کا معاملہ: رسمی قتل، سیاست، اور یہودی1840 میں، صفحہ 376

[5] داؤدبرکات، ص189

[6] اسد رستم، الاصول العربیہ ل تاریخ سوریۃفی احد محمد علی پاشا، جلد5، صفحہ 224-26؛ مصطفٰی عبدالغنی، الوقف العلا القدس، ص120-23

[7] ۔اسد رستم، المحفوظات الملکیہ المصریۃ، ج2، ص326، ج3، 65-66۔

[8] کیرن آرمسٹرانگ، ;pp.565-66داؤدبرکات، ص143؛عبدالعزیز عواد، ہجرت الیہود الا فلستین و مواقف الدولہ العثمانیہ منی، جلد3، صفحہ 155

[9] اسد رستم، المحفوظات الملکیہ، ج2، ص349

اس دور کے دوران، دیوارِ بُراق (جو عام طور پر دیوارِ گریہ کے نام سے جانی جاتی ہے) کے احاطے پر جزوی طور پر قبضے کی پہلی منظم یہودی کوشش کی گئی، جو برطانوی کونسل کی مدد اور مصری حکام کی منظوری سے انجام پائی۔[2] محمد علی کے دور حکومت میں، یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک قانونی حیثیت حاصل تھی جس نے انہیں بڑی حد تک معمول کی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا۔ مصری حکام نے ان فوجیوں کو بھی سزا دی جنہوں نے غیر ارادی طور پر ان گروہوں کو ناراض کیا، بعض اوقات سنگین واقعات میں ملوث عیسائیوں یا یہودیوں کو معاف کر دیا، جیسے کہ بدنام زمانہ "بدری واقعہ"۔[3] جب کہ مصری افواج نے مقامی بغاوتوں کو انتہائی اقدامات کے ساتھ کچل دیا، انہوں نے عیسائی باغیوں[4] کے ساتھ واضح نرمی کا مظاہرہ کیا۔

کچھ مساجد کو گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر دوبارہ تعمیر کیا گیا، جبکہ مسلمانوں نے شدید ظلم و ستم کا سامنا کیا۔ بہت سے لوگوں نے اسے خطے میں اسلامی اتھارٹی کے ممکنہ خاتمے کے طور پر دیکھا۔[5] اسلامی اوقاف کو بڑے پیمانے پر ضبطی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ عیسائی اور یہودی اوقاف کو محفوظ رکھا گیا اور یہاں تک کہ ان کی حمایت کی گئی[6]۔ یہاں تک کہ کچھ نے ان قونصل خانوں کے اندر عیسائی اور یہودی عملے کے تحفظ میں بھی پناہ حاصل کی

---

[1] مصطفیٰ عبد الغنی، ص69۔

[2] اسد رستم، المحفوظات، جلد4، صفحہ 294 اور اس سے آگے؛ مصطفیٰ عبد الغنی، ص125

[3] مدثر تاریخ، صفحہ 80-81، 117، 121-22؛ الیلوی ابو عسل، یقزت العالم الیہودی، ص154

"بدیری واقعہ" سے مراد محمد علی پاشا کی لیونٹ کی حکمرانی کے دوران ایک واقعہ ہے جس نے مذہبی برادریوں کے بارے میں ان کی پالیسیوں سے پیدا ہونے والے تناؤ کو بے نقاب کیا۔ 1830 کی دہائی میں اپنی حکمرانی کے دوران، محمد علی نے خاص طور پر عیسائی اور یہودی برادریوں کو نئے حقوق اور تحفظات عطا کیے، جن میں تعلیمی، تجارتی اور جائیداد کی مراعات شامل ہیں جو روایتی طور پر مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس تبدیلی نے مقامی مسلم آبادی میں ناراضگی کو فروغ دیا، جو تیزی سے پسماندہ محسوس کر رہے تھے، خاص طور پر بھاری ٹیکسوں اور لازمی بھرتی کے ساتھ۔ مخصوص "بدیری واقعہ" میں، ایک مصری فوجی نے مبینہ طور پر ایک یہودی یا عیسائی فرد کو ناراض کیا، چاہے وہ حادثاتی طور پر ہو یا کسی اور طرح سے۔ حکام نے محمد علی کی اقلیت نواز پالیسیوں کو تقویت دینے کے لیے سپاہی کی طرف سخت سے جواب دیا، جس سے مقامی مایوسی مزید بڑھ گئی۔ اس واقعے نے مسلمانوں میں اس احساس کو اجاگر کیا کہ محمد علی کی انتظامیہ خطے میں روایتی اسلامی فریم ورک کے مقابلے میں غیر مسلموں اور غیر ملکی مفادات کے حق میں نمایاں تعصب رکھتی تھی۔

See https://dorar.net/history/event/4471, and

https://www.hindawi.org/books/40837420/1.8/ [ARK]

[4] مدثر، ص78؛ رستم، المحفوظات، ج4، 356

[5] قسطنطین بازیلی، ص165؛ مدثر، صفحہ 59-60، 66؛ داؤد برکات، ص139

[6] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں محمد الہامی، فی عروقات التاریخ، جلد3، صفحہ 171 اور اس سے آگے

جنہیں غیر ملکی استثنیٰ حاصل تھا[1]۔ نتیجے کے طور پر، معزز مسلمانوں نے خود کو سابق عیسائی اور یہودی رعایا پر انحصار کرتے ہوئے پایا، جو محمد علی کی حکمرانی میں تابعداری کو برداشت کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس ہلچل کے نتیجے میں جروشلم میں آبادیاتی تبدیلی آئی، جہاں یہودی اکثریت کے طور پر ابھرے[2]، اس کے بعد عیسائی، مسلمان اقلیت میں آ گئے۔

محمد علی کے دور حکومت میں سیاسی، سماجی اور معاشی حرکیات میں تبدیلی نے ایک امیر یہودی سرمایہ کار موسی مونٹی فیور کو فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے منصوبے پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ پہل تھیوڈور ہرزل سے پہلے خطے میں یہودیوں کی موجودگی قائم کرنے کی پہلی اہم کوشش تھی۔ مونٹی فیور نے زراعت اور تجارت کے خصوصی حقوق کے ساتھ زمین کے بڑے حصے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ محمد علی نے اس تجویز کو گرمجوشی سے قبول کیا، یہاں تک کہ خریدے گئے دیہاتوں کے لیے خود مختاری کی پیشکش کی۔[3]. مونٹی فیور نے کامیابی کے ساتھ زرعی بستیاں، صنعتی منصوبے، اور یروشلم کی دیواروں کے باہر پہلا یہودی پڑوس قائم کیا، جس سے شام اور فلسطین میں یہودیوں کو مراعات یافتہ درجہ حاصل ہوا۔

برطانوی کونسل کی حمایت سے، ان پیش رفتوں نے بالآخر یہودی برادری کو ایک غیر ملکی وجود میں تبدیل کر دیا، جو خطے سے تیزی سے منقطع ہو گئی، اور ایک آباد کار برادری بننے کے قابل ہو گئی۔ پالیسی میں اس تبدیلی نے یہودیوں کو یورپ سے فلسطین منتقل کرنے کے وسیع تر خیال کو جنم دیا۔ مذہبی امنگوں کے ساتھ جو شروع ہوا وہ ایک سیاسی گفتگو میں تبدیل ہوا، جس میں دانشور حلقوں، سیاسی اجلاسوں اور آخر کار سرکاری اہلکاروں کے درمیان بات چیت ہوئی[4]۔

---

[1] قسطنطین بازیلی، صفحہ 162۔

[2] کیرن آرمسٹرانگ، صفحہ 567

[3] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں، الی لیوی ابو عصل، ص144، 150-151م171؛ ملاف وثاق فلستین، ج1، ص45؛ بین ہالپرن اور یہودا رین ہارز، صیہونیت اور ایک نئے معاشرے کی تخلیق، صفحہ 43؛ فرانکل، صفحہ 376

[4] ال-میسیری، جلد.6، p.177

مثال کے طور پر، سوشلسٹ مفکر چارلس فوئیر نے اپنی 1835-1836 کی تصنیف La Fausse Industrie میں گہری یہود دشمنی کا اظہار کیا اور تجویز کیا کہ "یہودی سوال" کا حل یہودیوں کو یورپ سے نکال کر لیونٹ میں آباد کرنا ہے[1]۔

1839 میں، Earl of Shaftesbury[2] نے فلسطین پر ایک مسافر کی کتاب کے وسیع پیمانے پر پڑھے جانے والے سہ ماہی جائزے میں ایک جائزہ لکھا۔ شافٹسبری نے دلیل دی کہ یہ زمین یروشلم میں برطانوی قونصل کی نگرانی میں یہودی مزدوروں کو رہ سکتی ہے۔ 1840 تک، اس نے اس خیال کو مزید بہتر کیا اور اسے رسمی طور پر لارڈ پامرسٹن کو ایک یادداشت (25 ستمبر 1840) میں پیش کیا، جس میں برطانیہ کے لیے یہودیوں کی آبادکاری کے اقدام کے اسٹریٹجک فوائد پر زور دیا۔[3]

ٹائمز نے رپورٹ کیا کہ یہودیوں کی آبادکاری کا خیال ایک سیاسی مسئلہ بن گیا تھا، اور برطانوی دفتر خارجہ سے قریبی تعلقات رکھنے والے اخبار، دی گلوب نے 1839-1840 کے دوران ایک اہم یہودی آبادی کو لیونٹ میں منتقل کرنے کی وکالت کرتے ہوئے مضامین شائع کیے تھے۔ اس تصور نے لارڈ پامرسٹن کی منظوری حاصل کی۔ اسی سال، اس نے قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر کو خط لکھا جس میں محمد علی کے خلاف سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک بفر کے طور پر یہودی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔[4]

---

2 Ibid., vol.3, p.167. [1]

[2] انتھونی ایشلے کوپر، 7ویں ارل آف شافٹسبری (1801–1885)، 19ویں صدی کے ایک معروف انگریز سماجی مصلح تھے جو مزدوری کے حالات کو بہتر بنانے اور پسماندہ گروہوں کی وکالت کرنے کے لیے مشہور تھے۔ ان کی بڑی کامیابیوں میں 1842 کے فیکٹری ایکٹ کی حمایت کرنا شامل ہے، جس نے 13 سال سے کم عمر خواتین اور بچوں کو کانوں میں زیر زمین کام کرنے پر پابندی عائد کر دی تھی، اور "ریگڈ سکولوں" کو چیمپیئن بنانا جو غریب بچوں کو مفت تعلیم فراہم کرتے تھے۔ وہ پیبوڈی ہاؤسنگ اسکیم میں بھی شامل تھا، جس کا مقصد محنت کش طبقے کے لیے سستی رہائش فراہم کرنا تھا، اور اس نے جانوروں کی فلاح و بہبود اور ایونجلیکل مسیحی مقاصد کو فروغ دیا۔ 1839 تک، شافٹسبری نے پہلے ہی سماجی اصلاحات میں اہم کردار ادا کیا تھا اور ایک انسان دوست اور انسانی مسائل کے وکیل کے طور پر اثر و رسوخ حاصل کر رہا تھا۔

[3] ملاف وثاق فلستين، جلد 1، صفحہ 47؛ رجینہ شریف، ص 62؛ المسیری، جلد 6، صفحہ 161

[4] رجینہ شریف، صفحہ 83-84، 91؛ رفیق شاکر النتشہ، السلطان عبد الحمید الثانی و فلستین، ص 83؛ ڈیوڈ فرامکن: تمام امن کے خاتمے کے لیے ایک امن: سلطنت عثمانیہ کا زوال اور جدید مشرق وسطیٰ کی تخلیق، صفحہ 301؛ المسیری، جلد 6، صفحہ 153 اور اس سے آگے۔

1841 میں، کرنل چرچل نے موسی مونٹیفیور کو ایک یادداشت پیش کی، جس میں فلسطین میں یہودیوں کی موجودگی کی بحالی کی حمایت کے لیے ایک سیاسی تحریک کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔[1]

خلاصہ یہ کہ شام میں محمد علی کی پالیسیوں نے یہودی ریاست کے قیام کے بارے میں بات چیت کو متحرک کیا۔ اس طرح اس کے اثر و رسوخ نے اسے، اگر بانی کے طور پر نہیں، تو اسرائیل کے حتمی قیام کا ایک اہم پیش خیمہ بنا دیا۔ بیرونی سیاسی رکاوٹوں کے بغیر، اسرائیل پچاس سال پہلے قائم ہو سکتا تھا۔[2]

---

[1] المسیری، جلد 6، صفحہ 145۔

[2] اس مطالعہ میں، میں نے معلومات کے ہر ٹکڑے کو اس کے ذرائع سے تصدیق کرنے کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس دور کے بیشتر مورخین کے درمیان موضوع کی حساس اور اہم نوعیت اور اس کی نسبت مبہم ہونے کے پیش نظر، تقریباً تمام ذرائع اصل دستاویزات یا عینی شاہدین کے اکاؤنٹس سے نکلتے ہیں۔

جب کہ شام میں محمد علی کے عزائم کو بالآخر ناکام بنا دیا گیا، ان کی پالیسیوں نے دیرپا اثر چھوڑا جس نے خطے کے مستقبل کو تشکیل دیا۔ شام پر ان کی بحالی کے بعد، سلطنت عثمانیہ نے سابقہ نظام کو مکمل طور پر بحال کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ اس علاقے میں اہم تبدیلیاں آئی ہیں، جن میں یہودی برادریوں میں اضافہ، اقتصادی منصوبے، اور ایک برطانوی قونصل خانے کا قیام شامل ہے، جو غیر ملکی اثر و رسوخ کی علامت ہے۔ مزید برآں، اقتدار میں عثمانیوں کی واپسی کا بہت زیادہ انحصار برطانوی حمایت پر تھا، جس سے غیر ملکی خاص طور پر برطانوی موجودگی کو تقویت ملی جو بعد میں سیاسی منظر نامے پر اثر انداز ہو گی۔

اگرچہ محمد علی کی کوششیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن یہودی اقدامات جاری رہے۔ شام سے اس کی روانگی اور ہرزل اور صیہونیت کے عروج کے درمیان، یہودیوں کی موجودگی کو قائم کرنے کی مختلف کوششیں کی گئیں۔ ایسی ہی ایک کوشش یہودی سیاح لارنس اولیفینٹ کی تھی[1]، جس نے 1880 میں ایک منصوبہ تجویز کیا تھا، جس کی تفصیل اپنی کتاب The Land of Gilead میں بیان کی گئی ہے۔ ایک اور برطانوی یہودی بینکر، پارلیمنٹ کے رکن، اور لورز آف صیہون کے رہنما سیموئیل مونٹاگو کا تھا، جس نے 1893 میں سلطان عبد الحمید ثانی سے مشرقی اردن میں یہودی آبادکاری کی اجازت دینے کی اپیل کی۔ اسی سال، جرمن صہیونی بوہلن ڈورف نے صیہونی آبادکاروں کو مشرقی اردن میں لانے کے لیے ایک اسکیم تجویز کی، جس کا مقصد بدویوں کو نکال باہر کرنا تھا۔[2] اس عرصے کے

[1] لارنس اولیفینٹ (3 اگست 1829–23 دسمبر 1888)، ایک رکن پارلیمنٹ، جنوبی افریقہ میں پیدا ہونے والا برطانوی مصنف، مسافر، سفارت کار، برطانوی انٹیلی جنس ایجنٹ، عیسائی صوفیانہ، اور عیسائی صیہونی تھا۔ ان کی زندگی میں ان کی سب سے مشہور کتاب ایک طنزیہ ناول پیکاڈیلی (1870) تھی۔ تاہم، اپنی موت کے بعد، وہ مقدس سرزمین، دی لینڈ آف گیلاد میں یہودی کاشتکاری کی کمیونٹیز قائم کرنے کے اپنے منصوبے کے لیے زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔ اولی فینٹ سٹرلنگ برگس کے لیے برطانیہ کے رکن پارلیمنٹ تھے۔ مزید کے لیے ویکیپیڈیا دیکھیں (لارنس اولیفینٹ۔)

[2] تھیوڈور ہرزل، تھیوڈور ہرزل کی ڈائری۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ بیروت: فلسطین ریسرچ سینٹر، 1968، صفحہ 542، ملاحظہ کریں ضمیمہ؛ امین عبد اللہ، مشعری الاستطان الیہودی منھ قان الثورۃ الفارنساء حتیٰ نیاہت الحرب العالمیہ الأعلا (فرانسیسی انقلاب سے یہودی آبادکاری کے منصوبے: عالمی جنگ کے اختتام تک) المرفاہ سلسلہ (نمبر 74)، ص۔ 145؛ عبد الوہاب المسیری، جلد 6، صفحہ 313

دوران، یورپ اور روس میں متعدد یہودی تنظیمیں قائم کی گئیں تاکہ فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی کی حمایت کی جاسکے اور وہاں کی یہودی برادری کو مالی امداد اور صنعتی ترقی کے منصوبے کے ذریعے تقویت دی جاسکے[1]۔

مزید بر آں، یہودی آبادکاری کی کوششوں کو غیر ملکی اثر و رسوخ کے ذریعے تقویت ملی، بنیادی طور پر دو ذرائع سے: بااثر سیاست دان اور یورپی دارالحکومتوں میں فیصلہ ساز، اور لیونٹ میں تعینات غیر ملکی قونصل جو ان طاقتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ممتاز سیاسی رہنماؤں نے سامراجی مفادات کو فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے مقصد سے جوڑ دیا۔ اہم کردار ارنسٹ لہارانے[2]، نپولین III کے پرائیویٹ سیکرٹری، جنہوں نے یہودیوں کی واپسی کو فروغ دینے کے لیے ایک کام کی تصنیف کی[3]، اور لارڈ پامرسٹن، برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ اور بعد میں وزیر اعظم جیسی شخصیات نے ادا کیا۔ پامرسٹن نے فلسطین میں یہودی وطن کے لیے عثمانی سلطان کی منظوری حاصل کرنے کے لیے کافی کوششیں کیں۔ لائیڈ جارج[4] سمیت دیگر وکلاء[5] نے پروٹسٹنٹ تعلیم اور بائبل کی زمینوں سے واقفیت کی طرف متوجہ کیا، یہ نوٹ کرتے ہوئے کہ وہ فلسطین[6] کے دیہاتوں کو یورپی مقامات سے بہتر جانتے تھے اور برطانوی بادشاہوں کی نسبت اسرائیلی بادشاہوں اور نبیوں سے زیادہ واقف تھے۔[7]

---

[1] عبدالعزیز عواد، ناشئة الاستطان السحیونی فی فلستین۔ المجالة التاریخیة المصریة، شمارہ، 21، ص256 اور اس سے آگے

[2] ارنسٹ لہارانے، جین ارنسٹ لہارانے 8 نومبر 1840 کو Sauveterre-de-Béarn میں پیدا ہوئے اور 10 جولائی 1897 کو Moulins میں انتقال کر گئے، ایک فرانسیسی سیاسی مصنف ہیں۔ L'Etat کے چیف ایڈیٹر: جمہوریہ کا اخبار اور تجارتی آزادی، جسے انہوں نے لوئس البخ سے لاکلوشے کے عنوان سے خریدا تھا، اس کے کاغذ نے آزاد تجارت کی حمایت کی۔ ایک لبرل کیتھولک کے طور پر، لہرانے کا تعلق نپولین III کے سیکرٹریٹ سے تھا۔ وہ 1860 کے اوائل میں یہودی قومیت کی تشکیل نو کی تجویز دینے کے لیے مشہور ہے۔ اس نے قومیتوں کے اصول پر اس نظریے کی حمایت کی جسے نپولین III نے اپنایا تھا۔ موسی ہیس نے اسے اپنے روم اور یروشلم میں نقل کیا ہے۔ آخری قومی سوال (گیارہواں خط)، 1862۔ فرانسیسی ویکیپیڈیا دیکھیں

[3] رجینہ شریف، ص77؛ المسیری، جلد6، صفحہ 153۔

[4] لائیڈ جارج حکومت کا سربراہ تھا جس میں سیکرٹری خارجہ بالفور نے اپنا مشہور اعلامیہ جاری کیا۔ اگرچہ لائیڈ جارج بالفور کے مقابلے میں بہت زیادہ بااثر تھا، لیکن اس اعلان کی اہمیت نے بالفور کو پہچان دلائی، جس نے اس کے وزیر اعظم کو زیر کیا۔

[5] دیکھیں الی لیوی ابو عصل، صفحہ 179-80۔

[6] دیکھیں شریف صفحہ 80 اور اس سے آگے۔

[7] جارج انتو نیئس، یا قزات العرب (عرب بغاوت)، ص372؛ رجینہ شریف، ص109؛ ڈیوڈ فرامکن، صفحہ 300

مجموعی طور پر، بہت سی یورپی اقوام نے بالفور جیسے وعدے یا تقابلی وعدے جاری کیے تھے۔ امریکہ نے بھی عثمانیوں پر دباؤ ڈالنے میں حصہ لیا، خاص طور پر 1881 میں روس میں یہودی مخالف قتل عام کے بعد[1]۔

جہاں تک غیر ملکی قونصلوں کا تعلق ہے، انہوں نے سلطنت عثمانیہ میں موجود غیر ملکی ملکیتی قوانین کے تحت فلسطین میں زمین خریدنے کے لیے جب بھی ممکن ہوا کام کیا، جیسا کہ وہ آج بھی دوسرے ممالک میں کرتے ہیں۔ اس عمل نے اکثر موجودہ حالات کا استحصال کیا، جن میں سے کچھ فطری طور پر قائم کیے گئے تھے، جیسے قوانین غیر ملکیوں کو زمین یا جائیداد کے مالک ہونے کی اجازت دیتے ہیں، اور دوسرے محمد علی کے دور کے بعد یا عثمانی کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کمزوری اس مالیاتی بحران میں واضح تھی جس نے عثمانی ریاست کو دوچار کیا، جس کی وجہ سے کبھی کبھار بڑھتے ہوئے قرضوں نے اسے فنڈز اکٹھا کرنے کے لیے زمینوں کی نیلامی پر مجبور کیا۔ مزید برآں، غیر ملکی قونصلوں نے غیر ملکی مراعات کے تحت یہودیوں کو تحفظ فراہم کیا اور یہودیوں کی موجودگی کو مستحکم کرنے اور انہیں بااختیار بنانے کے لیے قونصلر اثر و رسوخ کا استعمال کیا۔ اس کے علاوہ، بہت سے قونصلوں نے فعال طور پر خلاف ورزی کی اور عثمانی قوانین کی خلاف ورزی کی۔[2]

بلاشبہ، اس غیر ملکی اثر نے سلطنت عثمانیہ میں بدعنوان اہلکاروں کے ذریعے دخل اندازی کی، خواہ وہ غیر ملکی مفادات کی طرف مائل مغرب زدہ شخصیات ہوں یا ذاتی مفادات اور خواہشات کی وجہ سے۔[3]

اس طرح، یہودی ریاست کے خلاف عثمانی مزاحمت کا جائزہ لینے میں سلطان عبدالحمید دوم کے ہرزل کے رد عمل سے زیادہ شامل ہے، جس پر بعد میں بات کی جائے گی۔ یہ مزاحمت ہرزل اور صیہونیت سے پہلے کی ہے۔ جیسا کہ

---

[1] امریکہ میں صیہونی مسئلے اور اس کی ترقی کے بارے میں معلومات کے لیے، مائیکل اورین کی پاور، فیتھ، اینڈ فینٹسی: امریکہ ان دی مڈل ایسٹ، 1776 ٹو دی پریزنٹ، (عربی ایڈیشن) کا حوالہ دیں، جس کا ترجمہ الہندوی فاؤنڈیشن، لندن، 2009، صفحہ 305 اور آگے ہے۔

[2] مزید حوالہ کے لیے، مشورہ کریں:

- امین عبداللہ، یہودی آبادکاری کے منصوبے، صفحہ۔ 33 آگے۔
- عیسیٰ القدومی، عثمانی محفوظ شدہ دستاویزات اور یروشلم کے تاریخی خزانے، بیت المقدس مطالعاتی سلسلہ، شمارہ 5، سرما 2008۔
- نائلہ الوری کا جامع مطالعہ، فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی اور آبادکاری میں غیر ملکی قونصل خانوں کا کردار: 1840-1914، پہلا ایڈیشن، عمان: دار الشرق، 2007۔

[3] دیکھیں لارنس اولیفینٹ، دی لینڈ آف گیلاد، صفحہ 430، 461، 484؛ ہرزل کی ڈائری، صفحہ 356 آگے

پہلے ذکر کیا گیا ہے، سلطنت کی طاقت کے ادوار کے دوران عثمانی سلاطین نے بعد میں ہونے والی ان پیشر فتوں سے صدیوں پہلے، سینائی میں یہودی آبادکاری کی مخالفت کرتے ہوئے فرمان جاری کیے تھے۔ بعد کے عثمانی سلاطین کی طرف سے یہودی آبادکاری کے خلاف جو اقدامات اٹھائے گئے ان میں شامل تھے۔

1. موسی مونٹیفیور کے بڑے پیمانے پر آبادکاری کے منصوبے میں خلل، جس کی ابتدائی طور پر محمد علی نے منظوری دی تھی لیکن شام پر عثمانی کنٹرول کے دوبارہ قیام پر اسے ناکام بنادیا گیا۔ اس دھچکے نے مونٹیفیور کے تصفیہ کے عزائم کو بری طرح روکا اور ختم کر دیا۔[1]
2. ایک عثمانی دستاویز مورخہ ربیع الثانی 6، 1262ھ / 3 اپریل، 1846 عیسوی، سلطان عبدالمجید (عبدالمصد) کی طرف سے جروشلم کے مطصرف (گورنر) کو ایک حکم پر مشتمل ہے۔ اس حکم نامے میں گورنر کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس زمین کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے جو ایک برطانوی یہودی فرد نے خریدی تھی اور اسے کسی عثمانی شہری کو دوبارہ فروخت کر دیا جائے۔ دستاویز اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ ایک پیشگی قانون غیر ملکی یہودیوں کو فلسطین میں زمین رکھنے سے منع کرتا تھا۔[2]
3. لارڈ پامرسٹن کی جانب سے پہلے برطانوی سیکرٹری خارجہ اور بعد میں وزیر اعظم کی حیثیت سے یہودی آبادکاروں کو فلسطینی اراضی کا ایک حصہ دینے کے لیے عثمانی اجازت حاصل کرنے کی مسلسل کوششیں[3]۔ یہ بالآخر اس وجہ سے ناکام ہو گئے جس کو "Sublime Porte کی مضبوط ضد" کے طور پر بیان کیا گیا تھا[4]۔
4. 18 رجب 1287 ہجری / 13 اکتوبر 1870 عیسوی کو، سلطان عبدالعزیز نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ فلسطینی اراضی "سرکاری ملکیت" (ارازی-امیری) ہیں، اس

[1] الی لیوی ابو عصل، صفحہ 171۔
[2] عیسی القدومی۔
[3] 2 دیکھیں ملاف وثاق فلستین، جلد 1، صفحہ 47 آگے۔
[4] ہیر الڈ ٹیمپر لے، انگلینڈ اینڈ دی نیئر ایسٹ، صفحہ 444۔

طرح یہودی آبادکاری کو روکنے کے لیے انہیں عثمانی تاج سرزمین کے طور پر نامزد کیا گیا۔ ان میں سے تقریباً 20٪ زمینیں نجی ملکیت میں رہیں۔

5. 1874 میں، جروشلم کی انتظامی حیثیت کو ایک متصرفیت (گورننس) تک بڑھا دیا گیا، جس نے اسے صوبائی گورنروں کے بجائے براہ راست استنبول کے دارالحکومت سے جوڑ دیا، اس طرح اس کی انتظامی اہمیت میں اضافہ ہوا اور اسے عثمانی دارالحکومت سے قریبی نگرانی میں رکھا گیا۔

6. لارنس اولیفینٹ نے اپنے ہی 1880 کے آبادکاری کے منصوبے کی ناکامی کی وجہ سلطان عبدالحمید دوم اور اس کے عہدیداروں کی بنیادی سیاسی ترجیح کے طور پر سمجھا: اس کی تمام شکلوں میں غیر ملکی اثر و رسوخ کے خلاف مزاحمت۔[1]

7. اسی طرح، سلطان عبدالحمید II کے متواتر امریکی سفیروں کی قیادت میں بار بار کی جانے والی امریکی کوششوں کا مقصد فلسطین کو روسی قتل عام سے فرار ہونے والے یہودی پناہ گزینوں کے لیے کھولنا تھا، لیکن وہ بھی ناکام رہیں۔ بعد میں عثمانی پالیسیوں کی سرکاری امریکی مذمت کے باوجود، ان میں سے کسی بھی کوشش کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہوا۔[2]

8. جمادی الاول 1299ھ / اپریل 1882 عیسوی میں، جب روس سے یہودیوں کی ہجرت شدید ظلم و ستم کے جواب میں شروع ہوئی، سلطان عبدالحمید دوم نے ایک فرمان جاری کیا جس میں سلطنت عثمانیہ میں پناہ لینے والے یہودی افراد کو مطلع کیا گیا کہ انہیں فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کے بجائے، انہیں دوسرے عثمانی صوبوں میں ہجرت کرنے کی اجازت دی گئی، جہاں وہ اس شرط پر آباد ہو سکتے تھے کہ وہ عثمانی رعایا بن جائیں۔ دو ماہ بعد، رجب 1299 ہجری / جون 1882 عیسوی میں، مرکزی حکام کی طرف سے یروشلم کے گورنر کو ایک ٹیلیگرام بھیجا گیا، جس میں ہدایت کی گئی کہ روسی

[1] لارنس اولی فینٹ، صفحہ 464۔

[2] مائیکل اورین، صفحہ 311۔

یہودی تارکین وطن کو فلسطینی بندرگاہوں پر اترنے سے منع کیا جائے۔ انہیں لے جانے والے بحری جہازوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ انہیں کسی دوسری عثمانی بندرگاہ پر لے جائیں۔ بعد میں ان لوگوں کو ملک بدر کرنے کے احکامات جاری کیے گئے جو پہلے ہی یروشلم میں آباد تھے، اس کے بعد لیونٹ کے تمام صوبوں کو اسی طرح کی ہدایات جاری کی گئیں تاکہ یہودی تارکین وطن کی فلسطین میں آبادکاری یا غیر مجاز داخلے کو روکا جاسکے۔

1884 میں، سلطنت عثمانیہ نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس میں یہودیوں کے فلسطین کے دوروں کی مدت ایک ماہ تک محدود کر دی گئی۔ غیر ملکی دباؤ کے تحت یہ مدت 1887 میں تین ماہ تک بڑھا دی گئی۔ غیر ملکی دباؤ برقرار رہا، مسلسل عثمانی مزاحمت اور تزویراتی جوابی اقدامات کا سامنا کرنا پڑا۔ مجموعی طور پر، 1880 کی دہائی میں عثمانی چوکسی اور یہودیوں کی طرف سے خاص طور پر روس اور آس پاس کے علاقوں سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونے کی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سرگرم کوششوں کے دور کی نشاندہی کی گئی۔

9. 1890 کی دہائی کے اوائل میں، یکے بعد دیگرے حکمناموں کے سلسلے نے فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کے صہیونی منصوبے کے بارے میں عثمانیوں کی بڑھتی ہوئی بیداری کا انکشاف کیا۔ 25 ربیع الثانی 1308 ہجری / 7 دسمبر 1890 عیسوی کو سلطان عبدالحمید ثانی نے ان قانونی خامیوں کو ختم کرنے کا حکم نامہ جاری کیا جس کی وجہ سے کچھ یہودیوں کو نجی زمین خریدنے میں مدد ملی تھی۔ اس نے یہودیوں کے قبضے کو روکنے کے لیے اپنے ذاتی خزانے سے فلسطین میں زیادہ سے زیادہ زمین خریدنے کی بھی کوشش کی۔

21 ذی القعدہ 1308ھ / 28 جون 1891 عیسوی کو سلطان نے اپنے وزراء کو مزید ہدایت کی کہ وہ یورپ سے نکالے گئے یہودی تارکین وطن کو عثمانی سرزمینوں میں داخلے سے روک دیں، اس یقین کے ساتھ کہ ان کی آبادکاری بالآخر ایک "مصنوعی حکومت" کے قیام کا باعث بنے گی۔

28 ذوالقعدہ 1308ھ / 5 جولائی 1891 عیسوی کو سلطان عبدالحمید دوم نے فوجی کمیٹی کو لکھے گئے ایک خط میں اپنے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ "ان یہودیوں کو قبول کرنا اور آباد کرنا یا انہیں شہریت دینا انتہائی نقصان دہ ہے، کیونکہ یہ بالآخر موسیٰ کی حکومت کے قیام کا باعث بن سکتا ہے۔" اگلے دن، 29 ذی القعدہ 1308 ہجری / 6 جولائی 1891 عیسوی کو، عبدالحمید نے اپنے موقف کو دہرایا، اور ان ممالک کے موقف کو مسترد کرتے ہوئے جنہوں نے یہودی تارکین وطن کو داخلہ دینے سے انکار پر تنقید کی تھی۔ انہوں نے خبردار کیا، "اگر یہ یہودی سلطنت عثمانیہ کے کسی بھی حصے میں آباد ہوتے ہیں تو وہ کسی بھی روک تھام کے اقدامات کے باوجود بتدریج فلسطین میں دراندازی کریں گے، اور وہ یورپی طاقتوں کی حوصلہ افزائی اور تحفظ سے ایک موسوی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔" 1896 میں، اس نے یہودیوں کی زمین کی ملکیت کو مزید محدود کر دیا، یہودی کمپنیوں کو زمین حاصل کرنے سے منع کیا اور صرف ان یہودی آبادکاروں کے لیے غیر منقولہ جائیداد کی ملکیت کی اجازت دی جو 1893 سے پہلے آ چکے تھے۔

یہ امر اہم ہے کہ یہ تمام اقدامات تھیوڈور ہرزل کے ظہور اور صہیونی تحریک کے قیام سے پہلے نافذ کیے گئے تھے۔[1]

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مطلوبہ نتیجہ مکمل طور پر حاصل کیا گیا تھا۔ درحقیقت، عثمانی ریاست کے کمزور ہونے، مضبوط غیر ملکی اثر و رسوخ، انتظامی بدعنوانی اور دیگر عوامل کی وجہ سے خلاف ورزیاں

[1] اس موضوع پر مزید پڑھنے کے لیے دیکھیں:

- احمد اگگندز، نامعلوم عثمانی ریاست، پہلا ایڈیشن، استنبول: عثمانی ریسرچ فاؤنڈیشن، 2008، صفحہ 448 ایف ایف۔
- عبدالعزیز عواد، فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت اور عثمانی ریاست کا موقف، الادب جرنل، ریاض یونیورسٹی، 1974، جلد۔ 3، ص۔ 160. اور خان محمد علی، سلطان عبدالحمید ثانی، چوتھا ایڈیشن، قاہرہ: دار النیل، 2008، ص 214 ایف۔
- نائلہ الوارثی، غیر ملکی قونصل خانوں کا کردار، صفحہ 192ff۔
- مروان ابو شمالہ، یروشلم کی طرف صیہونی حکمت عملی، ماسٹرز تھیسس، غزہ: اسلامی یونیورسٹی، کالج آف آرٹس، 2012، صفحہ 108 ایف۔
- محمد شعبان ساوان، سلطان اور تاریخ: ہم عثمانی کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں۔

تاریخ، 1st ایڈیشن، الجزائر–بیروت: ابن الندیم، روافد، 2016. 289 .p ایف۔ نیز، اس موضوع پر ایک سرشار کام کے لیے: ڈاکٹر حسن حلق، صیہونی تحریک پر عثمانی ریاست کا موقف۔

ہوئیں[1]۔ تاہم، یہاں مقصد اس بات پر زور دینا ہے کہ عثمانیوں نے مستقل طور پر فلسطین کی حفاظت اور یہودی ریاست کے قیام کے خلاف مزاحمت کی۔ یہ خود واضح ہونا چاہیے اور اس کے لیے وسیع ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ریاستوں کے لیے یہ فطری بات ہے کہ وہ اپنے علاقوں کا دفاع کریں اور اپنی سرحدوں کے اندر آزاد اداروں کی تشکیل کے خلاف حفاظت کریں۔ بہر حال، ہمیں دو وجوہات کی بنا پر اس پر توجہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

سب سے پہلے، عثمانی ریاست پر عربوں کو دھوکہ دینے اور فلسطین کو نظر انداز کرنے کا الزام لگانے والا مروجہ جدید بیانیہ پے درپے نسلوں نے "سچ" کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس بیانیے کو آج تیزی سے فروغ دیا جارہا ہے تاکہ ترکی کی تصویر اور پالیسیوں کو مزید بگاڑا جاسکے، خاص طور پر ایردوان کی قیادت میں۔

دوسرا، جدید عرب حکومتوں کی گمراہ کن پالیسیوں نے قوم پرستی اور حب الوطنی کے تصور کو فروغ دیا ہے جس نے بہت سے لوگوں کے لیے فلسطین اور یروشلم کو ترک کرنے کی سمجھ میں آنے والی شدت کو کم کر دیا ہے۔ یہ مسئلہ سیاسی طور پر قابل قبول سمجھا جانے لگا ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ عرب اور مسلم رہنما فلسطین کو آزاد کرنے، صیہونیوں سے لڑنے، یا مسجد اقصیٰ کو عزت دینے اور اس کے دفاع میں ریلی نکالنے کے پابند نہیں ہیں۔ اس کے بجائے، اس طرح کے اعمال کو اختیاری یا ثانوی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قوم پرستی کی ایک ایسی شکل سے پیدا ہوتا ہے جو اسلام کے خلاف ہے، جہاں حکمرانوں کو صرف اپنے ملکوں کی سرحدوں کی سرحدوں کا ذمہ دار تصور کیا جاتا ہے جو اصل میں استعماری طاقتوں کی طرف سے مسلط کی گئی ہیں۔

نتیجتاً، بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یروشلم اور الاقصیٰ کی حرمت کم ہو گئی ہے، اور وہ اس خیال کو قبول کرنے لگے ہیں کہ شاید عثمانیوں نے سیاسی یا مالی فائدے کے لیے ان زمینوں کو ترک کر دیا تھا۔

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں اورحان محمد علی، سوتن عبدالحمید ثانی، ص215-16؛ نائلہ الواری، ص195 الف۔

ایک غلط فہمی جسے درست کرنا چاہیے۔ سلطنت عثمانیہ نے ان سرزمینوں کو گہری تعظیم کے ساتھ منعقد کیا، جس میں لیونٹ کو "شام شریف" یا نوبل شام کہا جاتا تھا، جس کے دل میں یروشلم تھا۔

صیہونی تحریک کا قیام

عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہودی عیسیٰ مسیح ابن مریم کی موت کے ذمہ دار تھے، یا کم از کم انہیں رومی حکام کے حوالے کر کے اس میں حصہ ڈالتے تھے، جو بالآخر ان کی مصلوبیت کا باعث بنے۔ مسیحی نصوص میں ان مصائب اور اذیتوں کی تفصیل ہے جو اس نے صلیب پر برداشت کی تھی۔ نتیجتاً، عیسائیوں کے ذریعہ یہودیوں پر ظلم و ستم تاریخ میں ایک بار بار چلنے والا نمونہ بن گیا، خاص طور پر رومی شہنشاہوں کے عیسائیت اختیار کرنے کے بعد لیونٹ میں۔ اس نے اکثر یہودیوں کو لیونٹ پر حملوں کے دوران فارسیوں کے ساتھ اتحاد کرنے کی طرف راغب کیا، گرجاگھروں کو تباہ کرنے، عیسائیوں کو قتل کرنے اور خزانے کو لوٹنے میں حملہ آور افواج کی مدد کی۔ ان اقدامات نے یہودیوں کے خلاف دشمنی کو تیز کیا اور جب بھی رومیوں نے لیونٹ پر دوبارہ کنٹرول حاصل کیا تو انتقامی کارروائیوں کو اکسایا۔ رومی شہنشاہوں اور اس خطے کے فوجی کمانڈروں نے یہودیوں کو کچھ سب سے زیادہ کچلنے والے ضربوں سے نمٹا اور انہیں بڑے پیمانے پر اور شدید طور پر منتشر کیا۔

قرون وسطیٰ کے یورپ میں، یہودیوں پر عیسائی ظلم و ستم اس دور کا ایک نمایاں پہلو تھا، تاریخ کے مختلف مقامات پر یہودیوں کو بار بار مختلف ممالک سے بے دخل کیا گیا۔

ان اخراج کے پیچھے مذہبی، سیاسی، معاشی اور سماجی عوامل کا امتزاج تھا۔ مذہبی تناؤ کی جڑیں مسیح کے خلاف سمجھی جانے والی یہودی دشمنی میں تھیں، جب کہ سیاسی اور معاشی محرکات یہودی برادری کے تنہائی کی طرف جھکاؤ سے پیدا ہوئے تھے۔[1] یہودی اکثر مخصوص علاقوں میں مرتکز ہوتے تھے جو یہودی حلقوں یا خصوصی برادریوں (یہودی بستیوں) کے نام سے جانے جاتے تھے، کثرت سے سونے کی تجارت اور خاص طور پر سونے کی تجارت میں اجارہ داری قائم کرتے تھے۔ اس سے دونوں کی وسیع تر معاشرے سے علیحدگی میں اضافہ ہوا اور ان کے خلاف دشمنی میں شدت آگئی۔ مزید بر آں، باہر کے لوگوں سے عام سماجی نفرت، اور حکمرانوں کے اپنے مفادات

[1] شاہین ماکاریوس، تاریخ الاسرائیلیین (اسرائیل کی تاریخ)، صفحہ 18۔

یا اسکیموں کو آگے بڑھانے کے لیے اقلیتوں پر انحصار کرنے کے رجحان کے ساتھ، ایسے حالات پیدا کیے جو عوامی بدامنی یا عوامی احتجاج کے دوران حکمرانوں اور اقلیتوں دونوں کے خلاف ہو سکتے ہیں۔[1]

اگر عیسائی خود پورے قرون وسطی کے دور میں کیتھولک، آرتھوڈوکس اور بعد میں پروٹسٹنٹ کے درمیان فرقہ وارانہ تنازعات میں تباہ کن مذہبی جنگوں میں مصروف رہے تو پھر یہودیوں کو، جو نہ صرف مذہبی اقلیت تھے بلکہ سماجی طور پر بھی الگ تھلگ، ایک غیر معمولی طرز زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے، اور بعض کو معاشی طور پر ایک پراسیٹک گروہ کے طور پر دیکھتے تھے، اس میں تناؤ کتنا زیادہ ہوتا؟

یورپ میں یہودیوں کی صورت حال میں بہتری آنے لگی کیونکہ براعظم نے آہستہ آہستہ عیسائیت اور چرچ کے غلبے سے خود کو دور کیا، جس سے سیکولرازم، قوم پرستی، جدید ریاستی نظام، اور مثبت قوانین اور قانون سازی کو جنم دیا۔ اس تبدیلی نے یہودیوں کے بارے میں سوچنے کا طریقہ تبدیل کر دیا، ان کے بارے میں محض یہودیوں کے بجائے شہری کے طور پر دیکھنے میں اضافہ ہوا۔ نتیجتاً، انہیں سرکاری محکموں میں عہدیداروں کے طور پر خدمات انجام دینے کے مواقع ملے، جن میں کچھ اضافہ ہو کر پارلیمنٹ کے ممبر یا وزیر بن گئے۔ مزید برآں، وہ مالی کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، جس کا تحفظ منتخب پارلیمانوں کے نافذ کردہ سیکولر قوانین کے ذریعے کیا گیا،[2] جو ریاست کے اندر طاقتور نیٹ ورکس اور اثرات کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ پروٹسٹنٹ ازم کے عروج کے ساتھ موافق تھا، جس نے اپنے ساتھ ایک عیسائی صیہونی تحریک کو جنم دیا جس نے جیسا کہ ہم نے پہلے بات کی، یہودیوں کو ہمدردی، دیکھ بھال، اور یہاں تک کہ احترام اور تعظیم کا درجہ دیا۔ نتیجتاً، یہودیوں کی صورت حال میں نمایاں بہتری آئی، ان کے حالات تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

---

[1] المسیری، ج2، ص335

[2] ایک مشہور کہانی جو یہودیوں کی نئی صورتحال سے نمٹنے میں عیسائیوں کی الجھن کی عکاسی کرتی ہے ولیم شیکسپیئر کی دی مرچنٹ آف وینس ہے۔ اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یہودی ساہوکار نے اطالوی شہر وینس میں قانون کا اس حد تک استحصال کیا کہ وہ اس عیسائی کا خون بہانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے اسے رقم ادا کی تھی۔ عدالت نے خود کو اس قانون کے نفاذ کے درمیان ایک مخمصے میں پھنسا ہوا، جو یہودیوں کی حمایت کرتا تھا، اور گہری مذہبی روایات جو ایک عیسائی کے مقدس خون کو بہانے سے منع کرتی ہیں، خاص طور پر ایک "ناپاک" یہودی کے ہاتھوں۔ یہ کہانی کا مرکزی تنازع ہے۔

تاہم، یہ مغربی یورپ کے لیے درست تھا، مشرقی یورپ اور روسی علاقوں کے لیے نہیں۔ ان خطوں میں، یہودی پسماندہ رہے، ظلم و ستم اور خوف کا شکار رہے، اور انہیں تمام برائیوں کے منبع کے طور پر مسلسل سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ روس اور مشرقی یورپ میں یہودیوں کی صورت حال 1881 میں زار الیگزینڈر دوم کے قتل کے بعد پھٹ گئی، جب اس فعل کے لیے یہودیوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ وہ خوف اور دہشت کے ماحول میں رہتے تھے، جس نے روس اور مشرقی یورپ سے مغربی یورپ کی طرف یہودیوں کی ہجرت کی لہروں کو جنم دیا۔

اس ہجرت نے صہیونی منصوبے کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ مغربی یورپ کے یہودی، جن کے حالات بہتر ہو چکے تھے، ہجرت کے خواہشمند نہیں تھے اور صہیونی منصوبوں کو ان کے آبائی وطن واپس لوٹنے کی آڑ میں انہیں یورپ سے بے دخل کرنے کی ایک سازش کے طور پر دیکھتے تھے۔ دوسری طرف روس اور مشرقی یورپ کے یہودیوں نے ناقابل برداشت حالات سے بھاگتے ہوئے کسی بھی پناہ کی تلاش کی جو انہیں مل سکتی تھی۔ انہوں نے انسانی سرمایہ فراہم کیا جس نے مغربی یورپی مفادات کے ساتھ مل کر فلسطین میں یہودی وطن کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔

مشرقی یورپ کے ان پناہ گزینوں نے مغربی سیاست دانوں میں یہودی سوال" کے نظریے کو زندہ کیا۔ یہودی اور غیر یہودی صیہونیوں دونوں کی کوششوں نے یہودیوں کی فلسطین میں منتقلی کو سب سے آسان اور قابل عمل حل بنانے کے لیے کام کیا، چاہے اسے مذہبی عقیدے کے طور پر دیکھا جائے یا استعماری سیاسی مفاد کے طور پر۔[1]

اس طرح فلسطین میں یہودیوں کے وطن کا قیام وہ قیمت تھی جو مسلم دنیا نے اپنے خون اور جانوں کے ذریعے ادا کی تھی، یہ یورپی تاریخ کے بیشتر ادوار میں یہودیوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا یورپی معاوضہ تھا۔ اس نے یورپ کے مسائل اور اس کے توسیع پسند نوآبادیاتی مفادات کے حل کے طور پر بھی کام کیا، جس نے یہودیوں پر سرمایہ کاری کی تاکہ اسلامی مشرق کے جسم میں کانٹے کی طرح پیوست ہو، جو مکمل طور پر اس پر منحصر ہو، اور یورپی

[1] یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ صہیونی تحریک میں نمایاں خدمات انجام دینے والی چند اہم شخصیات یہودیوں کے لیے شدید نفرت کا اظہار کرتی تھیں، جیسے کہ چیمبرلین، لائیڈ جارج، بالفور اور سائیکس۔ ان افراد اور صہیونی تحریک نے مختلف ارادوں اور محرکات کے باوجود یہودیوں کو فلسطین میں منتقل کرنے کا مشترکہ مقصد کیا۔ مثال کے طور پر دیکھیں: جارج انتونیئس، دی عرب بیداری، ص۔ 372؛ رجینہ شریف، ص106، 108، 116، 120، 163، 167؛ راشد خالدی، دی ہنڈریڈ ایئر وار، ص۔ 62

فوجوں کے لیے ایک جدید فوجی اڈے کے طور پر کام کرے۔ اس طرح کمزور طاقتوروں کی جنگوں کی قیمت چکاتے رہتے ہیں۔

ہرزل اور صیہونی تحریک کا قیام

یہ تمام حالات آسٹریا سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان یہودی صحافی تھیوڈور ہرزل کو متاثر کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے، جو ایک ذہین، ذہین اور انتہائی فعال فرد تھا۔ وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے منصوبے کی حمایت کے لیے ارد گرد کے تمام حالات کو مہارت سے استعمال کرنے میں کامیاب رہا۔

ہرزل نے اپنے منصوبے کی بنیاد تین اہم ستونوں پر رکھی:

1. حقیقت پسندانہ امکان محمد علی کی پالیسیوں سے متاثر ہوا، جو ساٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ مضبوط تجارتی سرگرمیوں اور اثر و رسوخ کے ساتھ بعض علاقوں میں یہودی اب بھی اکثریت میں تھے، جبکہ سلطنت عثمانیہ کمزور رہی[1].
2. قوم پرستی کا عروج، جس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ہر قوم کو واضح طور پر متعین سیاسی سرحدوں اور آزاد خود مختاری کے ساتھ اپنی ریاست ہونی چاہیے۔ ہرزل کا عقیدہ یہ تھا کہ یہودی ایک ایسی قوم ہیں جن کی کوئی ریاست نہیں، ایک قوم بغیر زمین کے۔ اس نے یہودیوں کے لیے اپنی ریاست کا ہونا ایک اخلاقی اور فطری ذمہ داری بنا دیا۔ یہ خیال ان کی کتاب The Jewish State کا نچوڑ بنا، جو 1896 میں شائع ہوئی، جس میں اس کے صہیونی منصوبے کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے اپنی پہلی کانفرنس باسل، سوئٹزرلینڈ میں 1897 میں منعقد کی، جس میں یہودی ریاست کے قیام کی کوششوں کا آغاز کیا گیا۔
3. نو آبادیات اور یورپی غلبے کا دور، جہاں یورپ کا دنیا پر کافی کنٹرول تھا، یا تو براہ راست قبضے کے ذریعے یا غیر مقبوضہ علاقوں میں نمایاں اثر و رسوخ کے ذریعے۔ اس لیے یہودیوں کے لیے ایک ریاست کا قیام

---

[1] ہرزل کی ڈائری، صفحہ 74

ممکن تھا اگر وہ مغربی سیاست دانوں کو قائل کر سکے اور یہودی ریاست کے تصور کو مغربی استعماری مفادات سے ہم آہنگ کر سکے، ایک ہی وقت میں متعدد مسائل کو حل کر سکے، خاص طور پر مشرقی یورپ سے یہودیوں کی نقل مکانی، جسے مغربی ممالک ایک مسئلہ کے طور پر دیکھتے تھے۔

جب ہرزل اس کا تعاقب کر رہا تھا، اس نے دریافت کیا کہ یہودی ان کے لیے ریاست کے تصور کو قبول نہیں کریں گے جب تک کہ یہ فلسطین، خاص طور پر یروشلم میں نہ ہو۔ ابتدائی طور پر، ہرزل نے ریاست کے لیے جنوبی امریکہ یا افریقہ جیسے مقامات پر غور کیا تھا، لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار یہودیوں کی روحانی خواہشوں، خوابوں اور زمین سے تاریخی رشتوں سے جڑنے پر ہے۔ چنانچہ اس نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے اپنے منصوبے پر نظر ثانی کی[1]۔

ہرزل نے مغربی سیاست دانوں کو فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے منصوبے پر راضی کرنے کی شدید کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے آسٹریا، جرمنی، اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے متعدد دورے کیے، ہر معاملے میں اپنی تمام تر ذہانت اور قائل کرنے کی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ اس نے اپنے نقطہ نظر کو ہر ملک کے مخصوص مفادات، تنازعات اور ترجیحات کے مطابق بنایا، جس کا مقصد یہودی ریاست کے منصوبے کو ان لوگوں کے قومی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا جن سے اس نے رابطہ کیا تھا۔

جرمنوں کے لیے، فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا قیام انہیں روسی ظلم و ستم سے بھاگنے والے یہودی پناہ گزینوں کی آمد کا انتظام کرنے میں مدد دے گا۔ یہ فاضل یہودی مزدوروں اور کسانوں کو بھی راغب کرے گا، اور ایک مشرق وسطی کی ریاست قائم کرے گا جو سستے یہودی مزدوروں اور وافر مقدار میں خام مال پر انحصار کرے گی۔ یہ یورپی سرمایہ کاروں اور سرمائے کو اپیل کرے گا، خاص طور پر چین کے مقابلے میں۔ مزید برآں، یہ جرمنی کو ان مظلوم یہودی کارکنوں کو جذب کرنے سے بچائے گا جو ممکنہ طور پر انقلابی تحریکوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔

---

[1] Ibid.، p.70 ff

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کی صورت میں یہودی ریاست فرانسیسی اور روسی عزائم (جرمنی کے مخالفین) کے خلاف ایک بفر کے طور پر بھی کام کرے گی، کیونکہ ستائے ہوئے یہودی روسی اثر و رسوخ کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ مزید بر آں، ریاست خطے میں مغربی پالیسیوں کو تقویت دے گی، مشرقی عیسائیوں کی حمایت کرے گی، اور کسی ایک ملک، خاص طور پر برطانیہ (جرمنی کے حریف) کو مشرق اور مغرب کے درمیان اہم تجارتی راستوں پر غلبہ حاصل کرنے سے روکے گی، جس پر برطانیہ نے پہلے ہی ہندوستان، خلیج عرب، مصر (سوئز کینال) اور قبرص میں اپنے قبضے کے ذریعے کنٹرول کر رکھا ہے۔[1]

برطانویوں کے لیے، ہرزل نے تجویز پیش کی کہ یہودی ریاست مشرق اور مغرب کے درمیان ایک متبادل، مختصر زمینی راستہ فراہم کرے گی، جس سے نقل و حمل کے نیٹ ورکس اور نوآبادیاتی مفادات پر برطانیہ کے مکمل کنٹرول کو یقینی بنایا جائے گا۔ یہودی ریاست خلیج کو بحیرہ روم سے ملانے والی ایک ریلوے تعمیر کرے گی، جس کی شاخ افغانستان تک پھیلے گی، جس سے برطانیہ کو کسی بھی قیمت کے بغیر، برطانیہ کو کسی بھی دوسری طاقت سے زیادہ فائدہ پہنچے گا، کیونکہ یہودی اس منصوبے کی مالی اعانت اور انتظام کریں گے۔ مزید بر آں، خطے میں یہودی ریاست کا قیام ترکی کو کمزور کر دے گا اور مشرق میں روس کی توسیع کو روک دے گا۔ اگر یہودی مالی مدد کے ذریعے سلطان کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سلطنت عثمانیہ فرانس اور روس (برطانیہ کے دشمنوں) سے قرض لینے سے بچ سکتی ہے، اس طرح ان کے اثر و رسوخ کو روک سکتی ہے۔ مذہبی رجحان رکھنے والے انگریزوں کے لیے، ایک مذہبی مقصد بھی تھا: یہودیوں کی اپنے وطن واپسی کو مسیح کی دوسری آمد کے لیے ایک ضروری پیش خیمہ کے طور پر دیکھا گیا۔[2]

جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، ہرزل نے یہودی ریاست کے تصور کو یہودیوں کو فلسطین میں منتقل کر کے "یہودی مسئلہ" کو حل کرنے کے لیے ایک بہترین موقع کے طور پر پیش کیا۔ یہ نقل مکانی ہموار اور بغیر کسی

Ibid., pp.23-24, 49, 65.

Ibid., pp.50, 71.[2]

رکاوٹ کے ہو گی کیونکہ یہودی خود اس کا خیر مقدم کریں گے۔ چونکہ بہت سے یہودی روسی تھے اور اپنی ثقافت کا اشتراک کرتے تھے، اس لیے یہودی ریاست روسی اثر و رسوخ میں آجائے گی، جو مشرق میں مغربی اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کو مؤثر طریقے سے روکے گی۔ مزید بر آں، یہودی عثمانی سلطان کو زمین خریدنے کے لیے رقم کی پیشکش کریں گے، اور سلطان ان رقوم کو اصلاحات اور بہتری کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہو گا، خاص طور پر عیسائیوں کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے عیسائی اقوام کی طرف سے دباؤ ڈالنے کے لیے۔ در حقیقت، ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں نے عیسائیوں کی بہتری کی مالی امداد کی تھی، جن میں سے بہت سے روس سے متاثر تھے۔[1] ہرزل نے بھی جروشلم کے بارے میں انہیں یقین دلانے کا خیال رکھا، یہ کہتے ہوئے، "یروشلم تجارتی لین دین سے آزاد رہے گا۔"[2]

یہاں تک کہ ہرزل نے پوپ کے نمائندے کو یہ پروجیکٹ پیش کیا، ان مقدس مقامات کو ترک کرتے ہوئے جو مطلوبہ یہودی ریاست کی حدود میں نہیں آئیں گے، جیسے جروشلم، بیت المقدس اور ناصرت[3]۔ ہرزل کامل کے انگریزوں کو مصر سے نکالنے کے جوش سے بہت متاثر ہوا اور اس نے سوچا کہ یہ صہیونی تحریک کے مفادات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کو نکالنے سے وہ نہر سوئز کا کنٹرول چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے،[4] اس طرح یہودی ریاست کے منصوبے سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہو گا، جو زمین کا متبادل پیش کرے گا[5]۔

یورپ میں، ہرزل کو ایک اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑا: اس منصوبے کی سنجیدگی اور فزیبلٹی کے بارے میں یہودیوں کا شکوک و شبہات۔ تین ہزار سال کی ناکامی اور ظلم و ستم کا بوجھ بھاری تھا۔ بہت سے یہودیوں، خاص طور پر ربیوں اور مذہبی گروہوں نے اس منصوبے کو اپنے خلاف ایک سازش کے طور پر دیکھا، اور یہود مخالف تحریکوں کی

---

1 Ibid., pp.29, 66.[1]

Ibid., p.183.[2]

[3] ہرزل کی ڈائری، صفحہ 27

4 Ibid., pp.62-63.[4]

Ibid., p.71[5]

طرف سے انہیں یورپ سے نکالنے کی دیرینہ کوششوں کا تسلسل ہے۔ ان شکوک و شبہات کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملی کہ صہیونی تحریک سیکولر تھی، مذہبی نہیں، جس کی وجہ سے کچھ لوگ اسے اپنی محفوظ پناہ گاہوں سے بے گھر کرنے کی کوشش کے طور پر سمجھتے ہیں جہاں سلامتی یا کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ان خدشات کے باوجود، ہرزل اور اس کے بعد صہیونی تحریک نے ان کو قائل کرنے اور ترغیب کے تمام دستیاب ذرائع سے حل کیا، اگر وہ جبر یا تشدد کے ذریعے بھی نہیں ہوا۔ ہرزل صرف یہودیوں کے خوابوں کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ اس نے اور صیہونی تحریک نے فعال طور پر یہودیوں کو ایک یہودی ریاست کے مقصد کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے کام کیا، یا تو انتخاب کے ذریعے یا طاقت کے ذریعے۔ ہرزل نے مشہور طور پر کہا، "یہود مخالف ہمارے سب سے قابل اعتماد دوست ہوں گے، اور یہود مخالف ممالک ہمارے اتحادی ہوں گے۔"[1] صہیونی تحریک نے یہاں تک کہ جرمنی سے یہودیوں کو نکالنے کے مقصد کے لیے نازیوں کے ساتھ تعاون کیا۔[2]

یہودی ریاست کے قیام کے لیے ہرزل کے فلسفے کی جڑیں پوری طرح استعمار کی طاقت اور آلات پر تھیں۔ پہلے کی کوششوں سے جو کہ کافی مالی اور لاجسٹک کوششوں کے باوجود یہودیوں کی موجودگی کو قائم کرنے میں ناکام رہی تھی، ہرزل کا نقطہ نظر کامیاب ثابت ہوا۔ فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام نو آبادیاتی طاقتوں کی حمایت کے بغیر ممکن نہیں تھا، ان کے جبر کے طریقوں، فوجوں اور بحری بیڑوں کے ساتھ ہرزل کی مہارت یا یہودی برادری کی صلاحیتوں سے قطع نظر۔ نو آبادیاتی طاقت پر یہ انحصار اس کی کامیابی کی کلید تھی جہاں تین ہزار سالوں میں پیشرو ناکام رہے تھے۔ تاہم، اس فلسفے کا ایک تاریک پہلو تھا: اس نے وحشیانہ قتل عام میں بہت سے یہودیوں کی قبولیت اور قربانی کی وجہ بنی تاکہ دوسروں کو اپنے ملک چھوڑنے اور فلسطین کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

---

[1] رجینہ شریف، صفحہ 164، 166۔

[2] Ibid., p.168.

شروع سے ہی، ہرزل نے فلسطین میں بتدریج یہودیوں کی دراندازی کے ذریعے یا ایک "یہودی مسئلہ" گھڑ کر یہودی ریاست کے منصوبے کو آگے بڑھانے کو سختی سے مسترد کر دیا جس سے بڑی طاقتوں کی مداخلت کا اشارہ ہو گا۔ وہ سلطان کے خلاف بغاوت کرنے والے یہودیوں کے کسی بھی ظہور سے بچنے کے لیے پرعزم تھا، کیونکہ اس سے پورے منصوبے کی ناکامی یا تباہی کا خطرہ ہو گا۔ اس کے بجائے، اس کا مقصد یہودی ریاست کو بڑے دارالحکومتوں کا فیصلہ کرنا تھا، سلطان یا تو ترغیبات کے ذریعے رضامندی سے یا بڑی طاقتوں کے دباؤ کے ذریعے۔ یہ حکمت عملی منصوبے کی تکمیل کو یقینی بنائے گی، یہودیوں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کرے گی، امیر یہودیوں کو اس کی حمایت اور مالی اعانت کے لیے ترغیب دے گی، اور کم سے کم نقصانات کے ساتھ اس کے قیام کو ممکن بنائے گی۔[1]

ہرزل اور سلطان عبدالحمید دوم

ہرزل کی حکمت عملی نے ناگزیر طور پر اسے عثمانی سلطان عبدالحمید دوم کے ساتھ سامعین تلاش کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ یہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے زمین حاصل کرنے کا سب سے سیدھا راستہ تھا، جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ ہرزل نے عبدالحمید کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کرنے اور ایک زبردست تجویز تیار کرنے کے لیے تندہی سے کام کیا جو ایک یہودی ریاست کو سلطنت عثمانیہ کے لیے فائدہ مند قرار دے اور اسے سلطان کے لیے ایک قیمتی موقع کے طور پر پیش کرے۔

ہرزل کی تجویز میں اس بات پر زور دیا گیا کہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست (جان بوجھ کر جروشلم سے دور، کیونکہ اس نے وہاں اسے قائم کرنے کی ہمت نہیں کی)[2] سلطنت عثمانیہ کے لیے مضبوط حمایت اور حفاظتی ڈھال کا کام کرے گی۔ اس نے دلیل دی کہ یہودی اب بھی مسلمانوں، خاص طور پر عثمانیوں کے تئیں گہرا شکر گزار محسوس کرتے ہیں، کیونکہ وہ یورپ میں مسلسل ظلم و ستم کا شکار تھے اور انہیں پناہ اور استحکام صرف مسلمانوں کی

[1] ہرزل کی ڈائری، صفحہ 20-21، 24، 25، 38، 43، 64، 66-67، 81۔

[2] ہرزل کی ڈائری، صفحہ 29، 33۔

حکومت میں ہی ملا تھا۔ تاریخی طور پر، یہودیوں نے اکثر اسلامی سرزمینوں میں انکوزیشن اور مذہبی ظلم و ستم سے بچنے کے لیے پناہ کی تلاش کی تھی۔ ہرزل نے انہیں مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ وفادار اقلیت کے طور پر پیش کیا، جو سلطان عبدالحمید کے دور حکومت میں مثالی طور پر تحفظ کے خواہاں تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ لیونٹ میں ایک یہودی ریاست یورپی استعماری عزائم کے خلاف ایک بفر کے طور پر کام کرے گی، عثمانی اسلامی طاقت کو تقویت دیتے ہوئے ان کے اثر ورسوخ کو روکے گی۔ مزید بر آں، یورپ اور روس کے یہودی سرمایہ اور مہارت دونوں لائیں گے، جو کہ سستی مزدوری کے ساتھ خطے میں ترقی کو تحریک دیں گے – یہ سب بالآخر عثمانی خزانے کو فائدہ پہنچے گا[1]۔

ہرزل نے ایک ایسے وقت میں کافی مالیاتی پیشکش کے ساتھ اپنی تجویز کو تقویت بخشی جب سلطنت عثمانیہ کو شدید مالی بحران کا سامنا تھا، تقریباً اسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بھاری قرضوں کی ادائیگی کے لیے اپنی مالیات یورپی نو آبادیاتی کمیشن کے پاس رہن رکھے۔ ہرزل کی پیشکش معمولی اسّی ہزار لیرا تھی، پھر بھی اس نے زور دیا کہ ایسی مالی تجویز منفرد ہے۔ اس نے دلیل دی کہ صرف یہودی ہی زمین خریدنے میں دلچسپی رکھتے تھے جو دوسری صورت میں بہت کم اپیل کی جاتی تھی، جس سے عثمانیوں کو یورپ کی گرفت سے آزاد ہونے کا موقع ملا۔[2]

اس کے باوجود، عبدالحمید نے ہرزل اور اس کی توانائی اور رابطوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس لیے اس نے اس سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ عزت پاشا (دمشق سے تعلق رکھنے والے ایک عرب عبدالحمید کے قریبی مشیر) کے ذریعے، اس نے ہرزل کو دوسری تجویز کے ساتھ آزمایا: یہودیوں کا قبرص (اس وقت برطانوی قبضے میں تھا) خریدنے اور فلسطین میں زمین کے ایک ٹکڑے کے بدلے اضافی رقم کے ساتھ اسے سلطان کو تحفے میں دینے کا خیال۔ اس تجویز نے ہرزل،[3] کو حیران کر دیا اور اس سے ارمنی رہنماؤں اور یورپی اخبارات کو زمین

---

[1] Ibid., pp.57, 173 ff.

[2] Ibid., pp.25, 35, 55, 174 ff.

[3] Ibid., pp.35, 66.

کے مسئلے کے حوالے سے پر سکون کرنے کو بھی کہا گیا۔ ہرزل نے اس سلسلے میں اہم کوششیں کیں، امید ہے کہ یہ اسے اپنے مقصد کے قریب لے آئے گا۔ اس وقت کے دوران، اس نے سلطنت عثمانیہ اور عبد الحمید کی حمایت کی، اس خوف سے کہ یورپی طاقتیں سلطان کو معزول کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ اس کی برطرفی صہیونی تحریک کے لیے پریشانی کا باعث بنے گی، کیونکہ مغرب کی حمایت یافتہ نئے سلطان کو یہودیوں کے پیسوں کی ضرورت نہیں ہوگی اور ممکنہ طور پر وہ یہودی ریاست کے تصور کو ترک کر دے گا۔ ہرزل نے یونان کے خلاف جنگ میں سلطنت عثمانیہ کا بھی ساتھ دیا، روس کی مدد سے، عثمانیوں کی مدد کے لیے طبی اور مالی مہمات کا آغاز کیا اور یہاں تک کہ ان کی سیاسی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لیے ایک اخبار بھی قائم کیا۔[1] ان کی کوششوں کے اعتراف میں، اور مزید کام کرنے کی حوصلہ افزائی کے لیے، عبد الحمید نے ہرزل کو تمغہ سے نوازا[2]۔ دریں اثنا، ہرزل ایک یہودی ریاست کے نظریے کو فروغ دینے پر قائم رہا، ہر بار اپنے کچھ مطالبات میں نرمی کرتا اور مانتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ ذاتی طور پر صہیونی تحریک کی ذمہ داری سنبھالیں اور اعلان کریں کہ وہ فلسطین کو اپنی مکمل خود مختاری کے تحت ایک صوبے کے طور پر پیش کریں گے، اس کے بدلے میں دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ ادا کریں[3].

ہرزل کی کوشش کو دیکھتے ہوئے، سلطان نے ہرزل اور اس کی کوششوں کا کامیابی سے فائدہ اٹھایا، جبکہ ہرزل کو عبد الحمید سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

عبد الحمید فلسطین میں یہودی آباد کاری کو روکنے کے لیے اپنی کوششوں میں ڈٹے رہے۔ 1897 میں، اس نے ملک میں یہودیوں کے داخلے پر پابندیوں کے نفاذ کی نگرانی کے لیے یروشلم میں ایک خصوصی کمیٹی قائم کی۔ جون 1898 میں، اس نے غیر ملکی یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے سے منع کرنے کی ہدایات جاری کیں جب تک

Ibid., p.53 ff.[1]

2 Ibid., pp.45-46.[2]

Ibid., pp.28, 33, 34, 38, 45, 52, 55, 66, 73.[3]

کہ وہ حفاظتی رقم ادا نہ کریں اور ایک ماہ کے اندر وہاں سے نکلنے کا عہد کریں۔ سلطان نے ہوائی اڈے کے ضوابط کو مزید سخت کر دیا، کوئی چھوٹ نہیں دی گئی، یہاں تک کہ انطاکیہ میں برطانوی نائب قونصل کے لیے بھی نہیں، صرف اس لیے کہ وہ یہودی تھا۔ یہ پابندیاں بعد میں اور بھی زیادہ سختی کے ساتھ نافذ کی گئیں۔ 1901 میں، سلطان نے یہودیوں کے یروشلم کے دوروں کو منظم کرنے کے لیے ایک قانون جاری کیا، جس کے تحت ان کے سفر اور اس کی مدت کے بارے میں ایک سفری پاس لے جانے کی ضرورت تھی۔ اس پاس کو ایک عارضی رہائشی اجازت نامہ کے لیے تبدیل کیا جاتا تھا، جس پر ایک خاص رنگ کا نشان لگا ہوا تھا، جو فلسطین میں تین ماہ سے زیادہ کے لیے درست نہیں۔ اس ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی اور فیصلہ کن کارروائی کی گئی۔ 1904 میں تمام قومیتوں کے یہودیوں کو زمین کی فروخت پر پابندی کا قانون بحال کر دیا گیا۔ 1906 میں سلطان نے عبرانی یونیورسٹی کے لیے ہرزل کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ اسی سال، عبدالحمید نے یروشلم کے گورنر راشد پاشا کو ہٹا دیا، یہودیوں کے بارے میں ان کی نرم پالیسیوں کے بارے میں بار بار شکایات کے بعد، ان کی جگہ علی احمد بے کو مقرر کیا۔ بے نے یہودیوں کی امیگریشن کا مقابلہ کرنے اور یروشلم کی ترقی کے لیے اہم کوششیں کیں، ہجرت سے فائدہ اٹھانے والوں کے دباؤ کے خلاف ثابت قدم رہے، چاہے وہ غیر ملکی ایجنٹ ہوں یا بدعنوان اہلکار۔ ستمبر 1907 میں، سلطان نے ایک حکم جاری کیا جس میں عثمانی یہودیوں کو ریاستی زمین کی ملکیت کی منتقلی پر پابندی لگائی گئی، جس نے غیر ملکی بینکوں کی فلسطینی اراضی خریدنے کی کوششوں کو روک دیا۔ 1908 میں اپنے دور حکومت کے اختتام پر، اس نے اپنے سیکرٹریوں کو یروشلم کے گورنر کے طور پر مقرر کیا تاکہ وہ اپنے اندرونی دائرے کے ذریعے حالات کی براہ راست نگرانی کر سکیں۔[1]

تاہم، عبدالحمید کی کوششوں کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس، ان کے دور حکومت میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی میں کئی عوامل کی وجہ سے اضافہ ہوا،[2] جن میں سے سب سے اہم یہ تھے: سلطنت

[1] عبدالعزیز عواد، جلد 3، صفحہ 164-65؛ اورحان محمد علی، صفحہ 215-16؛ نائلہ الواری، ص 202 ایف۔ ایم شعبان سوان، السلطان والتاریخ (سلطان اور تاریخ)، ص 303 ایف۔

[2] دیکھیں عواد، صفحہ 158-59؛ الواری، صفحہ 206-07۔

عثمانیہ کے بعد کے سالوں میں وسیع پیمانے پر انتظامی بدعنوانی، غیر ملکی دباؤ اور قونصلوں کا اثر ورسوخ، اور ان غیر ملکی طاقتوں اور ان کے قونصلوں کا یہودیوں کو دستاویزات جاری کرنے میں تعاون، یا سابقہ طور پر تحفظ فراہم کرنے کا ذکر۔ عثمانی سلطنت، اپنی کمزور حالت میں، ایک مرتی ہوئی سلطنت کی بیماریوں سے دوچار تھی۔ غیر ملکی دباؤ کے خلاف مزاحمت کرنے کی اس کی صلاحیت کم ہو گئی تھی، جیسا کہ اس کے انتظامی نظام میں اصلاحات کرنے اور قابل اہلکاروں کے ساتھ اس کی تجدید کی صلاحیت تھی۔

مزید برآں، یہودیوں میں قدرتی آبادی میں اضافہ اور عثمانی علاقوں میں ان کی باقاعدہ نقل و حرکت نے مجموعی طور پر اضافے میں اہم کردار ادا کیا۔ عبدالحمید کے دور میں مصر، تیونس، الجزائر اور دیگر سرزمینوں پر قبضے کے باوجود، سلطنت عثمانیہ نے ان قبضوں کو نہ تو تسلیم کیا اور نہ ہی قبول کیا۔ نتیجے کے طور پر، ان علاقوں سے یہودی زائرین اور زائرین کو داخلے سے روکا نہیں گیا تھا، اور سفر کی کچھ مثالیں جو یاترا یا دوروں کے طور پر شروع ہوئی تھیں بالآخر آبادکاری کا باعث بنیں۔

صرف عددی نقطہ نظر سے، کوئی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ عبدالحمید اور عثمانی یہودیوں کی نقل مکانی کو روکنے میں ناکام رہے۔ کچھ یہاں تک کہ تجویز کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اس کی سہولت فراہم کی۔ تاہم، اگر کوئی یہودیوں کی فیصد پر غور کرے جو روس سے یہودی ہجرت کی بڑی لہروں کے مقابلے میں فلسطین میں آباد ہونے میں کامیاب ہوئے، جو اکثر غیر ملکی سازشوں کے ذریعے کارفرما ہوتے ہیں (جس کا تخمینہ زیادہ سے زیادہ 25 فیصد سے زیادہ نہیں ہے)، تو کوئی یہ دلیل دے سکتا ہے کہ عبدالحمید اور عثمانیوں نے یہودیوں کی نقل مکانی کو محدود کرنے اور فلسطین کی حفاظت میں کامیابی حاصل کی۔

مجموعی طور پر، ان تمام جڑے ہوئے عوامل، اعداد و شمار اور تناظر پر غور کرتے ہوئے،[1] یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید دوم نے کسی بھی یہودی ریاست کے قیام میں ایک اہم رکاوٹ کا کام کیا۔ ہرزل نے اکثر اپنی

[1] ان عوامل اور نقطہ نظر کے بارے میں دیکھیں ایم شعبان صوان، السلطان والتاریخ، ص320 الف۔

ڈائریوں میں اپنی مایوسی کا اظہار کیا، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ عبد الحمید نے اسے دھوکہ دیا اور بدلے میں اسے کچھ دیے بغیر استعمال کیا[1]۔ ایک موقع پر، ہرزل نے اپنی اور سلطنت عثمانیہ کی طرف صیہونی تحریک دونوں کی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے غیر مشروط طور پر تین ملین فرانک کی پیشکش بھی کی۔ اس پیشکش نے سلطان کو ناراض کر دیا، جس نے فنڈز کو مسترد کر دیا اور مزید رابطہ منقطع کر دیا۔[2] اس کے بعد ہرزل نے یروشلم میں مفت میں ایک یہودی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی، اسے عثمانی کنٹرول کے تحت ایک جدید ادارے کے طور پر وضع کیا جو اشرافیہ مغربی یونیورسٹیوں سے بہترین یہودی پروفیسروں کو لے کر آئے گا۔ اس نے دلیل دی کہ یہ عثمانی نوجوانوں کو مغرب کا سفر کرنے سے روک دے گا، جہاں وہ غیر ملکی اثرات کا شکار ہو سکتے ہیں یا سلطان کی مخالفت کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ تاہم سلطان نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔

آخر میں، اپنی زندگی کے اختتام پر، ہرزل نے سلطان کو قتل کرنے یا حراست میں لینے کے لیے یلدز محل پر بمباری کرنے کے منصوبے پر غور کیا، اس امید پر کہ ترکی کی حکومت کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا جو یہودیوں کو فلسطین دینے پر راضی ہو سکتی ہے۔ تاہم، منصوبہ کی ممکنہ ناکامی کے خوف نے اسے روک دیا۔[3] بالآخر 1909 میں عبد الحمید کا تختہ الٹ دیا گیا، ایک بغاوت جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی بڑی وجہ فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی کی مخالفت تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر وہ تخت کھو بیٹھا تو صیہونی مقاصد آگے بڑھیں گے اور در حقیقت ایسا ہی ہوا۔

عبد الحمید کے زوال کے ساتھ، یہودیوں کی نقل مکانی کے دروازے وسیع تر ہو گئے۔ علماء نے عبد الحمید کے موقف اور ان کے جانشینوں کے موقف میں فرق کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگرچہ عبد الحمید کے عہدے اصولی اور تزویراتی تھے،[4] کبھی کبھار دباؤ کے تحت حکمت عملی پر مبنی رعایتیں دیتے تھے، لیکن ان کے جانشین

---

[1] دیکھئے ہرزل کی ڈائری، صفحہ 211۔

[2] Ibid, p.211 ff.

[3] Ibid., p.356 ff.

[4] دیکھیں عونی فرسخ، التھادی والاستجابۃ فی السیرۃ العربی السحیونی: جُدّور السیرۃ قوانیۃ الدبیتہ (1949-1799)، ص 223۔

اصول سے زیادہ موقع پرستی کے زیر اثر تھے۔ انہوں نے صہیونی نقل مکانی کے حوالے سے نرمی کا مظاہرہ کیا لیکن جب بھی انہیں فوری خطرہ محسوس ہوا تو وہ عارضی اور حکمت عملی سے پابندیاں عائد کر دیں گے[1]۔

ہرزل کی موت کے بعد صیہونی تحریک

ہرزل 1904 میں چوالیس سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اپنی مختصر زندگی کے باوجود، اس نے صدیوں تک تاریخ میں اپنا مقام محفوظ کر لیا، اس نے ایک طویل عرصے سے رکھے ہوئے خواب کے بیج بوئے جو تین ہزار سال سے ناقابلِ حقیقت تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پہلی صیہونی کانگریس مستقبل کی ریاست کا نقطہ آغاز ہو گی، جو پانچ سال کے اندر وجود میں آئے گی، یا زیادہ سے زیادہ پچاس۔ اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی، کیونکہ ریاست پچاس سال بعد وجود میں آئی۔ اپنی ڈائریوں میں، اس نے لکھا ہے کہ ایک ریاست کی بنیاد "عوام کی مرضی پر ہے کہ وہ ایک تخلیق کرے، لیکن یکساں طور پر ایک فرد کی مرضی پر ہے جو اسے حقیقت میں لانے کے لیے کافی طاقت رکھتا ہے۔"[2]

ہرزل کی موت کے بعد، صہیونی تحریک کو الجھن اور عدم استحکام کے دور کا سامنا کرنا پڑا، ایسے رہنماؤں کے تحت جن میں اس کی ذہانت اور حرکیات کی سطح کی کمی تھی، بشمول ڈیوڈ وولفسون (1905-1911) اور اوٹو واربرگ (1911-1920)۔ تاہم، تحریک نے اپنی رفتار اور طاقت دوبارہ حاصل کی جب چیم ویزمین، ایک طاقتور شخصیت نے 1920 میں قیادت سنبھالی۔ ویزمین ہرزل کی طرح قابل اور لچکدار ثابت ہوا، اپنی زندگی میں صہیونی وژن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آگے بڑھا اور بالآخر ریاست اسرائیل کے قیام کے بعد اس کا پہلا صدر بن گیا۔

یہ افراتفری اور الجھن جس نے صہیونی تحریک کو دوچار کیا وہ اس بات کے مضبوط ترین ثبوتوں میں سے ایک ہے کہ تحریک خود فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام جیسے عظیم الشان منصوبے کو کامیاب کرنے کی طاقت نہیں

[1] اس کے علاوہ، جارج انتونیئس، یقاضات العرب، ص 365؛ دیکھیں۔ المسیری، جلد 6، صفحہ 43-44

[2] ہرزل کی ڈائری، صفحہ 89۔

رکھتی تھی۔ اس کی کامیابی بنیادی طور پر یورپی سامراجی طاقتوں کی حمایت کا نتیجہ تھی۔ ایک تحریک، جس کی ترقی اپنے بانی کی موت کے بعد سولہ سال تک مؤثر طریقے سے رک گئی تھی، وطن کے قیام جیسے پرجوش منصوبے کو دوبارہ کیسے شروع کر سکتی ہے؟

تاہم، اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے چیم ویزمین کی بے پناہ کوششوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ جس طرح صیہونیت اپنی طاقت سے خالصتاً ایک وطن قائم نہیں کر سکی، اسی طرح مغربی استعمار خود ایک بے جان جسم میں زندگی کا سانس نہیں لے سکتا اور نہ ہی ایک بے کار، سست ہستی کو زندہ کر سکتا ہے! اگرچہ یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ ویزمین ہرزل کی طرح ہی پرعزم اور پرعزم تھا، لیکن وہ بہت زیادہ خوش قسمت تھا، کیونکہ حالات اور ہوائیں اس کے حق میں تھیں۔ ان حالات میں سب سے اہم سلطنت عثمانیہ کا کمزور ہونا تھا- جس کا آغاز 1909 میں سلطان عبدالحمید کے خلاف بغاوت اور اس کی معزولی سے ہوا، جس کے بعد پہلی جنگ عظیم (1914-1918) میں سلطنت عثمانیہ کی شکست ہوئی۔ اس کے بعد برطانوی افواج نے فلسطین اور عراق پر قبضہ کر لیا، ٹرانس جارڈن پر کنٹرول حاصل کر لیا، جس نے اسرائیل کے قیام کی راہ میں بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا اور اس مقصد کے لیے ایک مضبوط حامی متعارف کرایا۔

اس وجہ سے صیہونی تحریک کی حکمت عملی بدل گئی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے ذہین سلطان کے دور میں، ہرزل نے یہودیوں کو دراندازی کرنے اور غیر قانونی تارکین وطن کے طور پر ظاہر کرنے کی اجازت دینے کے خیال کو واضح طور پر مسترد کر دیا، کیونکہ اس سے انہیں نکالنا آسان ہو جائے گا اور مزید مہاجرین کو راغب کرنے کی کوششیں پیچیدہ ہو جائیں گی۔

تاہم، سلطان کی معزولی کے بعد، 1907 میں دی ہیگ میں آٹھویں صہیونی کانگریس نے یہودیوں کی سست، مسلسل دراندازی، اسے منظم اور منظم کرنے کے منصوبے کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ صیہونیت اپنی

موجودگی قائم کر سکے جو سلطنت عثمانیہ پر دباؤ ڈالے اور بین الاقوامی تحفظ حاصل کرے۔ اس نقطہ نظر کی 1909 میں ہیمبرگ میں نویں صہیونی کانگریس اور 1911.1 میں باسل میں دسویں کانگریس نے تصدیق کی تھی۔

عثمانی دور کے اواخر میں فلسطین کے حالات

ہرزل کے دعوے اور صہیونی پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کے لیے مورخین عثمانی دور کے اواخر میں فلسطین کے حالات کو کثرت سے اجاگر کرتے ہیں جو فلسطین کو "لوگوں کے بغیر سرزمین" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تاہم، یہاں ہمارا مقصد ان دعووں کی تردید کرنا نہیں ہے بلکہ ان عوامل کا کھوج لگانا ہے جنہوں نے اس خطے کو قبضے کے لیے خطرہ بنایا۔ لہٰذا، اس وقت فلسطین میں موجود تہذیب، ترقی اور ثقافت کی نشانیوں پر توجہ دینے کے بجائے، ہم سرزمین اور اس کے لوگوں کے اندر ان کمزوریوں کا جائزہ لیں گے جنہوں نے اس نتیجے میں حصہ لیا۔

سلطنت عثمانیہ کی ریاست: "مزاحمت کی عدم موجودگی"

مؤرخ ابن اثیر نے اسلامی سرزمینوں میں منگولوں کے تیزی سے پھیلنے اور ان کے سامنے ان علاقوں کے ٹوٹنے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "ان کی کامیابی مزاحمت کی عدم موجودگی کی وجہ سے تھی، یہ عدم موجودگی اس لیے پیدا ہوئی کہ خوارزم شاہ محمد نے زمینوں پر قبضہ کر لیا، ان کے بادشاہوں کو قتل کر دیا، اور جب اس نے خود ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا، جب اس نے خود کو ختم کر دیا، تو اس نے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ شکست ہوئی، ان سرزمینوں میں مزاحمت کرنے یا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں بچا تھا۔"[1]

سیاسی اور تاریخی مطالعات میں اس ذہین مشاہدے کو ایک کلیدی نظریہ کے طور پر شمار کیا جانا چاہیے۔ جب کوئی ریاست، حکمران، یا سلطان طاقت کو مرکزیت دے کر اپنے ہاتھ میں اختیار مرکوز کر لیتا ہے اور ارد گرد کی قوتوں کی طاقت کو کم کرتا ہے تو پورا نظام ان کی قیادت پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، اگر وہ شکست کھا جاتے ہیں، مر جاتے ہیں، یا بدقسمتی کا سامنا کرتے ہیں، تو پورا ڈھانچہ منہدم ہو جاتا ہے۔ یہ منظر نامہ عثمانی سلطنت کے آخری سالوں میں ہونے والی حالت کی ایک واضح ترین وضاحت پیش کرتا ہے۔

[1] ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج10، ص335۔

اپنے زوال کے دوران، سلطنت عثمانیہ نے "جدیدیت" کے عمل کا آغاز کیا، ایک مغربی، سیکولر طرز حکمرانی اور انتظامیہ جس نے اقتدار کو حکمران اتھارٹی کے ہاتھوں میں مرکوز کر کے اسے معاشرے سے دور کر دیا۔ رفتہ رفتہ، اور اکثر انجانے میں، عثمانی ریاست اسلامی نظام سے دور ہوتی چلی گئی جس کی بنیاد "طاقتوں کے توازن" پر تھی۔ اس تبدیلی نے ابن خلدون کے نظریہ کی عکاسی کی جس میں فتح پانے والے لوگ اپنے فاتحین کی تقلید کرتے ہیں۔ تاہم، اس جدیدیت کا وہ مضبوط اثر نہیں ہوا جس کی عثمانیوں کو امید تھی۔ یورپی ماڈل کو اپنانے کے باوجود، عثمانیوں کو 19ویں صدی میں مسلسل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کا عروج صرف جدیدیت کا نتیجہ نہیں تھا، اور عثمانیوں کے زوال کو صرف ان کی جدیدیت میں ناکامی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں جو چیز ہمیں پریشان کرتی ہے وہ عثمانی ریاست کے اندر طاقت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت اور اجارہ داری ہے، کیونکہ اس نے اپنے بیوروکریٹک اپریٹس کو وسعت دی ہے تاکہ اس کی حکمرانی کے تحت باقی تمام علاقوں بشمول فلسطین کو گھیر لیا جائے۔ یہ وسیع اور دخل اندازی کرنے والی بیوروکریسی، جو معاشرے کے تانے بانے میں گہرائی سے بُنی ہوئی ہے، رفتہ رفتہ سماجی ہم آہنگی کو ختم کر رہی ہے، طاقت کے مقامی ذرائع کو کمزور کر رہی ہے، اور خود انحصاری کی صلاحیت کو کم کر رہی ہے۔ نتیجے کے طور پر، عثمانی انتظامیہ کے اندر افراتفری یا بدعنوانی کی وجہ سے معاشرے کی اپنے معاملات کو آزادانہ طور پر سنبھالنے اور نظم و نسق بحال کرنے کی صلاحیت کو نمایاں طور پر نقصان پہنچا۔

مزید برآں، سلطنت عثمانیہ کے زوال نے مغربی طاقتوں اور روس کی طرف سے خاص طور پر عیسائی اور یہودی اقلیتوں کی حمایت کے ذریعے نمایاں بیرونی اثر و رسوخ کے دروازے کھول دیے، جس سے ان کے اثر و رسوخ اور مراعات کو تقویت ملی۔ اس متحرک نے عرب قوم پرستی کے عروج میں کلیدی کردار ادا کیا، جس کی قیادت لیونٹ میں عرب عیسائیوں نے کی، ساتھ ہی ترک قوم پرستی کے ابھرنے میں بھی۔ ان اسلامی خطوں نے، جو

مغرب میں پھیلے ہوئے قوم پرست نظریات سے متاثر ہوئے، نے عرب علاقوں میں عربوں کی آزادی اور عثمانی حکومت کے اندر عربوں کے ترک کرنے کے لیے پر جوش تحریکوں کا عروج دیکھا۔

لہٰذا صورت حال پہلے سے بدل گئی تھی۔ عثمانی دور کے اواخر میں، فلسطین میں پیدا ہونے والا کوئی بھی شخص، جیسا کہ اس وقت کے بیشتر عربوں کو، عثمانی کے طور پر شناخت کرنے میں کوئی شک یا ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ یہ ان کی شناخت، ان کا رشتہ اور ان کا تعلق تھا۔ یہاں تک کہ اگر ان کی جڑیں عرب ہوتیں تو گلیوں، محلوں اور اسکولوں میں ان کا سامنا ایک اور ترک نژاد لڑکے سے ہوتا، جس کا اکثر عربی نام ہوتا تھا۔ یہ ترک لڑکا اپنے آپ کو محض ترک ہی نہیں بلکہ عثمانی بھی سمجھتا تھا۔ دونوں طالب علم جغرافیہ یا تاریخ کے اپنے مطالعہ میں، یا سلطنت عثمانیہ اور اس کی فتوحات کی تعریف کرنے والے ترانے گاتے وقت متحد ہو جاتے۔ [1]

یہ دراڑ اب ابھری تھی، اور اس کا بحران اس ہنگامے سے گہرا ہو گیا تھا جو عبد الحمید کی معزولی اور پہلی جنگ عظیم میں عثمانی داخلے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جس میں شدید شکوک و شبہات کا نشان لگایا گیا تھا، جس کے دوران ترک قوم پرستی ایک غالب قوت کے طور پر مضبوط ہوئی، خاص طور پر کمیٹی آف یونین اور پیشرفت کے دور میں واضح ہوا۔ اس دور میں ایک سیکولر ترک فوجی حکومت کا عروج دیکھا گیا جس نے لیونٹ میں ترک کرنے کی پالیسیوں پر عمل کیا، عرب صوبوں پر سخت کنٹرول نافذ کیا، اور فوری طور پر تعزیری اقدامات کو نافذ کیا۔ یہ ایک تلخ دور تھا، جس کی مثال لیونٹ میں جمال پاشا کی سخت حکمرانی تھی۔

دوسری طرف عرب قوم پرستی کا نظریہ نمایاں طور پر تیار ہوا تھا۔ اب یہ محض لیونٹ کے چند عیسائیوں کی طرف سے کی گئی کال نہیں رہی تھی۔ انگریز اب اس میں شامل ہو چکے تھے، شریف حسین کو مکہ کے شریف اور حجاز کے حکمران کو عرب خلافت کے وعدے پر آمادہ کر رہے تھے، جس کی حکومت تھی[2]۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس

---

[1] احمد الشقیری، العمال الکاملہ، ج3، ص719 ایف۔

[2] شریف حسین اور مصر میں برطانوی ہائی کمشنر میک موہن کے درمیان تبادلے کے خطوط دیکھیں: فائل آف فلسطین ڈاکومنٹس، جلد 1، صفحہ 169 اور اس سے آگے

خلافت کا مقصد عثمانیوں کے زیر تسلط عرب علاقوں تک محدود ہونا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کا نعرہ "رفح سے ثور تک"[1] نہیں "بحر اوقیانوس سے خلیج تک" تھا۔ یہ ایک "خلافت" تھی جسے "مغربی قبضے" کے خطوط پر ڈیزائن کیا گیا تھا۔ محض ایک خیال سے بڑھ کر، اب یہ ایک خطرناک حقیقت بن چکی تھی، کیونکہ شریف حسین اور اس کی عرب افواج نے بغاوت کی، ایک نازک لمحے میں عثمانیوں کے خلاف ایک نیا محاذ کھول دیا جب وہ پہلی جنگ عظیم میں پہلے ہی کمزور ہو چکے تھے۔

یہاں سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مسائل کا ایک چکر شروع ہوا، ہر ایک دوسرے کو بڑھاتا ہے اور تناؤ کو بڑھاتا ہے: غلطیاں، غلطیاں، اور یہاں تک کہ عام پالیسیوں اور اقدامات کو بھی عرب یا ترک قوم پرستی کے اظہار کے طور پر تیزی سے تیار کیا گیا، جس کے نتیجے میں قوم پرست جذبات کو ہوا دینے والے جوابی رد عمل کا باعث بنے۔

جب پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کو شکست ہوئی تو معاشرہ ایک ایسی حالت میں رہ گیا جو ابن الثیر کے تصور "مزاحمت کی عدم موجودگی" کا مظہر تھا۔ اس وقت تک، معاشرہ اپنی خود انحصاری کا کافی حصہ کھو چکا تھا۔ اس کے بہت سے ارکان جنگ میں مارے گئے تھے - یا تو شکست خوردہ عثمانی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے، یا شریف حسین کی افواج میں شامل ہو گئے تھے، جن کے عوامی نعروں نے کمیٹی آف یونین اینڈ پروگریس کے خلاف بغاوت اور مظلوم عثمانی مسلم خلیفہ کی بحالی کا مطالبہ کیا تھا۔ دوسرے بکھر گئے، جنگ کی ہولناکیوں، قحط، اور نقل مکانی کے سانحات سے بھاگے۔

اس طرح، فلسطین میں، سماجی ہم آہنگی کی صرف سب سے بنیادی شکلیں رہ گئی ہیں: خاندان، قبیلے اور قبیلے کے بندھن۔ ان گروہوں کے اندر، یہ بنیادی طور پر امیر لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں خود کو قائم کیا تھا اور عثمانی انتظامی آلات کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے ہوئے تھے۔ یہ افراد اکثر ایسے ہوتے تھے جو اپنے بچوں کو بڑے

[1] شقیری، ج3، ص727۔

دارالحکومتوں جیسے استنبول، قاہرہ، لندن اور پیرس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنے کو ترجیح دیتے تھے، یا اس کے بجائے اپنی سماجی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔[1]

اس طرح جب انگریز فلسطین میں داخل ہوئے تو انہیں اس بکھری ہوئی ریاست میں ایک معاشرہ ملا۔ بقیہ اشرافیہ اور ممتاز شخصیات مختلف طریقوں سے مشغولیت کے لیے کھلے تھے: یا تو انہیں اپنے سماجی عہدوں، مراعات اور اثر ورسوخ کی حفاظت کے وعدوں کے ذریعے لالچ دے کر؛ عرب قوم پرستی کے جذبات کو جنم دے کر برطانوی اس وقت سرگرم حمایت کر رہے تھے۔ یا ترقی کی اپیل اور جدیدیت کے مغربی ماڈل کے ذریعے، جس نے ان اشرافیہ میں سے کچھ اور ان کے بیٹوں کو جو بیرون ملک تعلیم حاصل کر چکے تھے، اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یہ ترغیبات برطانوی موجودگی کی مخالفت کرنے کے ذرائع کی کمی کی واضح حقیقت سے متوازن تھیں۔ ایک چھوٹی، وسائل سے محروم آبادی ایک طاقتور سلطنت کے خلاف کیا کر سکتی ہے جو ابھی دنیا کی بڑی طاقتوں پر فتح یاب ہوئی ہے؟

ایکر سے تعلق رکھنے والے ایک قوم پرست عرب رہنما نے سننے والے بزرگوں کو یاد کیا کہ عثمانی دور کو "خوشحالی اور وقار کے دن" کہا جاتا ہے[2]۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو برطانوی دور حکومت میں، عثمانی دور کو ایک قبضے کے طور پر دیکھتے تھے، اب بھی عرب سرزمین کے کھوئے ہوئے اتحاد پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ عرب اتحاد عثمانی حکومت کے تحت ایک حقیقت تھی چاہے "قبضے کے تحت" ہو۔ لیکن انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ اتحاد تحلیل ہو گیا جس کی جگہ قبضے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور عرب اتحاد کا جھنڈا باقی نہ رہا[3]۔

اسلامی تہذیب نے اقلیتوں کے ساتھ اپنے منصفانہ اور ہمدردانہ سلوک، ان کو یکجا کرنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کی ایسی بے مثال مثال قائم کی جس کی مثال تاریخ میں کسی دوسری تہذیب میں نہیں ملتی[4]۔ کچھ لوگ جو

[1] راشد خالدی، صفحہ 35۔

[2] شقیری، ج3، ص722۔

[3] Ibid.، vol.3، p.739. نیز دیکھیں بہجت ابو غربیہ، فی خدام الندال العربی الفلسطینی، ص19۔

[4] یہودی مورخ شاہین ماکاریوس نے جب یہودیوں کی تاریخ کا جائزہ لیا تو اس نے تسلیم کیا کہ یہودیوں کو مسلم دنیا میں قبولیت کا وہ درجہ ملا جس کا تجربہ انہیں کسی دوسری قوم میں نہیں ہوا۔ انہوں نے پورے اسلامی دور میں ظلم وستم کے صرف دو واقعات کو نوٹ کیا اور یہاں تک کہ یہ دو واقعات بحث و مباحثہ کا موضوع ہیں۔ دیکھیں شاہین ماکاریوس، صفحہ 65-66، 70، 72۔

تاریخ کو مادیت پسندی یا غیر اسلامی عینک سے دیکھتے ہیں وہ یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے غیر مسلم اقلیتوں کے تئیں اپنی فراخدلی اور رواداری کی وجہ سے نادانستہ طور پر اپنے زوال کی بنیاد رکھ دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، یہ اقلیتیں ان کے خلاف ہو گئیں، جس سے قوم کے اتحاد اور طاقت اور اس کی تہذیب کو گہرا دھچکا لگا۔

اس کے باوجود ہم اس نظریے کو نہیں مانتے۔ بلکہ ہمارا ماننا ہے کہ اگر ہم وقت کو پیچھے کر سکتے ہیں تو ہم ایک بار پھر اقلیتوں کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ قبول کریں گے جیسا کہ ہمارا مذہب حکم دیتا ہے۔ مسائل کی جڑ اقلیتوں کو حساس عہدوں پر تفویض کرنے اور ان پر مکمل بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے اصولوں سے بھٹکنے میں ہے، جیسا کہ خدا نے سورہ آل عمران میں متنبہ کیا ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمۡ لَا يَأۡلُونَكُمۡ خَبَالًا وَدُّواْ مَا عَنِتُّمۡ قَدۡ بَدَتِ ٱلۡبَغۡضَآءُ مِنۡ أَفۡوَٰهِهِمۡ وَمَا تُخۡفِي صُدُورُهُمۡ أَكۡبَرُۚ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے علاوہ کسی اور کو مباشرت نہ کرو، کیونکہ وہ تمہاری بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کو تکلیف ہو۔ ان کے منہ سے نفرت پہلے ہی ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ زیادہ ہے۔ [3:118]۔ مزید بر آں، یہ فوجی اور سیاسی کمزوری تھی جس نے ہماری قوم کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار کر دیا۔ ایک شریف قوم بھی جب کمزور ہوتی ہے تو آسان ہدف بن جاتی ہے۔ طاقت اخلاق کی بہترین حفاظت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، مضبوطی انصاف کے گرد باڑ ہے، اور غلط جگہ پر رحم محض کمزوری کی ایک شکل ہے۔

صیہونیت کی دردناک کہانی، خلاصہ یہ ہے کہ کس طرح یہودیت اور پروٹسٹنٹ صلیبی ذہنیت اسلامی دنیا کے خلاف ہو گئی جس نے صدیوں سے ان گروہوں کو پناہ اور تحفظ فراہم کیا تھا، خاص طور پر اس وقت جب انہیں فنا کے خطرے کا سامنا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی سرزمین میں ان لمحات میں حفاظت اور پناہ حاصل کی جب مسلمان، اگر وہ چاہتے تو ان کو ختم کر سکتے تھے، ان کی مداخلت یا دفاع کرنے کی کوئی بیرونی طاقت نہیں تھی۔

متعدد یہودی اور پروٹسٹنٹ مورخین نے اس کی تصدیق کی ہے، جو کہ یہاں مکمل احاطہ کرنے کے لیے بہت وسیع ہے۔ تاہم، چند اہم مثالیں، خاص طور پر یہودیوں، پروٹسٹنٹوں، اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان تعلقات سے متعلق، قابل توجہ ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال اسرائیلی یہودی مورخ مائیکل ونٹر سے ملتی ہے، جس نے کہا، "اگرچہ سلطنت عثمانیہ ایک قدامت پسند سنی اسلامی ریاست تھی، لیکن یہ ایک روشن خیال بھی تھی۔ محکمہ خزانہ میں، وہ ایسی بلندیوں پر پہنچ گئے جن کے بارے میں وہ پہلے کبھی نہیں جانتے تھے، یا کم از کم قرون وسطیٰ میں فاطمی دور کے بعد سے نہیں۔[1] نتیجتاً، سلطنت عثمانیہ 15 ویں اور 16 ویں صدی میں کیتھولک اسپین اور پرتگال سے نکالے گئے[2]، یہودیوں کے ساتھ ساتھ 18 ویں اور 19 ویں صدی میں روسی سلطنت اور مشرقی یورپ سے ستائے گئے اور بے دخل کیے جانے والے یہودیوں کے لیے "مذہبی آزادی کی پناہ گاہ" بن گئی۔ مزید برآں، امریکی یہودی مورخ سالو ڈبلیو بیرن، جسے "20 ویں صدی کا سب سے بڑا یہودی مورخ" سمجھا جاتا ہے، نے گواہی دی کہ "یہودی برادریوں کے سب سے زیادہ خوشحال مراکز، خلافت کے عروج سے لے کر یورپ میں یہودی یہودی بستیوں کے خاتمے تک، اسلامی سرزمینوں میں، عباسی حکومت کے دوران، عراق میں، بعد میں عراق میں سپاہ میں تھے۔ "سلطنت عثمانیہ"[3]

پروٹسٹنٹ، اصل میں مغربی کیتھولک چرچ سے الگ ہونے والا ایک دھڑا تھا، نے قتل عام، ظلم و ستم اور وحشیانہ جنگوں سے بھری تاریخ کا تجربہ کیا۔ اپنی ضرورت کے وقت انہیں صرف سلطنت عثمانیہ میں پناہ گاہیں ملتی تھیں۔ برطانوی پروٹسٹنٹ مورخ تھامس آرنلڈ کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ عثمانی سلوک، "ایک ایسی رواداری کا مظاہرہ کرتا ہے جو اس وقت یورپ کے باقی حصوں میں بالکل نامعلوم تھا۔ ہنگری اور ٹرانسلوانیا کے کیلونسٹ اور بعد کے ملک کے یونیٹیریز، طویل عرصے سے ترکوں کے تابع ہونے کو ترجیح دیتے تھے بجائے اس کے کہ وہ

---

[1] مائیکل ونٹر، سلطان اور غیر یہودی معاشرے کے ساتھ یہودی تعلقات، عثمانی دور کے دوران مصر میں یہودیوں کی تاریخ میں، یعقوب لینڈرا کی طرف سے، جمال احمد الرفاعی اور احمد عبد اللطیف حماد نے ترجمہ کیا۔ قاہرہ: سپریم کونسل آف کلچر، 2000، صفحہ۔ 472

[2] کارل بروکلمین، اسلامی لوگوں کی تاریخ۔ 5 ویں عربی ایڈیشن، صفحہ 489-90

[3] ہیملٹن گِب اور ہیرالڈ بووِن، اسلامی معاشرہ اور مغرب۔ st1 عربی ایڈ.، جلد 2، صفحہ 310

پروٹیسٹنٹ ہاؤس اور سلفان ہاپس کے ہاتھوں میں چلے جائیں۔ ترکئی کی طرف تڑپتی نظروں سے دیکھتا اور خوشی سے مذہبی آزادی خرید لیتا جس کی قیمت مسلمانوں کی حکمرانی کے سامنے آتی تھی، یہ ترکی کے لیے تھا کہ پندرھویں صدی کے آخر میں ستائے ہوئے ہسپانوی یہودی بڑی تعداد میں پناہ لینے کے لیے بھاگے تھے، اور Cossacks جو کہ پرانے مومنوں کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے، روسی ریاست میں موجود تھے۔ سلطان جس برداشت کو ان کے عیسائی بھائیوں نے انکار کیا۔[1]

فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلامی دنیا کے دیگر حصوں کی طرح زندگی گزاری، خاص طور پر مصر اور لیونٹ میں، کیونکہ ان خطوں پر اسلامی تاریخ میں اکثر ایک ہی اتھارٹی کی حکومت رہی ہے۔ نتیجتاً فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کو اس دوران کسی منفرد یا مخصوص چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

یہ صورت حال تب بدلنا شروع ہوئی جب سلطنت عثمانیہ کمزور پڑی اور یورپی طاقتوں نے اقلیتوں کے تحفظ کی آڑ میں مداخلت شروع کر دی۔ مقابلہ بنیادی طور پر عیسائی اقلیتوں پر مرکوز تھا، جس میں روس آرتھوڈوکس پر اور فرانس کیتھولک اور مارونائٹس پر مرکوز تھا۔ یہودی، تاہم، برطانیہ میں صیہونیت کے عروج تک، وہاں پروٹسٹنٹ ازم کے غلبے کے بعد، بڑے پیمانے پر نظر انداز کیے گئے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ برطانویوں نے یہودیوں کو ایک اقلیت کے طور پر دیکھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جیسا کہ دیگر مسابقتی طاقتوں نے اپنی اقلیتوں پر انحصار کیا تھا۔ عثمانی مزاحمت اور مغربی اقدامات کی ناکامی کے درمیان، وسیع تر سامراجی تناظر میں یہودی اقلیت کی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ 19 ویں صدی کے آخر تک، سلطنت عثمانیہ میں یہودیوں کا کوئی الگ مسئلہ یا بحران نہیں تھا۔ درحقیقت، انہیں "بغاوت نہ کرنے، بدامنی پھیلانے، شکایت یا تکلیف نہ کرنے، بلکہ اچھے اور برے دونوں وقتوں میں (عثمانی) ریاست کی دن رات تعریف کرتے ہوئے، اس

[1] تھامس واکر آرنلڈ، تبلیغ اسلام، صفحہ 134۔

کے تحفظ اور دیکھ بھال کے لیے مسلسل اظہار تشکر کرنے کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ کسی یورپی ریاست نے ان کے دفاع کا دعویٰ نہیں کیا۔[1]

یہاں تک کہ یہودیوں کی نقل مکانی کی لہروں نے جو 1881 میں یہودیوں پر روسی ظلم و ستم کے بعد شدت اختیار کر لی، جس کے نتیجے میں فلسطین میں یہودیوں کی موجودگی میں اضافہ ہوا، اس کا بھی محدود اثر ہوا۔ ان مہاجرین میں سے زیادہ تر غریب پناہ گزین تھے، ان کی زندگیاں مشکلات اور مشکل حالات سے عبارت تھیں۔ وہ دولت مند یہودیوں کے عطیات اور مالی امداد پر بہت زیادہ انحصار کرتے تھے[2]، اپنے طور پر کوئی اہم تبدیلی لانے کے لیے وسائل کی کمی تھی۔ مزید بر آں، ان کے حالات اس بات کی نشاندہی نہیں کرتے تھے کہ وہ آزادانہ طور پر کوئی خاطر خواہ خطرہ لاحق ہو سکتے ہیں۔

ایک عام واقعہ یہ تھا کہ ہجرت کی پے در پے لہروں کے دوران فلسطین پہنچنے والے بہت سے یہودی بالآخر یورپ، امریکہ یا دیگر مقامات پر بہتر مواقع کی تلاش میں چلے گئے[3]۔ بہت سے لوگوں کے لیے، "موعود شدہ سرزمین" پر ایمان یا تو غائب تھا یا انہیں باقی رہنے کی ترغیب دینے کے لیے ناکافی تھا۔ تاہم، کچھ لوگ یا تو اپنے عقائد سے محرک رہے یا اس لیے کہ انہوں نے اس عرصے کے دوران صہیونی تحریک اور دولت مند یہودیوں کے معاونین کے مالی تعاون سے چلنے والے منصوبوں میں حصہ لے کر اپنے حالات زندگی کو بہتر بنانے کے طریقے ڈھونڈ لیے۔

ہجرت کی اس لہر نے صہیونی تحریک کے مقاصد کے بارے میں عربوں کی بیداری میں اضافہ کیا۔ عرب اور اسلامی اخبارات نے عوامی بیداری بڑھانے میں فعال کردار ادا کیا، جس میں نمایاں اشاعتیں جیسے فلاستن، الکرمل، اور المنار میگزین نے اس مسئلے کو اجاگر کیا۔ ہجرت نے تنازعات کی مثالیں بھی جنم لیں، جن میں 1886 میں فلسطینی کسانوں اور یہودی آبادکاروں کے درمیان تصادم بھی شامل ہے۔

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، المسعلہ الشرقیہ (مشرقی سوال)، صفحہ 8۔

[2] مائیکل اورین، صفحہ 306۔

[3] المسیری، جلد 7، صفحہ 99-91۔

ودیوں کی حیثیت میں پہلی قابل ذکر تبدیلی 1909 میں سلطان عبد الحمید ثانی کی معزولی اور برطرفی کے بعد ہوئی۔ اس واقعہ نے سلطنت عثمانیہ کو ہلچل، بار بار حکومتی تبدیلیوں اور بغاوتوں کے چکر میں ڈال دیا، جس سے متعدد محاذوں پر خطرات کے دروازے کھل گئے، بشمول:

1. اس عرصے میں کئی یہودیوں کو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات کیا گیا۔
2. فنڈز کی شدید ضرورت، صیہونی تحریک کے ساتھ لین دین کا اشارہ، جس نے یہودیوں کی نقل مکانی پر سے پابندیاں ہٹانے کے بدلے مالی مدد کی پیشکش کی۔ اس کے نتیجے میں فلسطین میں کچھ سرکاری زمینیں فروخت ہوئیں.
3. دارالحکومت میں مسلسل حکومتی تبدیلیوں کی وجہ سے وسیع پیمانے پر عدم استحکام، جس نے زمین کے حصول میں اضافہ کیا اور قانونی خامیوں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے کی اجازت دی۔
4. جاپان کے ہاتھوں اس کی شکست اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی بدامنی کے بعد روس سے یہودیوں کی ہجرت کی ایک مسلسل لہر[1]

ہنگامہ آرائی کے درمیان، فلسطین میں یہودیوں نے 1909 میں اپنی بستیوں کے لیے ایک مسلح یہودی گارڈ قائم کر کے ایک اور فیصلہ کن اقدام کیا، جس کی بنیاد یہ تھی کہ صہیونی فوج کیا بنے گی۔ دو سال بعد، 1911 میں، انہوں نے رسمی طور پر درخواست کی کہ عبرانی کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

تاہم، سلطنت عثمانیہ کے خلاف پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کے لیے یہودیوں کی حمایت نے، اس وقت یونینسٹ حکومت کے تحت، عثمانیوں کو ان کے خلاف ہونے پر اکسایا۔ شام میں عثمانی کمانڈر جمال پاشا تک فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی صہیونی سازش کے بارے میں معلومات پہنچی تھیں۔ اس کے جواب میں، اس نے

[1] عبدالعزیز عواد، ج3، 169ف۔ المسیری، جلد7، صفحہ 90۔

یہودی اداروں کے خلاف وسیع پیمانے پر مہم شروع کی، ان کے اثاثے ضبط کیے، سیٹلمنٹ گارڈز کو غیر مسلح کیا، اور یہودی پرچم یا کسی بھی عبرانی نشان کی نمائش پر پابندی لگادی[1]۔

اس کے بعد سلطنت عثمانیہ کی شکست ہوئی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد شام پر اس کی حکمرانی کا خاتمہ ہوا۔[2]

مسلمانوں کی سرزمین پر رہنے والے یہودیوں نے ایسی خوشحالی حاصل کی جو انہیں کہیں اور نہیں ملی۔ پھر بھی، جب انہوں نے ان لوگوں کو آن کرنے کا موقع محسوس کیا جنہوں نے انہیں عزت دی اور پناہ دی، تو وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ تاہم یہ کہانی ہماری قوم کی عظمت اور اس کے کردار کی شرافت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اپنے کمزور ترین لمحات میں بھی، سلطنت عثمانیہ نے یہودیوں کو ظلم وستم اور تشدد سے بچانے کے لیے ایک حل تلاش کیا، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ وہ خطرہ نہ بنیں۔ تاہم، انہوں نے اس کے بجائے ایک خطرہ بننے کا انتخاب کیا اور سلطنت کے ٹوٹنے میں مغربی طاقتوں کے اتحادی کے طور پر کام کیا۔

صیہونی آبادکاروں کو مستقل طور پر عثمانی شہریت حاصل کرنے اور فلسطین میں غیر ملکی طاقتوں کی حمایت یافتہ نوآبادیاتی موجودگی کے بجائے عثمانیوں کے طور پر آباد ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ مسئلہ محض ہزاروں بے وطن یہودیوں یا ظلم سے پناہ مانگنے والوں کا نہیں تھا۔ یہ ایک غیر ملکی آبادی کے قیام کے بارے میں تھا جو مغرب پر مبنی، نوآبادیاتی آبادکار ریاست میں تبدیل ہو جائے گا جس نے بالآخر پیش کردہ حل کو مسترد کر دیا۔[3]

تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت، سلطنت عثمانیہ کے تحت رہنے والے مقامی یہودیوں اور بیرون ملک سے آنے والوں کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ پہلے سے بہت کم نقصان اور خطرہ لاحق تھا۔ درحقیقت، ان میں سے بہت سے لوگ صیہونیت اور اسرائیل کے قیام سے خوفزدہ تھے[4]۔ تاہم، وقت کے ساتھ، وہ غالب تحریک میں شامل ہو

---

[1] عارف المعارف، المفصل فی تاریخ القدس، ج1، ص547

[2] ڈاکٹر عبدالعزیز عواد نے مصر کے تاریخی جریدے میں شائع ہونے والی ایک تحقیق میں محمد علی کے شام میں داخل ہونے سے لے کر عثمانی دور کے اختتام تک فلسطین میں یہودی آبادکاری کے مراحل کا مختصر جائزہ لیا، شمارہ 21، صفحہ۔ 253 اور آگے

[3] المسیری، ج6، ص43؛ راجر گاراڈی، اسرائیلی پالیسی کی افسانوی بنیادیں، صفحہ 29-30

[4] دیکھیں بہجت ابو غربیۃ، ص16، 28؛ راشد خالدی، صفحہ 48

گئیے، اس کے اغراض و مقاصد کو اپناتے ہوئے، اور اس طرح اس کا حصہ بن گئے۔ ایسا کرتے ہوئے، وہ اپنی اسلامی تہذیب کے خلاف ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ غداری کی جنہوں نے طویل عرصے سے ان کی عزت کی تھی۔ اگرچہ اس عظیم جرم میں ان کا ملوث ہونا ناقابل تردید ہے، لیکن یہ غیر ملکی آباد کاروں کے مقابلے میں کم اہم ہے۔

یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ صہیونی تارکین وطن میں یہودی بھی تھے، جنھیں بعد کے تنازعات کے عروج کے وقت بھی عربوں سے تحفظ اور احترام حاصل تھا۔ اس کی سادہ وجہ ان کی قابلیت تھی کہ وہ اپنے عرب ماحول کے ساتھ احترام اور اچھے کردار کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں[1].

[1] ایریل شیرون کی خود نوشت، عربی ایڈیشن، صفحہ 20؛ راجر گاراڈی، پی پی 29-30

برطانوی قبضے کا دور

برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان بین الاقوامی دشمنیوں اور مسابقتی مفادات نے سلطنت عثمانیہ کے وجود کو طول دینے میں مدد کی۔ جب کہ سلطنت عثمانیہ کمزور ہوتی چلی گئی، یہ طاقتیں اکثر متضاد تھیں اور اپنی وراثت کو تقسیم کرنے کے لیے ایک مہنگی جنگ میں حصہ لینے سے ہچکچاتی تھیں، جس کی وجہ سے سلطنت کچھ زیادہ دیر تک قائم رہی۔ سلطان عبدالحمید دوم نے اپنی کمزور پوزیشن سے ان دشمنیوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، اس امید پر کہ ان کے درمیان کوئی بڑا تنازعہ سلطنت عثمانیہ کے احیاء کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔ تاہم، ان طاقتوں نے اپنے تنازعات کو ملتوی کر دیا اور اس کے بجائے ان کو اپنے خرچ پر طے کیا، جس کے نتیجے میں اس کے دور حکومت میں سلطنت کا بتدریج خاتمہ ہوا۔ اس کے معزول ہونے کے پانچ سال بعد ہی متوقع جنگ شروع ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم اور اس کے نتائج

اگرچہ پہلی جنگ عظیم بنیادی طور پر ایک یورپی تنازعہ تھا جس میں عثمانیوں کی ابتدائی شمولیت بہت کم تھی، لیکن اس کا اثر لامحالہ عثمانیوں کے زیر قبضہ علاقوں، جیسے مصر اور شمالی افریقہ تک پھیلے گا، اور اس کے نتائج غیر مقبوضہ علاقوں کو متاثر کریں گے: لیونٹ، عراق، جزیرہ نما عرب، قفقاز، اور اناطولیہ۔ نتیجے کے طور پر، عثمانیوں کے لیے بڑی طاقتوں کے عہدوں کا اندازہ لگانا بہت ضروری ہو گیا۔ ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اتحادی افواج جنگ کے بعد سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں اور عثمانی سرزمین کی حفاظت کرنے والی کوئی ضمانت یا معاہدہ فراہم کرنے سے انکاری تھیں۔ اس غیر یقینی صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے، عثمانیوں کو جرمنی اور محوری طاقتوں کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور کیا گیا۔[1]

[1] شکیب ارسلان، ایک خود نوشت، صفحہ 99 ایف ایف، صفحہ 187۔

جنگ کا اختتام بہت سے طویل ابواب کے بعد، محوری طاقتوں کی شکست کے ساتھ ہوا، بشمول سلطنت عثمانیہ، جس نے عراق اور جزیرہ نما عرب کو کھو دیا تھا۔ تاہم، یہاں ہمارے لیے جو چیز خاص اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ لیونٹ میں، خاص طور پر فلسطین میں کیا ہوا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران، انگریزوں نے تین اہم وعدے کیے: ایک عربوں سے، دوسرا یہودیوں سے، اور فرانس کے ساتھ ایک معاہدہ، مندرجہ ذیل ہے۔

1. برطانیہ نے حجاز کے حکمران شریف حسین بن علی سے وعدہ کیا کہ وہ ایک وسیع ریاست کا عرب خلیفہ بنے گا جس میں لیونٹ، عراق اور جزیرہ نما عرب شامل ہوں گے۔ شریف حسین اور ان کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کے ساتھ دونوں جماعتوں کے درمیان ایک مضبوط اتحاد قائم ہوا، جو برطانوی سلطنت کے سب سے وفادار حامیوں میں سے کچھ بن گئے۔ بدلے میں وہ حجاز اور لیونٹ میں عثمانی افواج سے لڑیں گے۔ شریف حسین نے اس غداری کو مکمل طور پر قبول کیا، اور عثمانیوں کو ان کے انتہائی کمزور دور میں ایک اہم دھچکا پہنچایا۔[1] مزید برآں، انگریزوں نے فیصل وائزمن معاہدے کے ذریعے فیصل کی بالفور ڈیکلریشن کی منظوری اور یہودیوں کی نقل مکانی کی سہولت حاصل کی (3 جنوری 1919 میں ہم صیہونی رہنما کے ساتھ دستخط کیے گئے)۔ معاہدے کے تحت فیصل نے اپنے والد اور بھائیوں کے زیر اقتدار عرب ریاست کے بدلے فلسطین کو چھوڑنے پر اتفاق کیا.
2. جب خاک چھٹ گئی تو برطانوی غداری واضح ہو گئی: حسین نے حجاز کو عبدالعزیز آل سعود سے کھو دیا اور قبرص جلاوطن کر دیا گیا، اس کے بدلے میں کچھ نہیں ملا۔ تاہم، انگریزوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ایک صحرائی علاقے کا حکمران مقرر کیا جو بعد میں "اردن" کے نام سے جانا جائے گا، جب کہ فیصل کو شام کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ جب فرانس اور برطانیہ کے درمیان شام اور عراق کی تقسیم پر تنازعہ کھڑا ہوا تو دونوں

[1] شریف حسین کی افواج نے انگریزوں کی حمایت اور عثمانیوں کو شکست دینے میں جو اہم کردار ادا کیا اس کی مختصر وضاحت کے لیے دیکھیں: لڈل ہارٹ، حکمت عملی اور دنیا میں اس کی تاریخ، ترجمہ حیثم العیوبی، چوتھا ایڈیشن، بیروت: دار الطلائع، 2000، صفحہ۔ 179 اور اس کے بعد

طاقتوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ فرانس شام کو کنٹرول کرے گا جبکہ برطانیہ فلسطین کو لے گا۔ فرانس کے شام پر قبضے کے بعد برطانیہ نے فیصل کو عراق منتقل کر دیا اور اسے اپنا بادشاہ بنا دیا۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ سلطنت اردن بنیادی طور پر ایک حکومت تھی جسے انگریزوں نے اپنے ایک انتہائی وفادار ایجنٹ عبد اللہ بن حسین کے لیے بنایا تھا۔ یہ حکومت اس وقت سے مسئلہ فلسطین میں اہم کردار ادا کرے گی اور آج تک کرتی آ رہی ہے۔

at the disposal of the Arab State for the purpose of a survey of the economic possibilities of the Arab State and to report upon the best means for its development. The Zionist Organisation will use its best efforts to assist the Arab State in providing the means for developing the natural resources and economic possibilities thereof.

ARTICLE VIII.

The parties hereto agree to act in complete accord and harmony on all matters embraced herein before the Peace Congress.

ARTICLE IX.

Any matters of dispute which may arise between the contracting parties shall be referred to the British Government for arbitration.

[illegible]

Given under our hand at LONDON, ENGLAND, the THIRD day of JANUARY, ONE THOUSAND NINE HUNDRED AND NINETEEN.

Chaim Weizmann

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ان تلخ نتائج کے سامنے آنے سے پہلے فلسطین میں مروجہ رائے یہ تھی کہ خلافت عثمانیہ ہی ایک جائز اختیار ہے اور شریف حسین کو ایک ایسے شخص کے طور پر دیکھا جاتا تھا جس نے اسلام سے علیحدگی اختیار کی تھی اور عثمانی خلیفہ سلطان مہمت وی رشاد کی توہین کی تھی۔[1]

2. برطانوی سیکرٹری خارجہ بالفور نے اپنا مشہور اعلامیہ جاری کیا جس میں فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ اعلامیے کے متن میں کہا گیا ہے کہ ”حکمران کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر کے قیام کے حق میں ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری کوششیں بروئے کار لائے گی، یہ واضح طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جائے گا جس سے موجودہ غیر یہودی برادریوں کے شہری اور مذہبی حقوق کو مجروح کیا جائے یا فلسطین میں کسی دوسرے ملک میں یہودیوں اور سیاسی حقوق حاصل کیے ہوئے ہیں۔

اعلامیے میں فلسطین کو ایک ایسی سرزمین کے طور پر پیش کیا گیا جس کا کوئی مالک یا مالک نہیں تھا، جہاں کے باشندوں کو محض "غیر یہودی کمیونٹیز" سمجھا جاتا تھا۔ اس وعدے کی مزید توثیق امریکی صدر ولسن نے (31 اگست 1918 کو) امریکی صہیونی رہنما ربی اسٹیفن وائز کو لکھے گئے اسی طرح کے خط میں کی۔[2] ولسن نے پیرس امن کانفرنس میں اپنے پیغام میں بھی اس بات کی تصدیق کی، جہاں اس نے یہودیوں کو فلسطین واپس آنے کی ترغیب دی اور وعدہ کیا کہ لیگ آف نیشنز یہودی ریاست کے قیام کے بعد اسے تسلیم کرے گی۔[3]

اعلان بالفور کی عملی اہمیت صہیونی کوششوں کی سب سے اہم کامیابی ہونے میں مضمر ہے۔ ایک بڑی عالمی طاقت نے نہ صرف ان کے مطالبات کو اپنایا بلکہ ان کے مقصد کی حمایت بھی کی، صہیونی منصوبے کو محض یہودی تنظیم

---

[1] احمد الشقیری، ج3، ص722۔

[2] رجانہ شریف، ص127۔

[3] Ibid., p.129

کی بجائے ایک عظیم طاقت کی پشت پناہی سے موثر طریقے سے فراہم کیا۔ مزید برآں، اس اعلان نے صہیونی تحریک کو اندرونی یہودی ناقدین کے خلاف تقویت بخشی جنہوں نے اس کے مقاصد یا اس کے وعدے کے خواب کو پورا کرنے کی صلاحیت پر شک کیا تھا۔ یہ اس مقصد کے لیے یہودیوں کی اضافی حمایت اور فنڈز حاصل کرے گا، اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ بہت سے یہودیوں کو فلسطین میں ہجرت کرنے کی ترغیب دے گا، جو اب عالمی طاقت کے تحفظ میں ہے۔

دفتر خارجہ،

2 نومبر 1917۔

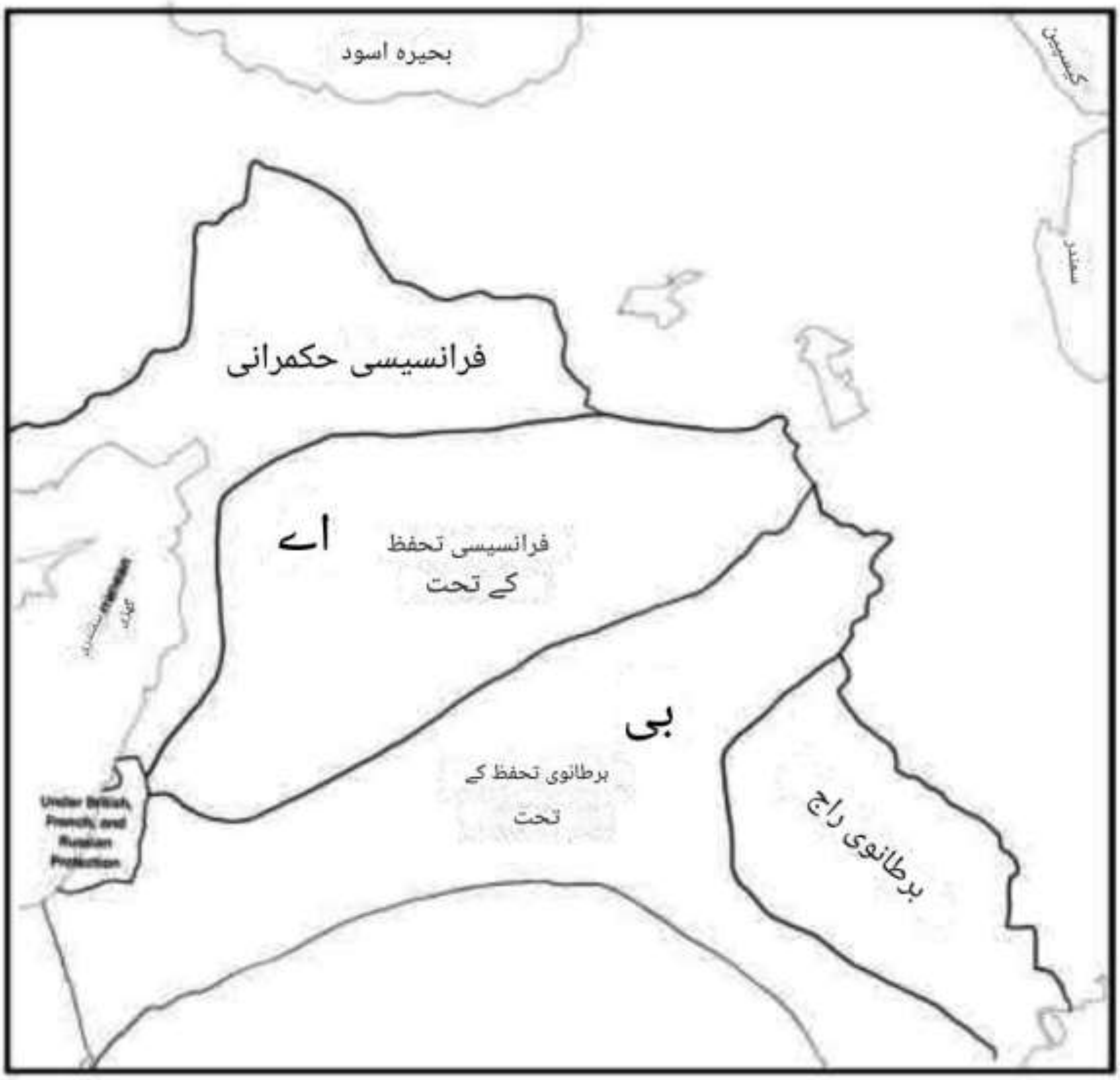
پیارے لارڈ روتھ چائلڈ،

مجھے عزت مآب کی حکومت کی جانب سے، یہودی صہیونی امنگوں کے ساتھ ہمدردی کا درج ذیل اعلان آپ تک پہنچاتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے، جسے کابینہ نے پیش کیا اور اس کی منظوری دے دی ہے۔

عالیہ کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر کے قیام کے حق میں نظریہ رکھتی ہے، اور اس مقصد کے حصول کو آسان بنانے کے لیے اپنی پوری کوششیں بروئے کار لائے گی، یہ واضح طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایسا کچھ نہیں کیا جائے گا جس سے فلسطین میں موجودہ غیر یہودی کمیونٹیز کے شہری اور مذہبی حقوق، یا کسی دوسرے ملک میں یہودیوں کو حاصل حقوق اور سیاسی حیثیت کو نقصان پہنچے"۔

اگر آپ اس اعلان کو صہیونی فیڈریشن کے علم میں لائیں گے تو مجھے شکر گزار ہونا چاہیے۔

3. برطانیہ اور فرانس نے Sykes-Picot معاہدے میں لیونٹ، عراق، مشرقی عرب، اور مشرقی اناطولیہ کے علاقوں کو تقسیم کرنے کا معاہدہ کیا، جو انہیں عثمانیوں سے وراثت میں ملے تھے۔ اس کے دستخط کنندگان، برطانوی سفارت کار مارک سائکس اور فرانسیسی سفارت کار François Georges-Picot کے نام سے منسوب، معاہدے میں لیونٹ اور عراق کی تقسیم کا خاکہ پیش کیا گیا، جس میں موجودہ فلسطین کے شمالی حصے بشمول یروشلم کو بین الاقوامی مینڈیٹ کے تحت رکھا گیا۔ تاہم، برطانیہ نے بالآخر معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فلسطین پر براہ راست کنٹرول حاصل کر لیا۔ اسی دوران فرانس نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور شام کو اپنے براہ راست کنٹرول میں کر دیا۔ نتیجے کے طور پر، برطانیہ نے شاہ فیصل بن حسین کو عراق منتقل کر دیا، اور خطے کی جدید سرحدیں بڑی حد تک قائم ہو گئیں، لیونٹ کو چار ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا: اردن، شام، لبنان اور فلسطین۔



سائکس-پکوٹ معاہدہ

مئی 1916

یہ واضح ہے کہ، کیے گئے تین وعدوں میں سے، صرف ایک ہی پورا ہوا: اعلان بالفور، جب کہ برطانوی سیاسی چالبازیوں نے باقی دو کو کالعدم کر دیا۔ اس غداری کا سب سے بڑا شکار شریف حسین تھا، جس نے جلد ہی اپنی غداری کی قیمت چکائی، قبرص میں جلاوطنی اختیار کی۔ یہاں تک کہ اس نے اعتراف کیا کہ وہ اس گھر کا کرایہ نہیں دے سکتا جو اسے تفویض کیا گیا تھا۔ اس کی کہانی دھوکہ دہی کی ایک شاندار مثال کے طور پر کام کرتی ہے۔ تخت کے لیے اپنی شدید خواہش کے باوجود، حسین نے بار بار تسلیم کیا کہ انگریز اسے دھوکہ دے رہے تھے۔ پھر بھی، اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو سوچنے یا بچانے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں لیا۔ اس کے بجائے،

اس نے اپنا پورا مستقبل برطانوی ہاتھوں میں دے دیا، ان پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے ایک غیر سوالیہ ایمان جو بالآخر اس کے زوال کا باعث بنا۔

تاہم، جنگ میں برطانیہ کی فتح اور اس کے بعد اس کی فوجوں کے جروشلم میں داخلے کے بغیر، اس میں سے کچھ بھی ممکن نہ تھا۔

فلسطین اور جروشلم پر قبضہ

جروشلم کی فتح کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن 1882 سے مصر پر قابض ہو کر برطانیہ کو واضح فوجی فائدہ اور تزویراتی طور پر ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان دہائیوں کے دوران، برطانیہ نے مصر کے وسائل پر کنٹرول حاصل کر لیا، جس کی وجہ سے وہ اپنی فوجی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے انسانی اور مالی وسائل دونوں کو اکٹھا کر سکا۔ نصف ملین سے زیادہ مصریوں کو برطانوی افواج میں بھرتی کیا گیا،[1] اور انہوں نے برطانیہ کی فوجوں کے ساتھ مل کر عثمانی فوج اور دار فر، لیبیا اور اس سے آگے کے علاقوں میں مختلف اسلامی بغاوتوں کے خلاف جنگ کی۔ تاہم اب ہمیں جس چیز پر تشویش ہے وہ فلسطینی محاذ کی صورت حال تھی۔

سوئز کینال برطانوی نوآبادیاتی نیٹ ورک کی ایک اہم آبی گزر گاہ تھی جسے ابتدائی طور پر محمد علی خاندان کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس نہر نے عرب اور اسلامی سلامتی میں ایک سنگین خلاف ورزی کا نشان لگایا، جس سے برطانیہ کو مشرق میں ہندوستان سے فوجوں اور وسائل کو مغرب میں بحر اوقیانوس تک پہنچانے کے لیے ایک اہم، براہ راست راستہ فراہم کیا گیا۔ اس کی تزویراتی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، عثمانیوں کا مقصد نہر پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنا تھا، جبکہ انگریز اس کا دفاع کرنے اور عثمانیوں کو ایک فاصلے پر رکھنے کے لیے پر عزم تھے۔ اس کے نتیجے میں غزہ کے قریب شدید جھڑپیں ہوئیں، جس کا اختتام "غزہ کی تین

[1] برطانوی فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور مصری کسانوں اور ان کے المناک حالات کے بارے میں مزید جاننے کے لیے، دیکھیں: محمد ابو الغار، مصری لشکر: نصف ملین مصریوں کو اغوا کرنے کا جرم، پہلا عربی ایڈیشن، قاہرہ: دار الشروق، 2022۔ اس موضوع پر تحقیق بنیادی طور پر مصری اور امریکی لاوارث کی تحقیق پر انحصار کرتی ہے۔ کور اس کا عربی ترجمہ حال ہی میں قاہرہ میں نیشنل سینٹر فار ٹرانسلیشن، 2023 کے ذریعے شائع کیا گیا تھا۔

لڑائیوں" میں ہوا۔ پہلی دو لڑائیوں میں عثمانیوں نے فتح حاصل کی، انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے کمانڈر مرے کی جگہ ان کے ایک انتہائی ہنر مند جرنیل ایڈمنڈ ایلنبی کو لے، جس نے بالآخر غزہ کی تیسری جنگ میں برطانوی فتح حاصل کی، اس طرح فلسطینی محاذ کھول دیا۔

برطانوی فوج میں ضم ہونے والی مصری افواج نے اس مہم میں اہم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے فلسطین کو نقصان پہنچا۔ مصری انجینئروں اور مزدوروں نے برطانوی فوجیوں کی مدد کے لیے صحرائے سینا میں تازہ پانی اور رسد پہنچانے کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے ساتھ ان کے تعاون کو جنگ سے آگے بڑھایا۔ اس اہم لاجسٹک سپورٹ نے انگریزوں کو اپنی مہم کو برقرار رکھنے اور غزہ کی تیسری جنگ میں کامیابی کے قابل بنایا۔

17 دسمبر 1917 کو، برطانوی جنرل ایلنبی جروشلم میں داخل ہوئے، جس سے ایک برطانوی اخبار نے یہ اعلان کیا کہ "صلیبی جنگیں اب ختم ہو چکی ہیں۔" برطانوی افواج نے اپنی شمال کی طرف پیش قدمی جاری رکھی، بقیہ فلسطین پر قبضہ کیا اور فرانس کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے، 1918 تک قبضہ مکمل کیا۔

بہت سے تجزیوں نے صہیونی منصوبے کے لیے برطانیہ کی بھرپور حمایت کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سوال کا اکثر مورخین اس خطے سے برطانیہ کے جبری انخلاء کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ تاہم اس وقت یہ حمایت حیران کن نہیں تھی۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے پاس کنٹرول، توسیع اور تسلط کے لیے ایک مضبوط تحریک تھی۔ برطانیہ نے ایک انوکھا موقع دیکھا: سلطنت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی اور زوال کے قریب تھی، دوسری طاقتوں (خاص طور پر روس، جرمنی اور فرانس) سے سخت مقابلہ تھا، خطے کا سٹریٹجک مقام بہت زیادہ اہمیت اور مذہبی اہمیت کا حامل تھا، اور پروٹسٹنٹ ازم اور یہودیت کے درمیان نظریاتی وابستگی تھی۔ ان عوامل نے مل کر فلسطین میں اثر و رسوخ اور کنٹرول کے حصول کو برطانیہ کے نوآبادیاتی عزائم کا ایک لازمی

حصہ بنا دیا۔ جب برطانیہ نے ایک یہودی ریاست کے قیام کا آغاز کیا تو اس نے یقینی طور پر اس سرزمین سے دستبرداری کی پیش گوئی نہیں کی تھی، جیسا کہ بالآخر تیس سال بعد ہو گا۔ بلکہ، برطانیہ نے یہودی ریاست کا تصور کیا جو برطانوی خود مختاری کے تحت باقی رہے، مصر، عراق اور اردن کے انتظامات کے مترادف، جہاں برطانوی افواج نے فوجی موجودگی کو برقرار رکھا اور حتمی اختیار حاصل کیا، جب کہ مقامی حکومتیں روزمرہ کے نظم و نسق کا انتظام کرتی تھیں اور عوام کے لیے قومی خود مختاری کا سراغ لگاتی تھیں۔

اسرائیل کے لیے برطانوی تیاری

پہلا یہودی فوجی یونٹ برطانوی فوج کے شانہ بشانہ فلسطین میں داخل ہوا، برطانوی حمایت سے راستہ ہموار ہوا۔ چیم ویزمین نے یروشلم کا دورہ کیا، ماضی کی طرح ایک سرمایہ کار کے طور پر نہیں، بلکہ اب صہیونی منصوبے کے رہنما کے طور پر، اپنے اہداف کو آگے بڑھانے کے لیے تیزی سے کوششیں شروع کر رہے ہیں۔ 1919 تک، اس نے صہیونی انٹیلی جنس نیٹ ورک کی بنیاد رکھی تھی، جس کا مقصد زمین، اس کے باشندوں، زمین کے حصول کے امکانات، مزاحمت کے ممکنہ ذرائع، اور بہت کچھ کے بارے میں تفصیلی معلومات اکٹھا کرنا تھا۔ اس طرح مستقبل کی صہیونی ریاست کا سیکورٹی اور فوجی ڈھانچہ ریاست کے سرکاری اعلان سے تقریباً تیس سال پہلے کی شکل اختیار کرنے لگا۔

برطانوی افواج کے جروشلم میں داخل ہونے سے دو سال قبل، برطانوی حکومت کے ایک صہیونی وزیر نے 1915 کی ایک رپورٹ تصنیف کی، جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کے وطن کے قیام کے لیے حالات ابھی موزوں نہیں تھے۔ اس نے راستہ تیار کرنے کے لیے برطانوی قبضے کے ابتدائی دور کے بجائے دلیل دی، لکھا: "اس تجویز (یہودی ریاست کے قیام) کی خواہ کچھ بھی خوبیاں یا خامیاں ہوں، یہ یقینی ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ یہودی ریاست کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوئی بھی قبل از

وقت کوشش کئی صدیوں تک اس کے حقیقی قیام کو روک سکتی ہے۔ ان صہیونی تحریک کے قائدین پوری طرح سمجھتے ہیں[1]۔

1920 میں برطانیہ کی طرف سے فلسطین کے ہائی کمشنر کے طور پر مقرر ہربرٹ سیموئیل نے منظم طریقے سے یہودی ریاست کی بنیاد رکھی، جو مؤثر طریقے سے مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعے اسرائیل کا معمار بن گیا۔

1. عثمانی پابندیوں کو ختم کر کے فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کرنا جو پہلے اس پر پابندیاں عائد کر چکی تھیں۔
2. عثمانی زرعی بینک کو تحلیل کرنا، جس نے عرب کسانوں کو قابل رسائی قرضے فراہم کیے تھے، اور یہودی قرضوں اور رہن کے بینک کا قیام۔ اس تبدیلی نے یہودی بینک کو زرعی سرمائے پر غلبہ حاصل کرنے کا موقع دیا، جس کی وجہ سے عرب کسانوں کو مرکب قرض کی وجہ سے بتدریج زمین سے محروم ہونا پڑا۔[2]
3. یہودیوں کو خود کو مسلح کرنے اور ایک علیحدہ فوجی فورس بنانے کی اجازت دینا۔
4. ایک آزاد یہودی تعلیمی نظام کے قیام کی اجازت دینا
5. عبرانی کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرنا
6. ریاستی اور فرقہ وارانہ زمینوں کے ساتھ ساتھ حکومت کے زیر کنٹرول دیگر املاک پر قبضہ کرنا اور انہیں یہودیوں کی ملکیت میں منتقل کرنا۔
7. فرقہ وارانہ زمینوں، سرکاری زمینوں، اور جائیدادوں کو دستاویزی ملکیت کے بغیر دعوی کرنے کے لیے قوانین کا نفاذ، جبکہ یہودیوں کے لیے زمین حاصل کرنے کے عمل کو آسان بنانا۔ ان قوانین نے بالآخر یہودیوں کی ملکیت میں وسیع زمین کی منتقلی کی سہولت فراہم کی۔[1]

---

[1] ملاف وثاق فلسطین، جلد 1، صفحہ 159-60 دیکھیں۔

[2] ایم شعبان ساوان، ص 334۔

ان تمام اقدامات کو سیاسی اور بین الاقوامی طور پر مینڈیٹ چارٹر[2] کے ذریعے قانونی حیثیت دی گئی، جسے برطانیہ نے فلسطین میں اپنی پالیسیوں کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ اس چارٹر میں بالفور اعلامیہ کے بنیادی اصول شامل تھے، آرٹیکل II برطانیہ کو پابند کرتا ہے کہ وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے لیے حالات تیار کرے۔ اس مینڈیٹ کو لیگ آف نیشنز میں بیس سے زیادہ ممالک سے بین الاقوامی منظوری حاصل ہوئی، یہ عالمی تنظیم پہلی جنگ عظیم کے بعد قائم کی گئی تھی۔

اس طرح برطانوی حکمرانی غیر ملکی یہودی برادری کی ترقی کے لیے ایک اتپریرک بن گئی، جس نے فلسطینی معاشرے کی قیمت پر اپنی مالی، سماجی اور سیاسی موجودگی کو آسان بنایا۔ مینڈیٹ کی چوتھی شق نے مزید "یہودی ایجنسی" کو برطانوی قبضے کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے قائم کیا، جس نے ایک یہودی ریاست کی حتمی تخلیق کی بنیاد رکھی۔ یہ صہیونی وجود کا سیاسی بیج تھا، جو یہودیوں کی نمائندگی کرے گا، ان کے معاملات کی نگرانی کرے گا اور مستقبل کی ریاست کے اداروں کی تعمیر کرے گا۔ ایجنسی کو ریاست کے قیام سے پہلے ہی بین الاقوامی سطح پر یہودیوں کی نمائندگی کرنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ نتیجتاً، یہودی ایجنسی برطانوی مینڈیٹ کے اندر ایک گورننگ پاور کے طور پر تیار ہوئی، آہستہ آہستہ ایک متوازی اور خود مختار اتھارٹی کی شکل اختیار کر گئی۔

اس طریقے سے برطانیہ نے اعلان بالفور کے متضاد وعدوں کو انجام دیا۔ یہودیوں کے لیے ایک وطن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، اس نے براہ راست اعلان کی ان شرائط کی خلاف ورزی کی جس میں غیر یہودی آبادی کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ اداروں کو فروغ دینے کا کام سونپا گیا تھا، برطانیہ نے اس ترقی کو

---

[1] بہجت ابو غربیہ، ص29

[2] اصطلاح "مینڈیٹ" ایک دھوکہ باز نو آبادیاتی افادیت ہے جو قبضے کی اصل نوعیت کو چھپاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑی طاقتوں اور ابھرتی ہوئی قوموں نے برطانیہ کو لوگوں پر حکمرانی کے لیے "مقرر" کیا، ان کی تعلیم، تربیت اور تہذیب کا کام اس وقت تک کہ وہ خود حکمرانی کے قابل نہ ہوں۔ اس طرح، قبضے = اور محکومیت کو ایک عظیم، انسانی مشن کے طور پر پیش کیا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس قابض نے اس قوم کو آگے بڑھانے میں مدد کرنے کا دعویٰ کیا تھا، اس نے اپنی سرزمین پر ایک نئی ریاست قائم کرنے کا موقع استعمال کیا، جس میں دنیا کے کونے کونے سے تارکین وطن کو لایا گیا جبکہ مقامی آبادی کو بے گھر اور بے دخل کیا گیا، جس سے ملک غیر ملکی آباد کاروں کے لیے خطرے میں پڑ گیا۔

یہودی اداروں تک محدود کر دیا، کسی بھی فلسطینی اداروں کے ابھرنے یا ترقی میں رکاوٹ ڈالی، حالانکہ اس وقت فلسطینیوں کی آبادی کا 92٪ تھا۔

1925 تک، صرف پانچ سال بعد، یہودیوں کی آبادی اور ان کی بستیوں میں اضافہ ہوا، اور ان کے ادارے اور انتظامی ڈھانچے فلسطینی آبادی کی نمائندگی کرنے والوں سے الگ الگ اداروں کے طور پر ابھرنے لگے۔

1. تل ابیب کے لیے خود مختار حکمرانی کا قیام۔
2. خود بین گوریون کی قیادت میں مزدور یونین کی تشکیل۔
3. عبرانی یونیورسٹی کا افتتاح ایک شاندار تقریب میں کیا گیا جس میں برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج، برطانوی فوجی گورنر ایلنبی، بالفور، چرچل، چیم ویزمین اور ہربرٹ سیموئل سمیت قابل ذکر شخصیات نے شرکت کی۔

یہودی کمیونٹی کی منظم فوجی طاقت 1929 کی بغاوت کے دوران واضح ہوئی، جب فلسطینیوں کو مسلح یہودیوں کی تشکیل شدہ صفوں اور عسکری تنظیموں نے حیرت میں ڈال دیا۔ فلسطین پر حکومت کرنے والی برطانوی انتظامیہ نے یہودی اور عیسائی عناصر کو اپنی صفوں میں شامل کر لیا، جس سے مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں تعداد اور حیثیت دونوں لحاظ سے ایک اقلیت کے طور پر چھوڑ دیا گیا۔ اس فوجی انتظامیہ نے اقلیتی گروہوں کو بااختیار بنایا اور ان پر انحصار کیا، فلسطین کے اندر سماجی حرکیات کو نئی شکل دی۔

1930 اور 1935 کے درمیان، 150,000 سے زیادہ یہودیوں نے فلسطین میں ہجرت کی، جس سے یہودیوں کی آبادی مؤثر طریقے سے دوگنی ہو گئی۔ زیادہ تر جرمن تھے، جن میں کافی تعداد میں مالدار کاروباری افراد شامل تھے، اور یہودی برادریوں کو ہتھیاروں کی اسمگلنگ میں کافی اضافہ ہوا۔

1935 میں صہیونی فیکٹریاں فلسطین سے ہیرے اور کپاس برآمد کر رہی تھیں۔ اس سال جرمنی سے یہودیوں کی امیگریشن کی ایک بڑی لہر کے عروج کو بھی نشان زد کیا گیا، جس سے ساٹھ ہزار سے زیادہ نئے تارکین وطن آئے۔

بیس سال کی مشترکہ کوششوں کے ذریعے، یہودی برادری نے امیگریشن کے ذریعے اپنی تعداد کو مضبوط کیا، برطانوی تعاون سے ہتھیار حاصل کیے، اور فوجی تربیت کے ذریعے مہارت حاصل کی۔ ان کا اثر و رسوخ اس حد تک بڑھ گیا جہاں انہوں نے چھدم-"اسلامی" اور "قومی" تنظیمیں قائم کیں جن کا مقصد حقیقی اسلامی قوم پرست گروہوں کو کمزور کرنا، اختلافات کی بونا، اور تقسیم اور بحرانوں کو ہوا دینا تھا۔

سیکورٹی اپریٹس نے فلسطین میں اسلامی تنظیموں کے ارکان کی ایک جامع پروفائل تیار کی تھی، جس میں ان لوگوں کی شناخت کی گئی تھی جن سے رابطہ کیا جا سکتا تھا، جن کو رشوت دی جا سکتی تھی، اور جن کے لیے خاتمہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس ایجنسی نے، جسے بعد میں موساد کے نام سے جانا جائے گا، یہاں تک کہ عرب ممالک میں ان کی اپنی برادریوں میں گھسنے کے لیے عرب یہودیوں کو جاسوس کے طور پر تربیت دینے کے لیے ایک ڈویژن قائم کیا۔[1]

1930 کی دہائی کے آخر تک، جیسے ہی دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، پندرہ ہزار یہودی اتحادی افواج میں شامل ہوئے۔ اس شمولیت نے انہیں وسیع تربیت، ہتھیاروں کی مہارت، اور جدید عسکری علم فراہم کیا، جو فلسطینیوں کے لیے دستیاب ہر چیز سے کہیں زیادہ ہے۔ اس عرصے کے دوران، ہاگناہ ایک باقاعدہ فوج کی شکل میں تیار ہوا، جو اپنے طیاروں کے بیڑے کے ساتھ مکمل ہوا۔

جنگ نے فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی کی ایک اضافی لہر کو بھی متحرک کیا، خاص طور پر جرمنی اور یورپ سے، جہاں یہودیوں کو نازی ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض صہیونی رہنماؤں نے اس ظلم و ستم کی تائید کی ہے کہ

[1] امین الحسینی کی یادداشت، صفحہ 69؛ المسیری، رحلت الفکریہ (میرا فکری سفر)، صفحہ 478

وہ فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کو تحریک دینے کا ذریعہ ہے[1]۔ بین گوریون نے خود تبصرہ کیا، "اگر مجھے جرمنی کے تمام یہودی بچوں کو انگلینڈ بھیج کر بچانے یا اسرائیل بھیج کر صرف آدھے کو بچانا ہے، تو میں بعد کا انتخاب کروں گا"۔[2]

ان فوجی اقدامات کے متوازی طور پر، انٹیلی جنس کی کوششوں نے ہر فلسطینی گاؤں پر ایک تفصیلی اور جامع ریکارڈ "گاؤں کی فائل" مرتب کرنے پر مرکوز رکھا۔

1939ء میں صیہونیوں اور ان کے برطانوی سرپرستوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ انگریز تین سال (1939-1936) تک جاری رہنے والی عظیم فلسطینی بغاوت کو دبانے کے لیے کوشاں تھے اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی، فلسطین کو پرامن بنانا ایک فوری ترجیح بن گیا۔ یہ کوشش "وائٹ پیپر" کے اجراء پر اختتام پذیر ہوئی، ایک پالیسی جس میں یہودیوں کی نقل مکانی کو ختم کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ صیہونیوں نے اس اقدام کی شدید مخالفت کی کیونکہ اس سے ریاست کے قیام کے ان کے منصوبوں کو خطرہ تھا، خاص طور پر جنگ کے نتیجے میں یورپ، خاص طور پر جرمنی سے زیادہ یہودیوں کو بے گھر کر دیا گیا، جہاں انہوں نے بعد میں ہولوکاسٹ کے نام سے مشہور ہونے والے شدید ظلم و ستم کا سامنا کیا۔

بین گوریئن نے برطانیہ کے ساتھ اس تنازعہ کو بڑی مہارت سے پیش کیا، جس کا خلاصہ معروف بیان میں کیا گیا: "ڈیوڈ بین گوریون نے فاشزم کے خلاف جنگ میں برطانوی فوج کی مدد کرنے کا عہد کیا گویا وائٹ پیپر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، جبکہ وائٹ پیپر کی شرائط کی مخالفت کرتے ہوئے گویا جنگ شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔

اگرچہ یہودی ملیشیاؤں نے دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑی تھی، لیکن کچھ زیادہ بنیاد پرست دھڑے ہاگناہ سے الگ ہو گئے، جس نے 1937 میں ارگن جیسی ملیشیا تشکیل دی۔ ارگن سے، 1940

[1] رجینہ شریف، صفحہ 13-14، 168؛ راجر گاراڈی، صفحہ 87 ایف ایف؛ راشد خالدی، صفحہ 66۔

[2] Garaudy، pp.87-88

میں اسٹرن گینگ کے نام سے ایک اور بھی شدید دھڑا ٹوٹ گیا، جس کی قیادت اس کے پولش بانی یائر سٹرن کر رہے تھے۔ یہ منقسم گروہ جلد ہی انگریزوں کے خلاف ہو گئے جنہیں اب وہ اپنے ریاستی عزائم کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور انہیں فلسطین سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسٹرن گینگ نے، خاص طور پر، برطانیہ کے خلاف اپنی دشمنی کو بڑھایا، یہاں تک کہ یہودیوں پر ظلم و ستم کے باوجود نازی جرمنی کے ساتھ رابطے کی کوشش کی- فلسطین میں برطانوی مفادات کو نقصان پہنچانے کی امید میں اسٹرن کا خیال تھا کہ برطانویوں نے یہودی ریاست کے وژن کو زیادہ خطرہ لاحق ہے، خاص طور پر وائٹ پیپر پالیسی کے ساتھ، جس نے یہودیوں کی امیگریشن کو محدود کیا اور فلسطین کی تقسیم کی تجویز پیش کی، جس میں عربوں کے لیے ایک ریاست بھی شامل تھی۔

اگرچہ سٹرن کی نازیوں کے ساتھ اتحاد کرنے کی کوشش ناکام رہی، لیکن اس نے برطانویوں پر اپنے حملے جاری رکھے جب تک کہ اس کا سراغ لگا کر ہلاک نہ کر دیا گیا۔ بہر حال، ارگن اور سٹرن گینگ دونوں نے برطانوی اہداف پر اپنے حملوں کو تیز کر دیا۔ وائٹ پیپر پالیسی کی حمایت کی وجہ سے 6 نومبر 1944 کو قاہرہ میں مشرق وسطیٰ کے اعلیٰ ترین برطانوی عہدیدار لارڈ موئن کا قتل سب سے قابل ذکر کارروائیوں میں سے ایک تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر فلسطین کی صورتحال ہر سطح پر مخدوش تھی۔

1. بین الاقوامی سطح پر: محوری طاقتوں پر اتحادیوں کی فتح، جن سے عربوں اور فلسطینیوں نے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، صہیونی ریاست کے منصوبے کے لیے سیاسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھنے کا راستہ صاف کر دیا۔
2. ملکی طور پر: زمین پر صیہونی اثر و رسوخ تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔

- ہگناہ ملیشیا ایک باقاعدہ فوج کی شکل اختیار کر چکی تھی، جو برطانیہ کے ساتھ جنگ میں حصہ لینے سے حاصل کی گئی فوجی تربیت، ہتھیاروں اور آلات سے لیس تھی۔

- یہودیوں کی نقل مکانی میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا، جنگ کے دوران 90,000 سے زیادہ یہودی فلسطین پہنچے اور اس کے بعد کے سالوں میں 60,000 سے زیادہ۔ صیہونی افواج نے 270,000 دونم اراضی پر قبضہ کر کے 73 نئی بستیاں قائم کیں۔
- صہیونی سیکورٹی اپریٹس فلسطینی دیہاتوں کے لیے ایک جامع حکمت عملی مکمل کر رہا تھا، ہر گاؤں کی زمین کی قسم، آبادی، معیشت، سیاسی وابستگیوں اور اس پر قبضے کے لاجسٹک چیلنجوں کے بارے میں تفصیلی ڈیٹا اکٹھا کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے مخبروں کے نیٹ ورک کو وسیع کیا، فلسطینی معاشرے اور اس کے اثر ورسوخ کے باقی مراکز پر نگرانی کو تیز کیا۔ انہوں نے "اسلامی قوم پرست" تنظیمیں بھی قائم کیں جو حقیقی اداروں سے مقابلہ کرنے، اختلافات کے بیج بونے اور عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے بنائی گئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے سب سے اہم نتائج میں سے ایک برطانیہ اور فرانس کا کم ہوتا ہوا اثر ورسوخ تھا، جس نے امریکہ اور سوویت یونین کی بڑھتی ہوئی طاقتوں کو راستہ دیا۔ صیہونی تحریک نے جلد ہی اس تبدیلی کو تسلیم کر لیا، 1942 میں اپنی بنیادی توجہ اور حمایت برطانیہ سے امریکہ کو منتقل کر دی، اس طرح اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عالمی طاقتوں کے ساتھ اتحاد کی اپنی قائم کردہ حکمت عملی کو جاری رکھا۔ اس وقت، امریکہ کو مشرق میں برطانوی اور فرانسیسی اثر ورثے میں مل رہا تھا اور وہ اسے ختم کرنے کے لیے کام کر رہا تھا جسے وہ "پرانی نوآبادیات" کہتا ہے، اس کی جگہ بالواسطہ کنٹرول کی ایک نئی شکل لے کر۔ نتیجتاً، امریکہ نے قوموں کی آزادی، حق خود ارادیت، اور اسی طرح کے اصولوں جیسے نظریات کو فروغ دینا شروع کیا۔

تاہم یہ محض بیان بازی نہیں تھی۔ صہیونی ملیشیا بشمول ہگناہ نے برطانوی اہداف، تنصیبات اور اہلکاروں پر براہ راست حملے شروع کر دیئے۔ ہاگناہ، اگرچہ باضابطہ طور پر الگ ہے، خفیہ طور پر زیادہ بنیاد پرست ارگن اور اسٹرن

گینگ کے ساتھ تعاون کیا تھا، یہ شراکت داری 22 جولائی 1946 کو یروشلم میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل پر بمباری پر منتج ہوئی۔

یہ ہوٹل، جس میں فلسطین میں برطانوی فوجی اور سول انتظامیہ رہائش پذیر تھی، ایک تباہ کن حملے کی جگہ بن گیا جس میں نوے سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ یہ کارروائی برطانوی حکام کی جانب سے ہگناہ کو برطانوی مخالف فوجی کارروائیوں میں ملوث ہونے والی دستاویزات حاصل کرنے کے بعد شروع کی گئی تھی۔[1] یہ حملہ ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا، جس نے انگریزوں کے لیے یہ اشارہ دیا کہ صیہونی مکمل طور پر ان کے خلاف ہو چکے ہیں اور اب بڑھتی ہوئی امریکی طاقت کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں، جس کا مقصد استعماری طاقت کے اثر ورسوخ، حیثیت اور وسائل کو حاصل کرنا ہے۔

اس وقت سے، صیہونیت نے آزادی کی تحریک کا روپ دھار لیا، اور برطانوی قابضین کو وطن سے نکالنے کے لیے لڑنے کا دعویٰ کیا! یہ بیانیہ 1948 اور 1970 کے درمیان غالب نظریات کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے، دنیا بھر میں صیہونیوں کے لیے ایک ریلی بن گیا، جس میں لوگوں کے حقوق اور خود ارادیت پر زور دیا گیا تھا۔ ان خیالات کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں نے پیش کیا، لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے حقیقی تشویش کی وجہ سے نہیں، بلکہ برطانوی اور فرانسیسی اثر ورسوخ کو کمزور کرنے کے لیے اپنے متعلقہ جیو پولیٹیکل ایجنڈوں کے حصے کے طور پر۔

برطانیہ، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسطین کی صورت حال کو مزید حل نہیں کر سکتا، اس معاملے کو نو تشکیل شدہ اقوام متحدہ کے پاس بھیج دیا- ایک ادارہ جسے دوسری جنگ عظیم کی فاتح طاقتوں نے عالمی گورننس کی نگرانی کے لیے قائم کیا تھا۔ یہودی ریاست کے قیام کی جانب برطانیہ کے ابتدائی اقدامات کے بعد یہ اقدام فلسطین کے مسئلے میں ایک اہم لمحہ تھا۔

[1] دیکھیں میناچم بیگن، دی ریولٹ، صفحہ 289-295۔

1918 سے 1948 تک برطانوی قبضے کے دور میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی میں تیرہ گنا اضافہ ہوا۔ 1918 میں، تقریباً 50,000 یہودی تھے، جو آبادی کا 8٪ تھے۔ 1948 تک ان کی تعداد 650,000 تک پہنچ گئی۔ اس کے برعکس، 1918 میں فلسطینیوں کے پاس 98.5 فیصد اراضی تھی، لیکن 1948 تک یہودیوں نے اس کا 60 فیصد حصہ سنبھال لیا۔

جب کہ تھیوڈور ہرزل کو اکثر تحریک کا ابتدائی بیج بونے کے لیے صیہونیت کا باپ سمجھا جاتا ہے، ہمیں ان لوگوں کے اہم کرداروں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ان کی پیروی کرتے تھے، خاص طور پر چیم ویزمین، ہربرٹ سیموئل، اور ڈیوڈ بین گوریون۔ اس بااثر تینوں نے صہیونی ریاست کے قیام میں سہولت فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی اور اندرونی دونوں صورتوں کی تشکیل کے لیے انتھک محنت کی۔ اس کے ساتھ ہی، انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اسرائیل مکمل طور پر مغربی سیاسی تبدیلیوں پر انحصار نہیں کرے گا بلکہ سیاسی منظر نامے میں ایک اہم عنصر کے طور پر اپنی خود کفالت کو پوزیشن میں رکھتے ہوئے اپنی فوجی، اقتصادی اور سلامتی کی خود مختاری بنائے گا۔ یہودیوں میں مقبول اور مذہبی حمایت حاصل کرنے کی کوششوں کے باوجود، ان کی بنیادی توجہ ایسے حالات پیدا کرنے پر تھی جو ریاست کی تشکیل کو ناگزیر بنادیں۔ جب تک اسرائیل کا اعلان ہوا، ریاست پہلے ہی ایک فِٹ اکمپلی بن چکی تھی۔

یہ کہانی کا صیہونی-برطانوی تناظر تھا، جب کہ فلسطینی معاشرہ اپنی متوازی اور باہم جڑی ہوئی داستان کو بُن رہا تھا، جو کہ درج ذیل ہے۔

برطانوی حکومت کے تحت فلسطینی معاشرے کی صورتحال

فلسطینیوں کو اپنی سرزمین پر برطانوی قبضے کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران پہلے ہی بے پناہ مصائب برداشت کرنے کے بعد، بہت سے فلسطینیوں کو سلطنت عثمانیہ کے ساتھ مل کر مختلف محاذوں پر لڑنے کے لیے بھرتی کیا گیا تھا۔ اتحادی افواج کے ساتھ لڑائیوں نے فلسطینی شہروں میں بڑے پیمانے پر تباہی

مچائی، اور ملک میں شدید قحط نے تباہی مچادی، جس سے لاتعداد لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ غزہ سب سے زیادہ متاثرہ علاقوں میں سے ایک تھا، جس نے انگریزوں اور عثمانیوں کے درمیان تین بڑی لڑائیاں دیکھی ہیں، اور وسیع علاقے برطانوی بمباری سے تباہ ہو گئے تھے[1]۔

پہلی جنگ عظیم میں جب عثمانیوں کو شکست ہوئی تو وہاں کے لوگوں نے خود کو چھ صدیوں میں پہلی بار غیر ملکی قبضے میں پایا۔ مملوک کے زمانے سے، جب صلیبیوں کو لیونٹ کے ساحلوں سے بھگا دیا گیا تھا، کسی بھی غیر ملکی طاقت نے ان سرزمین پر اپنی موجودگی قائم نہیں کی تھی۔ اس خطے کے لوگ صرف اسلامی خلافت کو جانتے تھے، عثمانیوں نے چار صدیوں تک اس کی آخری شکل کی نمائندگی کی۔

جنگ کے چند سال بعد، مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں اقتدار سنبھالا، خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا اور وسیع عثمانی سلطنت کو جدید دور کے ترکی کی سرحدوں تک محدود کر دیا۔ اس نے ترکی کو ایک آزاد وطن کے طور پر اعلان کیا، جس نے عثمانیوں کے زیر انتظام دوسری سرزمینوں سے تمام تعلقات منقطع کر لیے۔ اس نے فلسطینی عوام کو ایک بے مثال اور حیران کن صورتحال میں ڈال دیا۔ چودہ صدیوں تک، جب سے یہ خطہ اسلامی حکومت کے تحت آیا، یہ ہمیشہ ایک وسیع اسلامی خلافت یا خلافت کے تحت ایک اہم اسلامی ریاست کا حصہ رہا ہے۔ یہ ایک آزاد ہستی کے طور پر کبھی موجود نہیں تھا۔ اب یہ کیسے آزاد اور بیک وقت غیر ملکی قبضے میں رہ سکتا ہے، جس کے دفاع یا آزادی کی ذمہ داری کوئی نہ لے۔

اس صورتحال نے ایک شدید فکری اور نفسیاتی ہلچل پیدا کر دی۔ اس وقت تک، فلسطین کے لوگوں نے اپنی شناخت واضح طور پر "فلسطینی" کے طور پر نہیں کی تھی۔ یہ اصطلاح شناختی نشان کے طور پر بہت کم معنی رکھتی ہے۔ اس کے بجائے، لوگوں نے اپنی شناخت اپنے خاندان، شہر، مذہب، یا بڑے عثمانی باجرا (قوم) کے حصے کے طور پر کی۔ لیکن اب، ایک نیا تصور شکل اختیار کر رہا تھا—ایک نیا خیال اور ابھرتی ہوئی شناخت: فلسطین۔ اس

[1] راشد خالدی، صفحہ 42۔

مقام سے آگے، "فلسطین" ایک انوکھی اہمیت کا حامل ہونا شروع ہوا، نہ صرف ایک جغرافیائی خطے کے طور پر بلکہ ایک الگ وطن کے طور پر، جو دوسروں سے الگ، غیر ملکی قبضے کے تحت، اپنے لوگوں کے لیے ایک اجتماعی تشخص کو مجسم بناتا ہے[1]۔ یہ آزادی اور خود ارادیت کا راستہ تلاش کرنے والا وطن بن گیا۔

قوم پرستانہ نظریات نے کئی اہم چینلز کے ذریعے فلسطینی معاشرے میں پھیلنا شروع کیا۔

1. تعلیم کی توسیع: مشنری تنظیموں اور غیر ملکی مشنوں کے قائم کردہ اسکولوں کے پھیلاؤ نے تعلیم یافتہ افراد میں اضافہ کیا۔ اس کے جواب میں، عثمانی ریاست نے اپنے شہریوں پر اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اپنے اسکول قائم کیے،[2] حالانکہ یہ اسکول اس وقت کے بڑھتے ہوئے قوم پرست جذبات سے متاثر تھے۔ پڑوسی ممالک جیسے مصر، شام اور لبنان میں بھی تعلیم کی سطح بڑھ رہی تھی، جہاں نصاب، خبروں، ادب اور ثقافتی بیانیے کی تشکیل میں قوم پرستی ایک غالب موضوع تھی۔ یہ خیالات بڑھتے ہوئے پڑھے لکھے طبقے کے درمیان مضبوطی سے گونجنے لگے، جو سماجی اثر و رسوخ حاصل کر رہا تھا۔
2. غیر ملکی قبضے کی ضمنی پیداوار کے طور پر قوم پرستی: غیر ملکی قبضے نے خود قوم پرست نظریات کو فروغ دیا، کیونکہ قابض طاقتیں جبر اور لالچ دونوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے نظریات کو اپنے زیر کنٹرول ممالک میں متعارف کرواتی ہیں۔ جس طرح قابض اپنے مفادات کے مطابق سماجی ڈھانچے کی تنظیم نو کرتے ہیں، اسی طرح زیر قبضہ لوگ اکثر قابض کے عالمی نظریہ کے عناصر کو اپنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے مظلوموں میں غالب طاقت کی تقلید کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے، اور قوم پرست خیالات بڑے پیمانے پر گردش کر رہے ہیں، خاص طور پر ان طبقات میں جو قبضے سے زیادہ قریب سے جڑے ہوئے ہیں۔
3. اسلامی اتھارٹی کا خاتمہ: اسلامی خلافت کی شکست اور مصطفیٰ کمال کے بعد اس کے خاتمے کے بعد، ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ شکست خوردہ نظریات کو اکثر مسترد ہونے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور معاشرے

[1] راشد خالدی، صفحہ 51-52۔

[2] Ibid., p.34.

اقتدار میں رہنے والوں کے مروجہ نظریات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس نے اسلامی فکر کی پابندی میں کمی اور قوم پرست نظریات کی طرف کشش میں اضافہ کیا[1]۔ یہاں تک کہ بااثر مذہبی اور قانونی رہنما، جن میں علماء اور جج بھی شامل ہیں، نے اس وقت سیکولر نظریات کو اپنانا شروع کر دیا۔[2]

4. فلسطینیوں کے دفاع کے لیے علاقائی حمایت کی عدم موجودگی: علاقائی رہنما اب فلسطین کے دفاع کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ دریں اثنا، قابض طاقت، جس کی جڑیں ایک یورپی قوم پرست اور نسلی شناخت میں ہیں، خود فلسطین کے اندر ایک قومی شناخت کو فروغ دے رہی تھی، خاص طور پر، ایک یہودی ریاست۔ یہ، لیگ آف نیشنز کے ذریعے قوم پرستی پر بنائے گئے بین الاقوامی نظام کے ساتھ مل کر، قابض کے خلاف مزاحمت اور آزادی کے حصول کے لیے قوم پرستی کو ایک قدرتی ذریعہ بنا۔ فلسطینیوں اور دیگر نو آبادیاتی اقوام نے آزادی، قومی آزادی اور حق خود ارادیت کے اصولوں کی طرف رجوع کیا جن کی امریکی صدر نے عوامی طور پر توثیق کی اور نو آبادیاتی لوگوں نے بڑے پیمانے پر قبول کیا۔ ان نظریات کے ذریعے، بہت سے لوگوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والی عالمی کانفرنسوں میں اپنے قابضین سے آزادی کے لیے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔

ان عوامل کی وجہ سے، بہت سے کم اثرات کے ساتھ، قوم پرستی کے خیالات لوگوں میں زور پکڑنے لگے، جو آہستہ آہستہ "فلسطینی عوام" کے نام سے مشہور ہونے لگے۔ اس ابھرتی ہوئی شناخت نے جڑ پکڑ لی اور درحقیقت برطانوی اور صیہونی قبضے کے دوہرے دباؤ کے سامنے اس کی ضرورت تھی۔ شروع ہی سے، فلسطینی عوام، اس جدید قوم پرستانہ معنوں میں، اپنے وجود کو ثابت کرنے، اپنی سرزمین پر اپنے حق کے اثبات، اور برطانوی راج اور صہیونیت کے وجود کو لاحق خطرے سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف نظر آئے۔

---

[1] احمد الشقیری، ج3، ص723۔

[2] دیکھیں، خالدی، صفحہ 52-53۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسطینیوں نے اپنی اسلامی شناخت اور وابستگی ترک کر دی۔ جدوجہد اور مزاحمت کے تمام ادوار میں، اسلامی موجودگی غالب رہی، اسلام کی حرمت جذبات کو ابھارنے، کوششوں کو متحرک کرنے اور فلسطین کی سرحدوں سے باہر سے حمایت حاصل کرنے میں بنیادی قوت کے طور پر کام کر رہی ہے۔ بلکہ، یہاں بات یہ ہے کہ ان مختلف عوامل نے اجتماعی طور پر سیاسی منظر نامے کو آگے بڑھایا جو ایک قوم پرست اور حب الوطنی کے فریم ورک کی طرف ممکن اور قابل حصول تھا۔ نتیجے کے طور پر، زیادہ تر سیاسی اور میڈیا گفتگو اس سمت میں منتقل ہو گئی، جس میں ایک قومی ریاست: فلسطین کی آزادی پر توجہ مرکوز کی گئی۔

رطانوی مینڈیٹ کے بنیادی مقاصد میں سے ایک، ہربرٹ سیموئل کے بعد سے، فلسطینیوں کو ایک ایسی ریاست یا سیاسی وجود بنانے سے روکنا تھا جو ان کی نمائندگی کر سکے۔ برطانوی پالیسی، اس کی فوجی قوتوں کی حمایت سے، فلسطینیوں کے لیے کسی بھی نمائندہ کونسل کے قیام کی فعال طور پر مخالفت کرتی ہے، جیسا کہ یروشلم میں 1928 کی عرب کانگریس نے مطالبہ کیا تھا۔ مزید برآں، برطانوی پالیسی نے فلسطینیوں کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت رکھنے والی کسی بھی قیادت کے عروج کو روکنے اور کسی بھی ایسی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جو فلسطینی سیاسی قوت کی تشکیل کا باعث بن سکے۔

اس طرح، برطانوی پالیسی نے بیک وقت دو متضاد مقاصد کی پیروی کی: ریاستی حیثیت کے ضروری عناصر سے خالی ایک یہودی ریاست کے قیام میں سہولت کاری، حمایت اور پرورش، جبکہ خود مختاری کے تمام ضروری صفات کے ساتھ فلسطینی ریاست کے قیام کو فعال طور پر روکنا۔ یہ غیر معمولی اور غیر معمولی صورتحال فلسطین کے لیے منفرد تھی۔ اس کے برعکس، برطانوی قبضے کے تحت دیگر عرب ممالک میں، برطانوی نقطہ نظر کلائنٹ حکومتوں کو نصب کرنا تھا، جیسا کہ مصر، اردن، عراق اور دیگر جگہوں پر ثبوت ملتا ہے۔

اس پالیسی کا ایک نتیجہ بااثر فلسطینی خاندانوں، جیسے حسینیوں اور ناشابیوں کے درمیان دشمنی اور تنازعات میں شدت پیدا کرنا تھا۔ حاج امین الحسینی، جو بنیادی فلسطینی سیاسی رہنما کے طور پر ابھرے تھے، برطانوی حکام نے

ان کا تعاقب کیا اور مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ اسے گرفتار کرنے کے لیے، انگریزوں نے مسجد پر دھاوا بولنے کے لیے ایک "مسلم" ہندوستانی بٹالین کو تعینات کیا، لیکن الحسینی بیرون ملک سے اپنی مزاحمتی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے فلسطین سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سیاسی قیادت اور زمینی سرگرمیوں کے درمیان اس علیحدگی نے تحریک کی ہم آہنگی کو نمایاں طور پر کمزور کیا۔

اسی وقت، سیکولر قوم پرست اور بائیں بازو کے کمیونسٹ نظریات فلسطینی اشرافیہ اور سماجی طور پر ابھرتے ہوئے، تعلیم یافتہ نوجوانوں میں پھیلنے لگے۔ غیر ملکی، جدید نظریات کی اس آمد نے فلسطینی معاشرے کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا، اس کے دیرینہ اسلامی تشخص اور نئے نظریات کے درمیان تقسیم پیدا کر دی، اور اس طرح اس کی اندرونی ہم آہنگی کو درہم برہم کر دیا۔

مزید برآں، پڑھے لکھے نوجوان فلسطینی آبادی کے روزمرہ کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے قابض افواج کے قائم کردہ اور زیر نگرانی انتظامی اداروں میں پوزیشنیں لے کر سماجی طور پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ملازمین کے اس ابھرتے ہوئے طبقے کو ٹیکس وصولی اور قابضین کی انتظامی رسائی کو تقویت دینے کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کی شمولیت قابضین کے ارادے یا وفاداری سے نہیں بلکہ ضرورت کے تحت تھی، کیونکہ یہ کردار گریجویٹس کے لیے کیریئر کے چند قابل عمل راستوں میں سے ایک کی نمائندگی کرتے تھے۔

ان اداروں میں ملازمت نے سماجی نقل و حرکت کے لیے ایک راستہ بھی فراہم کیا جو درمیانی اور نچلے طبقے کے افراد کے لیے فطری خواہش ہے[1]، اور یہاں تک کہ معاشرے میں اعلیٰ طبقے کی سماجی اور اقتصادی حیثیت کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ بھی۔

---

[1] بہجت ابو غربیہ، صفحہ 34، 43۔

اس طرح فلسطینی معاشرہ نے خود کو غیر ملکی قبضے میں پایا، جس نے مغربی نظریات کی آمد اور ایک غالب نظام کا سامنا کیا جس نے تعلیم، مالی ترقی اور سماجی نقل و حرکت کے لیے راستے بنائے۔ ایک ساتھ، ان اثرات نے ایک مربوط مزاحمتی تحریک کی تشکیل اور اتحاد کو نقصان پہنچایا۔

برطانوی قبضے نے بھی جان بوجھ کر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں مذہبی تقسیم کو فروغ دیا اور اس کا استحصال کیا۔ [1] اگرچہ عیسائی اور یہودی اقلیتوں نے ابتدائی طور پر آنے والے قبضے کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا، لیکن واقعات کے دوران، طاقت کی موجودہ حرکیات اور پائیدار پالیسیوں کے ساتھ، رفتہ رفتہ بہت سے یہودیوں کو صیہونی منصوبے کے ساتھ منسلک کر دیا، جب کہ عیسائی تیزی سے برطانوی تحفظ کی طرف متوجہ ہوئے۔ استعمار کے عیسائی مخالفین نے اسلامی کی بجائے ایک سیکولر، قوم پرست عرب شناخت کو فروغ دینے کی امید کی تھی- ایک ایسا نقطہ نظر جس نے مسلم اکثریتی معاشرے میں اپنا اثر حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ مزید برآں، عیسائی اقلیت کے لیے برطانوی جانبداری، جس کی نشان دہی بتدریج اعلیٰ عہدوں اور خصوصی مراعات کی تقسیم سے ہوتی ہے، اس نے قبضے کے خلاف مزاحمت کو مزید کم کر دیا۔ صرف ایک چھوٹے سے دستے نے، جو مشترکہ عرب شناخت اور قبضے سے لاحق خطرات کے بارے میں شدید آگاہی کی وجہ سے اپنی مخالفت کو برقرار رکھا[2]۔

ایک قابض قوت کے لیے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دینا، تنازعات کو ہوا دینا اور کشیدگی کو بڑھانا فطری اور متوقع ہے۔ یہ حکمت عملی برطانوی مینڈیٹ کی پوری مدت میں برقرار رہی۔ [3]

---

[1] ابو غربیہ، صفحہ 12،16۔

[2] ایرا ایم لاپیڈس، اسلامی معاشروں کی تاریخ، جلد 2، صفحہ 914

[3] مثال کے طور پر دیکھیں ابو غربیح ص 16۔ صلاح خلف، فلستینی بِلا حویّۃ (ایک فلسطینی بغیر شناخت کے)، صفحہ 31

سیاسی انتشار کے باوجود، بہت سے عرب ذرائع مسلمانوں اور یہودیوں، خاص طور پر مقامی آبادیوں اور عرب ورثے کے یہودیوں کے درمیان بقائے باہمی کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یہ بقائے باہمی خاص طور پر بڑے تجارتی شہروں میں نمایاں تھا، جہاں سماجی تعامل اور رواداری وسیع تر سیاسی منظر نامے سے آزادانہ طور پر سامنے آتی ہے۔ روزمرہ کی حرکیات ایک فطری ہم آہنگی کی خصوصیت رکھتی تھیں۔[1] جفا سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان نے یہاں تک کہا کہ فلسطینی مردوں کا یہودی عورتوں سے محبت کرنا "غیر معمولی" نہیں تھا، اور یہودی عورتوں سے شادیاں غیر معمولی نہیں تھیں۔

ان حالات کو سمجھنا جن میں فلسطینی معاشرہ موجود تھا، اس سے پیدا ہونے والی مزاحمت کی نوعیت، اس کے سامنے آنے والی رکاوٹوں کے بارے میں قیمتی بصیرت فراہم کرتا ہے، اور اس کے ممکنہ نتائج کی زیادہ حقیقت پسندانہ توقعات قائم کرنے میں مدد کرتا ہے۔

فلسطین میں مزاحمت

فلسطینی معاشرہ جن حالات میں رہتا تھا، اس کے پیش نظر مزاحمت کی شکلوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلی، پرامن سیاسی اور قانونی مزاحمت، اور دوسری، مسلح، پر تشدد یا غیر قانونی مزاحمت (جیسا کہ برطانوی قانون نے بیان کیا ہے، یقیناً).

پرامن سیاسی اور قانونی مزاحمت نے برطانوی سیاسی اصولوں، قوانین اور فلسطینی کاز کی حمایت میں نعروں اور فلسطینی عوام کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد انگریزوں پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ اپنی اعلان کردہ اقدار کی پاسداری کے لیے عوامی شرمندگی، مذمت اور برطانوی حکمرانی کے تحت اجازت یافتہ دیگر حربوں کا استعمال کرتے ہوئے دباؤ ڈالیں۔ مزاحمت کی یہ شکل اکثر کمزور لوگ اپناتے ہیں جنہیں اپنے ظالموں کا براہ راست مقابلہ

[1] صلاۃ خلف، ص 23-24۔

کرنے کی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں، یہ ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جو اسلامی طاقت سے محروم ہو چکا تھا جس نے کبھی اس کی حفاظت کی تھی، اب مسلسل عالمی سپر پاور کے قبضے میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اگرچہ پرامن سیاسی اور قانونی مزاحمت آزادی یا آزادی کا راستہ نہیں ہے، لیکن جب طاقت کے متبادل ذرائع دستیاب نہ ہوں تو یہ ایک ضروری سہارا بن جاتا ہے۔ قبضے کی جڑی ہوئی فطرت، مغرب کی زبردست طاقت اور اس کی طویل مدت کے ساتھ مل کر، معاشرے کے کچھ طبقات کو اس پرامن انداز کو اپنانے پر مجبور کیا، خاص طور پر جب یہ ان کے ذاتی مفادات کے مطابق ہو۔ ایسے ماحول میں قابضین نے اپنی جوڑ توڑ سیاسی حکمت عملی کے ساتھ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے مقامی اشرافیہ اور دولت مند شخصیات کا ساتھ دیا۔ ان افراد کو مراعات اور عہدوں سے نوازا گیا جس کی وجہ سے وہ آبادی کو پرسکون اور کنٹرول کر سکتے تھے۔[1] اس رجحان کو، جسے کچھ محققین نے "ٹیم نیشنلزم"[2] کہا ہے، ان اشرافیہ کو قابضین کو مطمئن کرنے اور عوامی اختلاف کو دبانے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مقابلہ کرتے دیکھا۔ دریں اثنا، انہوں نے مہنگے اور زیادہ خطرے والے تصادم کا سہارا لیے بغیر اپنے آپ کو قابضین سے رعایتیں حاصل کرنے کے قابل کے طور پر پیش کر کے لوگوں کے درمیان احسان کرنے کی کوشش کی۔

یہ نوٹ کرنا بہت ضروری ہے کہ ایسے افراد کو آسانی سے غدار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حالات پیچیدہ اور تہہ دار تھے، کمزوری، کمزوری، اور قومی فلاح و بہبود اور ذاتی یا خاندانی فائدے کے درمیان متصادم مفادات کو ملا رہے تھے۔ کچھ محض بولی یا گمراہ تھے، جب کہ دوسروں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر قبضے کے ساتھ جوڑ دیا۔ کچھ شخصیات نے دھوکہ دہی کے ساتھیوں کے طور پر شروع کیا لیکن بعد میں مزاحمت کے ثابت قدمی کے حامی بن گئے، جب کہ دوسروں نے مزاحمت کا آغاز صرف بتدریج تعاون کرنے یا وعدوں اور دھمکیوں کے ذریعے مجبور

---

[1] دیکھیں: فتح الشقاقی، رحلت الدم ال لدھی حزم الصیف، (مکمل کام: خون کا سفر جس نے تلوار کو شکست دی)، جلد، صفحہ 176۔

[2] فلسطینی شاعر اور اسکالر تمیم برغوتی نے اس عنوان کے ساتھ ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، جس میں برطانوی قبضے کے تحت مصری سیاسی طبقے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ تاہم، تفصیل نوآبادیاتی دور میں تمام مقبوضہ ممالک پر یکساں طور پر لاگو ہوتی ہے۔

کیا، بالآخر قبضے کے مفادات سے ہم آہنگ کیا۔ لہٰذا، ان رہنماؤں اور افراد کا اندازہ لگانا ضروری ہے کہ ہر معاملے کی بنیاد پر محتاط، باریک بینی سے تفتیش کی جائے۔

مزید برآں، یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ خطے کی تقسیم نے عرب قیادت کو بری طرح کمزور کیا۔ عثمانی ڈھانچے کے خاتمے نے، جو کبھی وسیع تر قومی روابط پیش کرتا تھا، لیڈروں کو تنگ، قومی حدود میں الگ تھلگ کر دیا۔[1] اس تنہائی نے ان کی صلاحیتوں کو محدود کر دیا، جس سے مزاحمت کرنے، چیلنج کرنے اور اہم مخالفت کو بڑھانے کی ان کی صلاحیتوں کو محدود کر دیا گیا۔

اس پرامن مزاحمت کے نمایاں ترین اظہار نے عرب کانفرنسوں کی ایک سیریز کے ذریعے شکل اختیار کی، جس کے بنیادی مقاصد میں بالفور اعلامیہ کو منسوخ کرنا، یہودیوں کی امیگریشن کو روکنا، یہودیوں کو زمین کی فروخت روکنا، اور فلسطینیوں کی نمائندگی کرنے والی قانون ساز کونسل کا قیام، بالآخر فلسطینی حکومت کے قیام کا مقصد تھا۔ کانفرنسوں کا یہ سلسلہ 1919 میں یروشلم میں پہلی کانگریس سے شروع ہوا، جہاں مندوبین نے گریٹر شام کی تقسیم کی مذمت کی اور اس بات پر زور دیا کہ فلسطین عرب حکمرانی کے تحت متحدہ شام کا حصہ ہے۔[2] تاہم، استعماری طاقتوں کی زبردست طاقت نے، شریف حسین کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو غیر ملکی اتھارٹی کے حوالے کرنے اور عراق اور اردن میں ان کے مقرر کردہ عہدوں کو قبول کرنے کے ساتھ، ان مطالبات کو غیر موثر بنا دیا۔

کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رہا، موسی کاظم الحسینی کی قیادت میں 1928 تک سات کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جنہوں نے 1934 میں اپنی وفات تک سب سے اہم فلسطینی سیاسی رہنما کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے، برطانیہ نے یروشلم کے مفتی اور اسلامی کونسل کے سربراہ کے کردار تخلیق کیے، ان

---

[1] ابو غربیہ، ص30۔

[2] فلسطین دستاویز کی فائل دیکھیں، جلد 1، صفحہ 263-64۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ محض الگ تھلگ سیاست دانوں کی خواہش نہیں تھی، جیسا کہ آج ہو سکتا ہے، بلکہ اس وقت عوام میں موجود جذبات کی بازگشت پریس میں بھی سنائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ، احمد شقیری، جلد 3، صفحہ 729 اور اس سے آگے، اور صفحہ 745 دیکھیں۔ بہجت ابو غربیہ، ص ۱۲-30; راشد خالدی، ص-56.

کے کزن امینی کو ان عہدوں پر مقرر کیا۔ اس فیصلے نے کچھ کشیدگی اور تقسیم کو جنم دیا۔[1] اگرچہ امین الحسینی نے ابتدائی طور پر برطانویوں کے خلاف مفاہمت کا موقف اپنایا، لیکن وہ جلد ہی فلسطینی مزاحمت کے غیر متنازعہ رہنما کے طور پر ابھرے، برطانوی قبضے کا مقابلہ کرنے کے لیے بھرپور طریقے سے کام کیا .

قوم پرستوں اور عربوں کی طرف سے تصنیف کردہ تاریخی مطالعات میں شاذ و نادر ہی ایک نکتہ پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ مزاحمت پرامن اور جنگجو دونوں طرح سے زیادہ تر اسلامی کردار سے تشکیل پاتی ہے۔ اس دور کی سرکردہ شخصیت مفتی حاج امین الحسینی تھے، جنھوں نے الحسینی خاندان کی طاقت کے سہارے، اسلامی اوقاف، شرعی عدالتوں، ججوں، اماموں اور مبلغین پر اپنے مذہبی اختیار اور اثر و رسوخ پر اور بھی زیادہ انحصار کیا۔ ان کا ساتھ دینے والے قرآنی اسکولوں کے اساتذہ تھے، جو عصری اسکولوں کی طرح، گاؤں کی زندگی میں گہری جڑیں رکھتے تھے۔ مفتی کے مذہبی قد نے اپنے اثر و رسوخ کو فلسطین سے بھی آگے بڑھایا، چاہے وہ سیاسی رہنما ہوں یا اسلامی اسکالرز اور پورے خطے میں تحریک کے رہنما۔[2] نتیجتاً مفتی کی جماعت اور اس کے پلیٹ فارم کو وسیع عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ مخالف دھڑوں، جیسا کہ ناشاشیبی خاندان اور اس کے حامیوں نے، خاندانی تعلقات کے ذریعے اپنے اثر و رسوخ کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کی[3]۔

پرامن مزاحمتی کوششوں میں مختلف طریقوں کو بھی شامل کیا گیا ہے، بشمول لندن کے سفارتی دورے، احتجاجی مظاہرے منظم کرنا، درخواستیں جاری کرنا، اور اپیل کی کارروائیوں کو پرامن مزاحمتی تحریکوں کا نمونہ بنانا۔[4] اگرچہ ان کوششوں نے بعض اوقات مخصوص حالات میں محدود کامیابیاں حاصل کیں، لیکن انھوں نے تنازعہ کی رفتار کو خاطر خواہ طور پر تبدیل نہیں کیا[5]۔ تاہم پرامن مزاحمت کے اس راستے کو دو بڑے دھچکے لگے۔ پہلا

---

[1] خالدی، ص69۔

[2] امین الحسینی کی یادداشت ملاحظہ کریں، جس میں عرب اور اسلامی دنیا میں ان کے تعلقات کے وسیع نیٹ ورک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

[3] بہجت ابوغربیہ، صفحہ 31-32

[4] ن مظاہروں اور درخواستوں کی مثال فلسطین کی دستاویزات کی فائل، جلد 1، صفحہ 263 ایف ایف میں دیکھیں۔

[5] ابوغربیہ، ص13۔ خالدی، صفحہ 54،67

1930 میں موسیٰ کاظم الحسینی اور عرب وفد کا لندن کا ناکام دورہ تھا۔ دوسرا فروری 1931 میں برطانوی وزیر اعظم رامسے میکڈونلڈ کا چیم ویزمین کو لکھا گیا خط تھا، جسے اکثر "بلیک لیٹر" کہا جاتا ہے، جس میں صیہونیت کی حمایت کے لیے برطانیہ کے عزم کا اعادہ کیا گیا تھا۔ اس خط نے اکتوبر 1930 سے برطانیہ کے پہلے کے وعدے کو مؤثر طریقے سے منسوخ کر دیا، جہاں اس نے ایک برطانوی ماہر کی سفارش کی بنیاد پر یہودیوں کی امیگریشن کو محدود کرنے پر اتفاق کیا تھا کہ اضافی یہودی آباد کاروں کے لیے فلسطین میں مزید زمین دستیاب نہیں ہے۔[1]

پرامن اقدامات جاری رہے کیونکہ مسلح مزاحمت کرنے والے بھی کھل کر اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اپنی نقل و حرکت پر پردہ ڈالنے، حامیوں کی شناخت کرنے، عرب اور مسلمانوں کے جذبات کو نکالنے، اور فنڈز محفوظ کرنے یا کارروائیاں شروع کرنے کے لیے پرامن سرگرمیوں کی ضرورت تھی۔ 1931 میں، جنرل اسلامی کانگریس یروشلم میں منعقد ہوئی، جسے "جدید دور کا سب سے بڑا اسلامی اجتماع" قرار دیا گیا[2]۔ اس نے راشد ردا، محمد اقبال، تیونس سے عبد العزیز ثعلبی، اور ہندوستان سے شوکت علی جیسے ممتاز اسلامی رہنماؤں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کانگریس نے اسلامی یونیورسٹی کے قیام، فلسطینی زمینوں کے تحفظ کے لیے ایک کمپنی بنانے اور ہر ملک میں فلسطین کمیٹیاں بنانے کی قراردادیں جاری کیں[3]۔

1935 میں فلسطینی علماء کی کانفرنس بلائی اور ایک فتویٰ جاری کیا جس میں یہودیوں کو اراضی کی فروخت پر پابندی عائد کی گئی اور اس طرح کے لین دین میں حصہ لینے والوں کی مذمت کی۔[4]

بھاری برطانوی موجودگی نے سیاسی حرکیات کو کنٹرول کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، جس میں قائدین کو بلند کرنے یا دبانے، سفارتی شناخت دینے یا اپنی مرضی سے منسوخ کرنے کی طاقت تھی۔ برطانیہ نے اکثر ان طاقتوں کا فائدہ فلسطینیوں کے اتحاد اور سیاسی نمائندگی کو نقصان پہنچانے کے لیے قریبی وابستگان کے ذریعے کیا، چاہے وہ

[1] محسن صالح، القدیہ الفلستینیہ (فلسطینی مسئلہ)، صفحہ 48

[2] شقیری، ج3، ص750۔

[3] محسن صالح، ص48-49۔

[4] الموسوع الفلستینیہ (فلسطینی انسائیکلوپیڈیا)، حصہ دوم، جلد2، صفحہ 1035

دھوکے میں ہوں یا فعال طور پر شریک ہوں۔ اس حکمت عملی کو قبضے کے پورے عرصے میں بار بار استعمال کیا گیا تاکہ متحد مزاحمت کی کسی بھی علامت کو غیر مستحکم کیا جا سکے۔[1]

مسلح مزاحمت کے حوالے سے، برطانوی حکمرانی میں فلسطینیوں کو درپیش بے پناہ مشکلات کے باوجود، وہ اپنے مشکل حالات میں پوری طاقت کے ساتھ مزاحمت کرتے رہے۔ فلسطینی بغاوتوں کا ایک مستقل سلسلہ ابھرا، جس میں بنیادی طور پر یہودی آبادکاروں کو نشانہ بنایا گیا جبکہ برطانوی افواج کے ساتھ براہ راست جھڑپوں سے گریز کیا گیا۔ اس اسٹریٹجک انتخاب کا مقصد زیادہ طاقتور برطانوی فوج کے ساتھ مشغولیت کو روکنا تھا، اس کی بجائے برطانیہ پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ صیہونیت کے حامی موقف پر نظر ثانی کرے۔

ان بغاوتوں کی اہم مثالوں میں 1920 میں یروشلم میں بدامنی، 1921 میں جافا، 1929 میں براق بغاوت، اور 1933 میں یروشلم اور جافا میں مزید احتجاج شامل ہیں۔ یہ بڑی حد تک اسلامی قیادت میں ہونے والی بغاوتیں تھیں، اور جب کہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان ہلاکتوں کی شرح میں نمایاں فرق تھا، یہودیوں کے ذریعے ایک فرقہ وارانہ قتل عام کیا گیا تھا۔ ابتدائی ہتھیار جیسے لاٹھی اور چاقو، جب کہ عربوں کو بنیادی طور پر انگریزوں نے آتشیں ہتھیاروں کے ذریعے قتل کیا تھا۔[2]

جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، چھوٹی مسلح تحریکیں ابھریں لیکن انہیں تیزی سے دبا دیا گیا اور ختم کر دیا گیا۔ ایک قابل ذکر مثال گرین ہینڈ تحریک ہے، جس کی قیادت احمد تفیش نے کی تھی، جو براق بغاوت کے دوران قائم ہوئی تھی لیکن فروری 1930 میں تفیش کی گرفتاری کے ساتھ ختم ہوئی تھی[3]۔ ایک مروجہ جذبات ابھرے کہ انگریز اس کی بنیادی وجہ تھے، یہودیوں کی موجودگی کو درخت کے سائے کی طرح ثانوی اثر کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو درخت

---

[1] دیکھئے خالدی ص 98

[2] ابو غربیہ، ص 13 ایف۔ محسن صالح، صفحہ 46

[3] صالح، ص 50۔

کو کاٹ دینے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر نے 1930 اور 1935 کے درمیان کرشن حاصل کیا، یہ ایک ایسا دور تھا جس کی خصوصیت یہودیوں کی امیگریشن میں اضافہ اور عسکریت پسندی میں اضافہ تھا۔'

مزاحمت کی یہ ابتدائی چنگاریاں اس وقت ختم ہوئیں جو شیخ عزالدین القسام کی قیادت میں اپنے دور کی سب سے بڑی بغاوت بن گئی۔ 1935 میں، القسام نے فلسطینی رہنماؤں سے برطانویوں کے خلاف بغاوت شروع کرنے کے بارے میں مشورہ کیا، لیکن انہوں نے خبردار کیا کہ عوام ابھی تیار نہیں ہے، وقت خراب ہے، اور بات چیت اور گفت و شنید کے ذریعے حقوق کے حصول کی امید باقی ہے[1]۔ بے خوف ہو کر، القسام نے بغاوت کو آگے بڑھایا، بالآخر 20 نومبر 1935 کو برطانوی افواج کے ساتھ ابتدائی جھڑپ کے دوران اپنے پہلے شہیدوں میں سے ایک بن گیا۔

القسام کی تنظیم کے ارکان کی صحیح تعداد ابھی تک نامعلوم ہے، اندازے کے مطابق ان کی تعداد 200 سے 800 تک ہے۔

اسی طرح، گروپ کی صحیح تاریخ سازی غیر واضح ہے کہ خفیہ مزاحمتی تحریکوں کو دستاویزی شکل دینے میں ایک مشترکہ چیلنج ہے، خاص طور پر جب ان کے ابتدائی رہنما شہید ہو جائیں۔ تاہم، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ 1925 اور 1930 کے درمیان قائم ہوا تھا۔ بنیادی طور پر شمالی فلسطین میں کام کرتے ہوئے، جہاں یہودی آبادیاں پھیل رہی تھیں، اس گروپ نے یہودی آبادکاروں، انگریزوں اور ان کے جاسوسوں اور ساتھیوں کو نشانہ بنایا۔ تنظیم نے ایک وکندریقرت، سیل پر مبنی ڈھانچے کی پیروی کی، جہاں ہر رکن اپنے چھوٹے یونٹ کے صرف چار اراکین کو جانتا تھا۔ القسام کی شہادت کے بعد قیادت فرحان السعدی کو سونپی گئی[2]۔

[1] فتح الشقاقی، ج1، ص186-87۔

[2] محسن صالح، ص51۔

بغاوت شروع کرنے کا فیصلہ حیفہ میں اس دریافت سے تیز ہوا کہ یہودیوں کی دکانوں پر پہنچنے والے ڈبوں میں سامان یا کپڑے نہیں تھے، بلکہ اسلحہ اور گولہ بارود تھا۔[1] القسام کی تحریک پر مذہبی شخصیات تیزی سے غلبہ حاصل کرنے لگیں، اور چالیس کلیدی ارکان میں سے چھتیس نے "شیخ" کا خطاب حاصل کیا[2]۔ القسام کو کسی عرب حکومت کی طرف سے کوئی حمایت نہیں ملی، اور اس کی موت کی وجہ برطانوی حکام کے ساتھ عرب تعاون کاروں کی ملی بھگت سے منسوب ہے۔[3] یہاں تک کہ فلسطینی معاشرے کے سرکردہ رہنما، جنہوں نے "قابل قبول قوم پرستی" کے ماڈل کو مجسم کیا، اپنی املاک کے خلاف برطانوی انتقامی کارروائی کے خوف سے شہید کے جنازے میں شرکت سے گریز کیا[4]۔

جروشلم میں، عبد القادر الحسینی کی قیادت میں ایک اور مسلح گروہ ابھرا، جسے "مقدس جہاد" کہا جاتا ہے، جسے سیاسی رہنما حاج امین الحسینی کی حمایت حاصل تھی۔ 1935 تک، اس گروپ کے تقریباً 400 ارکان تھے۔[5]

القسام کی شہادت نے برطانوی قبضے کے تحت فلسطینی تاریخ کی سب سے بڑی بغاوت کو جنم دیا، جسے فلسطینی انقلاب یا عظیم فلسطینی انقلاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ بغاوت القسام کے پیروکاروں کی طرف سے فرحان السعدی کی قیادت میں کی گئی ایک کارروائی سے شروع ہوئی تھی، جس میں 15 اپریل 1936 کو دو یہودی مارے گئے تھے۔ اس نے انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں 20 اپریل 1936 کو فلسطینیوں کی طرف سے عام ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ یہ ہڑتال چھ ماہ تک جاری رہی، جو انقلاب کی سب سے طویل مدت کے طور پر یاد رکھی جاتی ہے۔ فلسطینی تاریخ میں ہڑتال۔ کچھ محققین اسے یہاں تک کہ "ایک پوری قوم کی طرف سے کی جانے والی تاریخ کی سب سے طویل ہڑتال ہے۔[6]

---

1 مصطفٰی الصباء، جہاد فی فلسطین (فلسطین میں ہماری جدوجہد)، صفحہ 6؛ ابو غربیہ، صفحہ 43-44

2 فتح شکقی، جلد.1، 182

3 صلاح خلاف، p.64

4 فتح شقاقی، ج1، ص178، 189۔

5 محسن صالح، ص51

6 Ibid., p.52.

اگرچہ القسام اپنی کوششوں کے نتائج کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے، لیکن فلسطین نے ان کی شہادت کے بعد ان کا ادراک دیکھا۔ القسام کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد انقلاب سے ابھرنے والے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ، علاقائی اور قبائلی شخصیات کے ساتھ ساتھ ہنرمند افراد کے ساتھ ساتھ عظیم انقلاب کی اہم شخصیات بن گئے۔ انہوں نے مل کر بغاوت کی فوجی ریڑھ کی ہڈی بنائی۔

سیاسی محاذ پر، قیادت نے بغاوت کے ابتدائی دنوں میں تیزی سے شکل اختیار کی۔ 25 اپریل 1936 کو فلسطینی عرب سیاسی دھڑے حج امین الحسینی کی قیادت میں "اعلیٰ عرب کمیٹی" کے تحت متحد ہو گئے۔ کمیٹی نے عام ہڑتال کے تین بنیادی مطالبات پیش کئے

1. فلسطینی حکومت کا قیام ایک منتخب پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے۔
2. یہودیوں کی نقل مکانی کا خاتمہ
3. یہودیوں کو زمینوں کی فروخت کا خاتمہ

آیئے سب سے پہلے انقلاب کے سیاسی راستے پر توجہ دیں، پھر اس کی عسکری اور میدانی پیشرفت کو دیکھیں۔ برطانیہ اس اچانک پیش رفت اور انقلاب کے بڑے پیمانے پر پھٹنے سے حیران رہ گیا۔ اس کے جواب میں، اس نے فلسطینیوں کو ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کرنے کے لیے تشدد اور سیاسی دباؤ کا سہارا لیا، جو کہ اس کے پھیلاؤ، توسیع اور طویل مدت کی وجہ سے ان کے لیے حیران کن بھی تھا اور اس پر قابو پانا مشکل بھی تھا۔ برطانیہ نے اپنے زیر اثر عرب حکمرانوں کو مداخلت اور ہائیر عرب کمیٹی پر ہڑتال[1] ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کی ہدایت کی، جو بالآخر ہو گئی۔

[1] پیغام میں لکھا گیا ہے، "ہم آپ پر زور دیتے ہیں کہ مزید خونریزی کو روکنے کے لیے امن کی کوشش کریں، اپنے دوست، برطانوی حکومت کے نیک ارادوں پر بھروسہ کریں۔ یقین رکھیں، ہم آپ کی مدد کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔" اس پیغام پر شاہ عبدالعزیز آل سعود (سعودی عرب)، شہزادہ عبداللہ بن حسین (اردن)، شاہ غازی (عراق) اور امام یحییٰ حامد الدین (یمن) نے دستخط کیے، جیسا کہ امین الحسینی کی یادداشتوں، صفحہ 26-27 میں درج ہے۔

برطانیہ نے اس کے جواب میں صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیشن بھیجنے کا وعدہ کیا، جسے پیل کمیشن کہا جاتا ہے۔ دباؤ، ترغیبات، اور برطانیہ کے شدید فوجی اقدامات کے اس مشترکہ انداز نے فلسطینیوں کو ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کیا، اس امید پر کہ عرب اور برطانوی سفارتی حل کے لیے جگہ پیدا ہوگی۔ تاہم، عرب رہنماؤں نے کوئی ٹھوس تعاون پیش نہیں کیا، اور برطانوی کمیشن نے جولائی 1937 میں اپنی رپورٹ جاری کرنے میں پورا ایک سال لگا دیا۔ رپورٹ نے بالآخر فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ فلسطینی لوگوں کو ان کے وطن سے بے گھر اور بے دخل کرنے کی پہلی باضابطہ تجویز کی نشاندہی کی۔

یہ نتیجہ بنیادی طور پر وقت خریدنے اور بغاوت کو پرسکون کرنے کے حربے کے طور پر ظاہر ہوا۔ اگرچہ اس وقت یہودیوں کے پاس صرف پانچ فیصد اراضی تھی، کمیشن نے ان کے لیے شمالی فلسطین کا ایک تہائی حصہ، جنوب میں دو تہائی عربوں کے لیے، اور یروشلم سے حیفہ تک راہداری کو برطانوی زیر انتظام علاقہ قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ یہ سیاسی انتظام، یہودیوں کے لیے برطانوی پالیسی کے ذریعے حاصل ہونے والا ایک نیا فائدہ، ان کے لیے ناکافی تھا، اور جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، وہ وہاں نہیں رکے۔

اس نے فلسطینیوں کے غصے کو ہوا دی اور ان کے انقلاب کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس کے جواب میں، برطانیہ نے اعلیٰ عرب کمیٹی کو تحلیل کر دیا اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا، ان میں سے چار کو سیشلز جلاوطن کر دیا۔ کمیٹی کے رہنما حاج امین الحسینی گرفتاری سے بچنے میں کامیاب ہو گئے اور اکتوبر 1937 میں لبنان فرار ہو گئے، جہاں سے وہ بیرون ملک سے انقلاب کی حمایت اور رہنمائی کرتے رہے[1]۔

انقلاب کی فوجی اور میدانی کارروائیوں نے نہ صرف صیہونیوں اور انگریزوں کو بلکہ ساتھیوں اور جاسوسوں کو بھی نشانہ بنایا۔ کلیدی کارروائیوں میں برطانوی حکومت کے دفاتر اور بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ یہودی بستیوں پر حملے شامل تھے۔ انقلابیوں نے اعلیٰ عہدے داروں کو ختم کرنے اور انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنے والے

[1] امین الحسینی، ص29ف

عرب پولیس افسران پر دباؤ ڈالنے پر بھی توجہ دی۔ سب سے اہم کارروائیوں میں 26 جولائی 1937 کو برطانوی گورنر لیوس اینڈریوز کا قتل تھا، جس کے فوراً بعد پیل کمیشن نے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ بغاوت بڑھتی چلی گئی، 1938 کے موسم گرما میں عروج پر پہنچ گئی، جب باغی تقریباً تمام دیہی فلسطین پر کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہاں تک کہ عارضی طور پر اگرچہ کئی شہروں کو برطانوی کنٹرول سے چھین لیا۔[1]

بہت سی اسلامی مزاحمتی تحریکوں کی طرح، مصر، اردن، لیونٹ اور عراق کے مسلمان رضاکار انقلاب میں شامل ہوئے۔[2] کچھ لوگ قائدانہ عہدوں پر فائز ہوئے، جن میں فوزی القواقجی جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

ہر مقبول بغاوت میں، برطانوی افواج نے مزاحمت کو کچلنے کے لیے شدید بربریت کے ساتھ جواب دیا، جس میں قتل و غارت، قتل عام، اجتماعی گرفتاریاں، جلاوطنی اور مقدمات سمیت وسیع پیمانے پر جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ ان سخت کارروائیوں کو انٹیلی جنس آپریشنز اور سیاسی حکمت عملیوں سے تقویت ملی جس کا مقصد فلسطینی قیادت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور فرقہ وارانہ اور مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر تحریک کو کمزور کرنا تھا۔[3] عظیم فلسطینی بغاوت نے مکمل برطانوی جابرانہ آلات کا خمیازہ اٹھایا۔ ان کا نقطہ نظر منظم تھا: انہوں نے فیلڈ لیڈروں کو قتل کے لیے نشانہ بنایا، سیاسی رہنماؤں کو جلاوطنی کے ذریعے زمینی کارروائیوں سے منقطع کیا یا فلسطین سے فرار کی سہولت فراہم کی، اور شہریوں کو سختی سے غیر مسلح کیا۔ ایک بھی گولی ملنے پر گھروں کو مسمار کر دیا جاتا تھا، اور شہریوں کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، گھات لگانے والوں کو روکنے کے لیے برطانوی گاڑیوں اور ٹرینوں کے مورچوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔[4]

---

[1] Ibid.، pp.38-39; بہجت ابو غربیہ، ص119ف۔ خالدی، ص73۔

[2] حسینی، ص41؛ احمد شقیری، ج3، ص752؛ محمود الصباغ، حق التنزیم الخاص (خصوصی تنظیم کے بارے میں حقیقت)، صفحہ 88

[3] الحسینی، صفحہ 42-43؛ ابو غربیہ، ص18۔

[4] خالدی، ص71 ایف۔

تین سالہ بغاوت کو ختم کرنے کے لیے پر عزم، برطانیہ نے 20,000 فوجیوں کو تعینات کیا، جن کی قیادت چار تجربہ کار جرنیلوں نے کی جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں خدمات انجام دی تھیں۔ 1938 کے آخر اور 1939 کے اوائل تک، برطانیہ نے مؤثر طریقے سے فلسطین پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا، براہ راست فوجی حکمرانی نافذ کرتے ہوئے اور اپنی افواج کو تقویت دیتے ہوئے، ہر 10 سے 10 فوجیوں کو فروخت کیا تھا۔ فلسطینیوں۔ اس زبردست موجودگی نے برطانیہ کی مہم کی شدت کو واضح کیا، خاص طور پر جب سخت گیر صہیونی رہنما زیف جبوتنسکی کے اس دعوے کے برعکس کہ اسرائیل کے قیام کے لیے 50,000 سے کم فوجیوں کی ضرورت نہیں ہو گی۔[1]

انقلاب کے تین سال (1939-1936) میں تقریباً پانچ ہزار فلسطینیوں کی شہادت ہوئی، تقریباً چودہ ہزار زخمی ہوئے،[2] ان کے علاوہ گرفتار، جلاوطن یا بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ کچھ اندازوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نقصانات لڑنے کے قابل بالغ مرد آبادی کے 10٪ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عملی لحاظ سے، اس کا مطلب اس نسل کا خاتمہ تھا جو ایک دہائی بعد صہیونی ملیشیاؤں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ 1930 کی دہائی کے آخر میں فلسطینی انقلاب کو دبانے کے ساتھ ہی نکبہ کو مؤثر طریقے سے حرکت میں لایا گیا تھا۔[3]

فلسطینیوں نے اپنی مزاحمت کے بکھرنے اور بکھر جانے کے باوجود شاندار بہادری کا مظاہرہ کیا۔[4] ان کی پہلی منظم عوامی تحریک نے 1933 کے ایک بڑے مظاہرے میں شکل اختیار کی، جو پھر یروشلم اور جفا کی بغاوتوں میں بدل گئی۔ یہ طویل تاخیر ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور موثر قیادت سے محروم معاشرے کی مشکلات کو واضح کرتی ہے۔ ہندوستان میں گاندھی کی مزاحمت کے مقابلے میں ایک پر امن عوامی تحریک شروع کرنے میں پندرہ سال لگے۔[5]

---

[1] Ibid., p.81.

[2] دیکھیں الحسینی ص 40؛ محسن صالح، ص 54۔

[3] خالدی، صفحہ 21، 70-71۔

[4] صلاۃ خلف، ص 63۔

[5] بہجت ابو غربیہ، ص 37ف۔

اس کے ٹکڑے ہونے کے علاوہ، فلسطینی مزاحمت کو طاقت اور ہتھیاروں میں ایک وسیع عدم توازن کی وجہ سے رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا، جو عالمی سطح پر خاص طور پر برطانویوں کی طرف سے اور عربوں کی دھوکہ دہی کی وجہ سے شامل ہے، بہت سے علاقائی دارالحکومتوں پر قابضین کے ساتھ اتحاد کرنے والے رہنماؤں کے زیر انتظام ہیں۔ یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ برطانوی سلطنت اس وقت دنیا کی غالب طاقت تھی۔

یہاں تک کہ آبادی والے، وسائل سے مالا مال ممالک جیسے ہندوستان، مصر اور عراق نے خود کو برطانوی راج سے آزاد کرانے کے لیے طویل جدوجہد کا سامنا کیا۔ تو پھر فلسطینیوں جیسا چھوٹا، وسائل سے محروم عوام ایسی غیر مساوی جدوجہد میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس کے باوجود فلسطینیوں نے بہادری کے غیر معمولی کارنامے انجام دیے، ایسے نتائج حاصل کیے جنہوں نے وسائل میں بے پناہ تفاوت کو ختم کیا۔ اس لڑائی کو اٹھانے اور اپنی مزاحمت کو برقرار رکھنے کا ان کا فیصلہ ان کی بے مثال جرات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

فلسطینی مزاحمت بیکار نہیں تھی، کیونکہ برطانیہ کے اس مسلسل بغاوت پر ردعمل نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ افق پر دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ، برطانیہ کو فوری طور پر خطے میں استحکام کی ضرورت تھی۔ اس کے نتیجے میں، اس نے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ منسوخ کر دیا، اعلیٰ عرب کمیٹی کے جلاوطن رہنماؤں کو رہا کر دیا، اور عربوں اور یہودیوں کے درمیان مذاکرات کے لیے لندن میں ایک کانفرنس بلائی۔ مئی 1939 میں، برطانیہ نے وائٹ پیپر جاری کیا، جس میں فلسطینیوں کے لیے سب سے زیادہ رعایت کی نمائندگی کی گئی۔ تاہم، اس دستاویز نے یہودی برادری کے ساتھ کشیدگی کو ہوا دی، کیونکہ اس نے یہودیوں کی امیگریشن کو 75,000 تک محدود کر دیا اور کچھ علاقوں میں ان پر پابندی لگاتے ہوئے، زمین کی فروخت کو محدود کر دیا۔ اس کے باوجود، برطانیہ نے فلسطینی باغیوں کے لیے عام معافی کو مضبوطی سے روک دیا اور فلسطین کے سیاسی رہنما امین الحسینی کی

واپسی کو روک دیا۔[1] برطانیہ نے ایک کنٹرول شدہ امن کی کوشش کی، احتیاط سے ایسے کسی بھی اقدام سے گریز کیا جو انقلابی جوش کو دوبارہ زندہ کر سکے۔

امین الحسینی فلسطین واپس آنے سے قاصر تھے، لیکن انہوں نے جرمنی میں آباد ہونے سے پہلے لبنان، عراق، ایران اور ترکی سے گزرتے ہوئے ایک مشکل اور واقعاتی سفر کیا۔ وہاں، اس نے اعلان بالفور کا مقابلہ کرنے کے عزم کو حاصل کرنے کی امید میں، جرمنوں، برطانیہ کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی۔ اس کا مقصد ایک معاہدہ تھا جس کے تحت عرب اپنی سرزمین کو آزاد کرانے اور صہیونی منصوبے کو ختم کرنے کے لیے حمایت کے بدلے میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کریں گے۔ یہ معاہدہ درحقیقت باضابطہ تھا اور اس میں عرب افواج کی جرمن تربیت اور انہیں کچھ ہتھیاروں کی فراہمی تک توسیع دی گئی تھی۔[2]

تاہم، دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور اٹلی کی شکست کے ساتھ صورتحال الٹ گئی، فاتحین میں انگریزوں کی پوزیشن تھی۔ مزید برآں، ریاست ہائے متحدہ ایک نئی سپر پاور کے طور پر ابھرا، اس نے جنگ کا اختتام کیا اور ایک سب سے غالب طاقت کے طور پر کھڑا ہوا جس طرح برطانوی، فرانسیسی اور روسیوں کو تھکا دیا گیا تھا۔

اس موڑ پر، برطانیہ نے سرکاری طور پر وائٹ پیپر کو ترک کر دیا، جیسا کہ سیکرٹری خارجہ ارنسٹ بیون نے 14 نومبر 1945 کو اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد یہودی ہجرت کی دو بڑی لہریں آئیں: دوسری جنگ عظیم کے دوران 90,000 سے زیادہ یہودی اور 60,000 اس کے بعد۔ حاج امین الحسینی کی صورت حال دن بدن سنگین ہوتی گئی۔ وہ فرار ہو کر فرانس چلا گیا، جہاں اسے پکڑ لیا گیا لیکن آخر کار فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مصر کی طرف اپنا راستہ بناتے ہوئے، اس نے نکبہ اور اسرائیل کی ریاست کے اعلان تک کے کشیدہ دور میں فلسطینی مزاحمت کے اگلے اہم مرحلے کی قیادت کرنے کی کوشش کی۔

---

[1] الحسینی، ص43ف۔

Ibid., p.73 ff, and p.109 ff.[2]

1948 کا نکبہ اور ریاست اسرائیل کا اعلان

1948 میں، فلسطینیوں نے 94 فیصد علاقے اور فلسطین کی 69 فیصد آبادی کو کنٹرول کرتے ہوئے جنگ میں حصہ لیا۔ تنازعہ کے اختتام تک، اسرائیل نے 78 فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا تھا، اس عمل میں 800,000 فلسطینیوں کو بے گھر کر دیا تھا۔

1948 سے پہلے عرب دنیا کے حالات

پہلی جنگ عظیم کے بعد، عرب ممالک غیر ملکی قابضین کی قائم کردہ کٹھ پتلی حکومتوں کے تحت خود کو مشکل کی حالت میں پایا۔ برائے نام آزادی کے باوجود، خود مختاری کا مادہ غیر محفوظ رہا کیونکہ برطانوی اور فرانسیسی حقیقی طاقت کو برقرار رکھتے تھے۔ فلسطین کے حالات کو سمجھنے کے لیے اردگرد کی عرب اقوام کے حالات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔

مصر

پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک مصر تقریباً چالیس سال تک برطانوی قبضے میں رہا۔ انگریزوں نے محمد علی خاندان کے استحکام کو یقینی بنانے کے لیے مصر کا کنٹرول سنبھال لیا تھا، جس نے مصر میں جدیدیت کو متعارف کرایا تھا بلکہ ملک کو غیر ملکی استحصال کے وسائل میں بھی تبدیل کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران، انگریزوں نے مصری عوام کو مطمئن کرنے اور وقت حاصل کرنے کے لیے مختلف وعدے کیے، جن میں سے ایک وعدہ بالآخر مصر سے دستبرداری کا تھا۔

جب انگریزوں نے انخلاء میں تاخیر کی اور سیاسی رہنما مؤثر طریقے سے کام کرنے میں ناکام رہے تو 1919 میں ایک زبردست مصری انقلاب برپا ہوا، جس نے مصر میں برطانوی حکومت کی بنیادیں تقریباً ہلا کر رکھ دیں۔ اس کے جواب میں، انگریزوں نے اپنی وفادار قیادت تشکیل دے کر انقلاب کو پھیلانے کی کوشش کی، جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ سعد زغلول، برطانوی مفادات کے ساتھ قریبی تعلق رکھنے والی شخصیت، انقلاب کے رہنما کے

طور پر ابھری۔ تاہم، عوامی بغاوت کو برقرار رکھنے کے بجائے، اس نے اسے مذاکرات کی طرف موڑ دیا، جس کا نتیجہ آزادی کی علامتی شکل میں نکلا۔ ایک نیا آئین نافذ کیا گیا، بادشاہ کو کافی اختیارات دیے گئے، اور محدود اختیارات کے ساتھ پارلیمنٹ قائم کی گئی۔ 1923 کے آغاز سے، مصر میں داخل ہوا جسے "لبرل دور" کے نام سے جانا جاتا تھا، لیکن حقیقی طاقت مضبوطی سے برطانوی ہاتھوں میں رہی۔ ان کے مغرب زدہ حامیوں نے پریس اور میڈیا کو کنٹرول کیا، سیاسی جماعتوں کی قیادت کی، اور آزادی کے لیے پرامن جدوجہد میں مصروف رہے، ایسی آزادی جو وہ مزید تین دہائیوں تک حاصل نہیں کر پائیں گے۔

اس عرصے کے دوران، قومی ریاست کا تصور مضبوط ہوا، خاص طور پر سیکولر مصری قوم پرستی کی شکل میں۔ مصری سیاست دانوں نے بڑی حد تک فلسطینی کاز کو نظر انداز کیا۔[1] در حقیقت، مصر ایک اہم یہودی کمیونٹی کا گھر تھا، جس میں صیہونی یہودی پریس کے ساتھ ساتھ اسرائیل، الشمس (دی سن) اور الاتحاد الاسرائیلی (اسرائیلی یونین) جیسی اشاعتیں بھی شامل تھیں، جو صیہونیت کی کھل کر حمایت کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ غیر صہیونی میڈیا بھی اکثر صہیونی نقطہ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ بہت سے مصری سیاست دانوں نے، ان حرکیات کو نیویگیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، عوامی طور پر یہودیوں کے حقوق کے لیے ہمدردی کا اظہار کیا اور فلسطینی مزاحمت کی مذمت کی، اسے مذہبی عدم برداشت اور نظریاتی انتہا پسندی قرار دیا۔ نتیجے کے طور پر، فلسطین کا مسئلہ مصر کی سیاسی اشرافیہ کے درمیان انتہائی منقسم ہو گیا، جس کی رائے غیر فعال بے حسی سے لے کر صریح نظر انداز تک تھی، اکثر سیاسی گفتگو میں وجہ کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔[2]

مصری حکام اور اشرافیہ نے متعدد مواقع پر فلسطینیوں اور ان کے ہمدردوں کو فعال طور پر حراست میں لیتے ہوئے صیہونی مفادات کی کھلی حمایت کی پیشکش کی۔ مثال کے طور پر ان کے دورہ مصر کے دوران اعلان بالفور کے خلاف احتجاج کرنے والے فلسطینیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ 1929 کی البراق بغاوت کے دوران، وزیر اعظم محمد محمود کی

---

[1] طارق البشری، الحرکتہ السیاسیہ فی مصر (مصر میں سیاسی زندگی)، صفحہ 316

[2] Ibid.، p.317 ff. اس کے علاوہ اواطف عبدالرحمن، مصر و فلسطین (مصر و فلسطین)، ص154 ایف۔

قیادت میں مصری حکومت نے مخالفانہ موقف اپنایا۔ ریاستی اخبار السیاسہ نے یہاں تک کہ فرقہ وارانہ فسادات اور عوامی بدامنی کو ہوا دینے کے الزامات کا حوالہ دیتے ہوئے فلسطینیوں کو ملک بدری کی دھمکی دی[1] درحقیقت، عبدالقادر الحسینی سمیت متعدد فلسطینیوں کو بالآخر بے دخل کر دیا گیا[2]۔ 1930 میں وزیر اعظم اسماعیل صدیقی کے دور میں حکومت نے فلسطینی اخبار الشوری کو بند کر دیا[3]۔ اسی وقت، محل سے منسلک اخبار، السرائے نے فلسطین میں یہودیوں کے وطن کے خیال کی کھل کر حمایت کی، اور دعویٰ کیا کہ یہودیوں کی نقل مکانی سے قیمتی مہارت اور سرمایہ ملے گا، جو صیہونی دلائل کی مکمل توثیق کرتا ہے۔ اخبار نے مزید الزام لگایا کہ یہاں تک کہ "شدت پسند" بھی اس حل کو قبول کرنا شروع کر رہے ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلسطینی یہودیوں کی موجودگی کو زیادہ قبول کر رہے ہیں۔[4]

وزیر اعظم احمد زیور کے دور میں مصری حکومت نے مصری یونیورسٹی کے صدر احمد لطفی السید کو عبرانی یونیورسٹی کے افتتاح کے لیے اپنے سرکاری نمائندے کے طور پر بھیجا تھا[5]۔ طہٰ حسین نے مبارکباد کا ٹیلی گرام بھی بھیجا اور بعد میں عبرانی یونیورسٹی اور برطانوی گورنر کی دعوت پر جروشلم کا دورہ کیا[6]۔ حسین نے یہاں تک کہ عبرانی یونیورسٹی میں مصری طالب علم کے اندراج کی سہولت کے لیے قواعد وضوابط کے ارد گرد طریقے تلاش کر لیے[7]۔ اس وقت، طہٰ حسین مصری شناخت کے لیے ایک ممتاز وکیل تھے جو اس کے فرعونی ورثے میں جڑی ہوئی تھی۔[8]

---

[1] طارق البشری، ص316۔

[2] الموسوع الفلسطینیہ، جلد 3/168۔

[3] طارق البشری، ص316۔

[4] اوطیف عبدالرحمٰن، ص92۔

[5] Ibid

[6] سوزان طہٰ حسین، ماک (آپ کے ساتھ!)، صفحہ 80۔

[7] Ibid., p.153

[8] شقیری، ج3، ص755 ایف

وزیر اعظم اسماعیل صدیقی کی قیادت میں، مصری حکومت نے 1932 کے موسم بہار میں تل ابیب صہیونی ایکسپو میں حصہ لیا[1]۔ Khedive Abbas Hilmi II نے اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے، بعض رہنماؤں کے ساتھ اپنے اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فلسطینیوں کو یہودیوں کے ساتھ مفاہمت کی طرف راغب کرنے کے لیے، یہاں تک کہ یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی زمین چھوڑ کر دریائے اردن کے مشرق میں منتقل ہو جائیں۔ 1936 کی بڑی فلسطینی ہڑتال کے دوران، وزیر اعظم مصطفیٰ النحاس کی قیادت میں مصری حکومت نے ہڑتال کی وجہ سے پیدا ہونے والی مزدوری کی کمی کو پورا کرنے کے لیے سینکڑوں مصری کارکنوں کو فلسطین کا سفر کرنے کی اجازت دی۔ دورہ یورپ کے دوران جب مصری وزیر اعظم محمد محمود پاشا سے مسئلہ فلسطین کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں مصر کا وزیر اعظم ہوں، فلسطین کا وزیر اعظم نہیں۔

مصر میں، متعدد کتابوں نے یہودی لوگوں کی تعریف کی اور فلسطین میں ان کی واپسی کے خیال کو فروغ دیا۔ 4 کچھ اشاعتیں مصری بادشاہ اور حکومت سے یہودی ریاست کے قیام کی حمایت کرنے اور "اس مظلوم یہودی لوگوں کی نجات" میں مدد کرنے کے لیے زور دیتی ہیں۔ مصنفین کو گمنام طور پر شائع کرنا پڑتا تھا، خفیہ طور پر تقسیم کرنا پڑتا تھا، اور تعزیری کارروائی کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا۔

یہاں مقصد فلسطینی کاز پر مصری حکومت کے مؤقف کا جائزہ لینا یا اس کے متضاد نقطہ نظر کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ اس بات کو اجاگر کرنا ہے کہ یہ کبھی بھی سخت اصولی موقف نہیں تھا۔ نقطہ نظر مختلف تھا اور مفادات کی تبدیلی سے متاثر تھا، ایک ہی اداکار اکثر ذاتی ایجنڈوں، اسٹریٹجک حسابات، یا انٹرا ایلیٹ دشمنیوں کی بنیاد پر اپنی پوزیشن کو ایڈجسٹ کرتے تھے۔ پولیس فورس، فوجی طاقت، اور اقتصادی وسائل موثر برطانوی کنٹرول میں تھے۔ اگرچہ

[1] اوطیف عبدالرحمٰن، ص92۔

مصری عوام ہمدرد، حمایتی، اور فلسطین کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار تھے، لیکن ان کے اقدامات برطانوی حکام تک محدود تھے۔ اس کے نتیجے میں مصر عرب دنیا میں صیہونی پروپیگنڈے کا ایک اہم مرکز بن گیا۔[1]

جاردن

پہلی جنگ عظیم کے بعد، عراق اور لیونٹ میں پھیلی ہوئی عرب خلافت کے شریف حسین کے عزائم ناکام ہو گئے، کیونکہ برطانوی وعدے پورے نہیں ہوئے۔ اس کی زندگی قبرص میں جلاوطنی میں ختم ہوئی، اس کی بادشاہی اور لقب چھین لیا گیا، باوجود اس کے کہ وہ کبھی حجاز کے شریف تھے اور اپنی افواج کو برطانوی مفادات کے لیے وقف کر چکے تھے۔

ان کے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ کو انگریزوں نے دریائے اردن کے مشرق میں صحرا کا ایک بنجر ٹکڑا دیا تھا، جس نے ایک سیاسی وجود کو کسی حد تک عجیب و غریب طور پر "Emirate of Transjordan" کا نام دیا تھا۔ یہ خطہ، جو بعد میں 1947 میں اردن کی ہاشمی سلطنت میں تبدیل ہوا، اس میں وسائل، بنیادی ڈھانچے، اور یہاں تک کہ ایک اہم شہر کا فقدان تھا۔ اپنے آغاز میں، امارت ایک فعال ریاست ہونے سے بہت دور تھی، ایک بادشاہی سے بہت کم تھی۔

عبداللہ کو اپنے والد سے انگریزوں کے ساتھ گہری وفاداری وراثت میں ملی، جو ان کے سب سے قابل اعتماد اور تعمیل کرنے والے اتحادی بن گئے۔ ان کے ساتھ ان کے تعلقات کو اکثر "غیر معمولی قریبی اور بے مثال" کے طور پر بیان کیا جاتا تھا۔ برطانوی افسروں کی قیادت میں اس فوج کا مقصد قبائلی ارکان کو بطور سپاہی بھرتی کرنا تھا جو کہ ایک قومی فوج سے مشابہت رکھتا تھا، جس کی قیادت ممتاز برطانوی کمانڈر گلوب پاشا کر رہے تھے۔

عبداللہ اُس معمولی، بنجر علاقے سے مطمئن نہیں تھا جو اُسے دیا گیا تھا جو کہ خاطر خواہ وسائل سے خالی تھا۔ جب کہ برطانیہ نے عراق اس کے چھوٹے بھائی فیصل کو دے دیا تھا، حجاز اس خاندان کے ہاتھ سے پھسل گیا جب ابن سعود

[1] عاطف عبدالرحمن، صفحہ 8، 18-19۔

نے برطانوی رضامندی کے ساتھ اس پر قبضہ کر لیا، کیونکہ انہوں نے شریف حسین اور ان کے بیٹوں سے اپنی حمایت واپس لے لی تھی۔ شمال میں، شام فرانس کے کنٹرول میں تھا۔ چاروں طرف سے کام کرتے ہوئے، عبداللہ نے اپنے عزائم کا رخ فلسطین کی طرف موڑ دیا، اور اسے شام یا عراق میں مزید توسیع کے لیے ایک قدم کے طور پر تصور کیا۔ اس نے فلسطین کو ایک ایسے خطہ کے طور پر دیکھا جس کی کوئی رسمی حکومت نہیں تھی، جس نے اسے اپنی امارت میں ایک قابل فہم اضافہ بنایا۔

اس کی خواہشات نے 1946 میں زور پکڑا، جب اس نے برائے نام آزادی حاصل کی، حالانکہ اس کی فوج کی فنڈنگ اب بھی برطانیہ پر منحصر تھی، کیونکہ امارات کے وسائل اسے برقرار رکھنے کے لیے ناکافی تھے۔ حقیقی طاقت کا فقدان اور برطانوی مفادات کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے، عبداللہ نے ان کا سب سے وفادار اتحادی بننے کا عزم کیا، اس امید پر کہ وہ بالآخر فلسطین میں اس کے عزائم کی حمایت کریں گے۔ کچھ رپورٹس سے پتہ چلتا ہے کہ جب اسے برطانیہ کے فلسطین سے دستبرداری کے ارادے کا علم ہوا تو وہ ان کی حمایت کھونے کے بارے میں خوفزدہ ہو گیا، اس حد تک کہ وہ دستبرداری کو کسی غیر ملکی طاقت پر مکمل طور پر انحصار کرنے والے کے رویے کی خصوصیت سمجھے۔

اپنی تیس سالہ حکمرانی (1921-1951) کے دوران، عبداللہ کا برطانوی مفادات، اور یہاں تک کہ صہیونی مقاصد کے ساتھ گہرا تعلق نمایاں تھا۔ وہ اکثر اس طرح کام کرتا تھا جیسے وہ انگریزوں کی طرف سے مقرر کردہ ایک وفادار نوآبادیاتی منتظم ہوں۔ اس کا تعاون ممتاز صہیونی رہنماؤں جیسے بین گوریون، گولڈا میر، اور موشے دیان کے ساتھ ملاقاتوں اور انتظامات تک پھیلا ہوا ہے، جو فلسطین پر صیہونی قبضے کو آسان بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ واحد عرب رہنما تھے جنہوں نے فلسطین کے لیے اقوام متحدہ کی تقسیم کے منصوبے کی توثیق کی، کیوں کہ برطانیہ نے انہیں یقین دلایا کہ عربوں کے نامزد کردہ علاقے ان کے کنٹرول میں آ جائیں گے۔

سائرئیہ

ابتدا میں انگریزوں نے فیصل بن حسین کو دمشق کا حکمران بنادیا۔ تاہم، سائیکس پیکوٹ معاہدے میں فرانسیسیوں سے کیے گئے وعدوں سے ان کے انخلا کے نتیجے میں شام پر فرانسیسی حملہ ہوا، جس کے نتیجے میں فیصل کو معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اسے عراق کا بادشاہ مقرر کیا۔ شام 1920 سے 1946 میں اپنی آزادی تک فرانسیسی قبضے میں رہا، حالانکہ اس نے 1936 میں شروع ہونے والی فرانسیسی نگرانی میں خود مختاری کی سطح حاصل کی، جو 1922 کے بعد مصر کے انتظام کی طرح تھی۔ دوسری جنگ عظیم کی آمد کے ساتھ، امریکی اثر ورسوخ نے پرانی یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کو گرانا شروع کر دیا، جس سے فرانس پر دباؤ پڑا کہ وہ اپنی نوآبادیاتی گرفت کو ختم کرے کیونکہ امریکہ نے خطے میں اثر ورسوخ کا ایک نیا نمونہ تیار کیا۔

شام اور اردن کی حکومتوں کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی۔ اردن کے بادشاہ نے شام کو ضم کرنے کی خواہش ظاہر کی، جو اس کے والد کے نامکمل خواب سے متاثر تھا– یا اس کے بجائے، اس خواب کے اپنے انتھک تعاقب سے– ایک عظیم عرب ریاست جس میں لیونٹ، عراق اور جزیرہ نما عرب شامل ہیں۔ دریں اثنا، نئی آزاد شامی حکومت ، اگرچہ اس کی آزادی بڑی حد تک برائے نام اور محدود تھی، نے بادشاہت کو مسترد کر دیا اور اس کا مقصد ایک شہری، جمہوری جمہوریہ قائم کرنا تھا۔ شام کے نقطہ نظر سے، اردن ایک ایسا علاقہ تھا جسے غیر منصفانہ طور پر اس کے دائرہ اختیار سے الگ کر دیا گیا تھا، اور بہت سے شامیوں کا خیال تھا کہ اسے شام کے ساتھ دوبارہ ملا دیا جانا چاہیے۔ مزید برآں، دھوکہ دہی کے لیے عبداللہ کی بدنام ساکھ نے اسے ناقابل قبول بنا دیا، یہاں تک کہ ان شامیوں کے لیے بھی جنہوں نے بصورت دیگر بادشاہت کے تصور کو تفریح فراہم کی ہو گی۔[1]

جیسے جیسے فلسطین میں حالات بگڑتے گئے اور واقعات فوجوں کی تعیناتی کی طرف بڑھتے گئے، عبداللہ کے ذہن میں یہ تشویش بڑھ گئی کہ سعودی اور شامی افواج اردن پر حملہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کے موقع سے فائدہ

[1] دیکھیں دی میموئیر آف عادل ارسلان، جلد 2، صفحہ 849۔

اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں، اس نے عراق کا رخ کیا، جس پر اس کے ہاشمی رشتہ داروں کی حکومت تھی، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی مدد حاصل کرنے کے لیے جسے وہ ایک منتشر سازش کے طور پر سمجھتا تھا۔ اس وقت عرب ریاستیں دو کیمپوں میں بٹی ہوئی تھیں: ایک طرف مصر، سعودی عرب اور شام اور دوسری طرف عراق اور اردن۔[1] تاہم، ان سب کی نگرانی برطانیہ کر رہا تھا، جس نے سوائے شام کے، جس کی حکومت نے نسبتاً زیادہ آزادی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے باوجود عبداللہ کو خدشہ تھا کہ برطانوی پالیسی سے کوئی انحراف اس کی سلطنت پر برطانوی قبضے کا سبب بن سکتا ہے۔

یہ نام نہاد "فرنٹ لائن ریاستوں" کی حالت تھی، جن کے اقدامات نے صیہونی موجودگی کو مستحکم کرنے، فلسطینی مزاحمت کو کمزور کرنے اور فلسطینی ریاست کے حق سے انکار میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ صہیونی ریاست ان عرب حکومتوں کی ملی بھگت کے بغیر نہ تو قائم ہو سکتی تھی اور نہ ہی مستحکم ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ ہم مزید جائزہ لیں گے، 1948 کی جنگ کے دوران ان ریاستوں کے اقدامات نے صہیونی ریاست کے تسلط کو آسان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

"فرنٹ لائن ریاستوں" کے پیچھے باقی عرب دنیا کی صورتحال بھی اتنی ہی سنگین تھی۔ عراق میں، ہاشمی خاندان کی دوسری شاخ، فیصل بن حسین، جسے فرانسیسیوں نے شام سے نکال دیا تھا، برطانوی تسلط کے سائے میں حکومت کرتا تھا۔ 1920 کی بغاوت کو دبانے کے بعد، انگریزوں نے فیصل کو بادشاہ کے طور پر مقرر کیا جب 1920 کے انقلاب کے بعد عراق کو برائے نام آزادی مل گئی۔ یہ انتظام 1919 کے انقلاب کے بعد مصر میں برطانیہ کے اقدامات کی بازگشت ہے۔ عراق میں ہاشمی حکومت کو آزادی کے لیے متعدد کوششوں کا سامنا کرنا پڑا، سبھی برطانوی مداخلت سے ناکام ہو گئے، جیسے کہ راشد علی الکلانی کی 1941 میں بغاوت۔ بالآخر، 1958 میں ایک فوجی بغاوت نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور عراق میں ایک فوجی جمہوریہ قائم کیا۔ یہاں تک کہ اگر یہ حکمران فلسطین کی حمایت کرنا چاہتے تھے تو ایک تصور جو بذات خود قابل اعتراض ہے ان کے اختیارات محدود تھے۔ قابل ذکر

[1] فوزی القوقجی کی یادداشت، صفحہ 333

بات یہ ہے کہ شاہ فیصل نے خود چیم ویزمین کے ساتھ ایک معاہدے میں حصہ لیا تھا، جس میں "عظیم عرب ریاست" کے حصے کے طور پر ایک یہودی ریاست کے قیام کی توثیق کی گئی تھی، برطانیہ نے شریف حسین سے وعدہ کیا تھا کہ بعد میں دھوکہ دیا گیا۔

سعودی عرب میں، عبدالعزیز آل سعود نے برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے ساتھ حکومت کی جو ہاشمیوں کے حریف یا اس سے بھی آگے نکل گئے۔ یہ انگریز ہی تھے جنہوں نے اپنی سلطنت کی سرحدیں کھینچیں اور بعد میں اخوان تحریک کو دبانے میں اس کی مدد کی جب اس نے ان کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی دھمکی دی۔ یہاں تک کہ اگر عبدالعزیز نے فلسطین کی مدد کرنے کی خواہش کی تھی، اس کی صلاحیت محدود تھی۔ اس نے ایک وسیع، کم آبادی والے علاقے پر حکومت کی جس میں اہم وسائل نہیں تھے - یہ تیل کی دریافت اور استحصال سے پہلے کی بات ہے، جس کا انتظام برطانوی اور امریکی کمپنیاں کرتے تھے۔

اس کے علاوہ، باقی عرب دنیا، بشمول چھوٹی خلیجی بادشاہتیں اور شمالی افریقی ریاستیں، اسی طرح نوآبادیاتی کنٹرول میں تھیں۔ جب کہ ان کی آبادی فلسطین کے ساتھ گہری ہمدردی اور یکجہتی سے متاثر ہوئی تھی، لیکن ان کے محدود وسائل کی وجہ سے وہ اپنی آزادی حاصل کرنے سے قاصر تھے، فلسطین کو نشانہ بنانے کی سازش کا مقابلہ کرنے دیں۔

ان تمام ممالک میں حکومتیں بہترین طور پر کمزور اور بے اثر اور اپنے نوآبادیاتی حکمرانوں کے تابع تھیں۔ وہ صرف ان طاقتوں پر انحصار اور وفاداری کے درجے میں مختلف تھے۔

فلسطین کی تقسیم

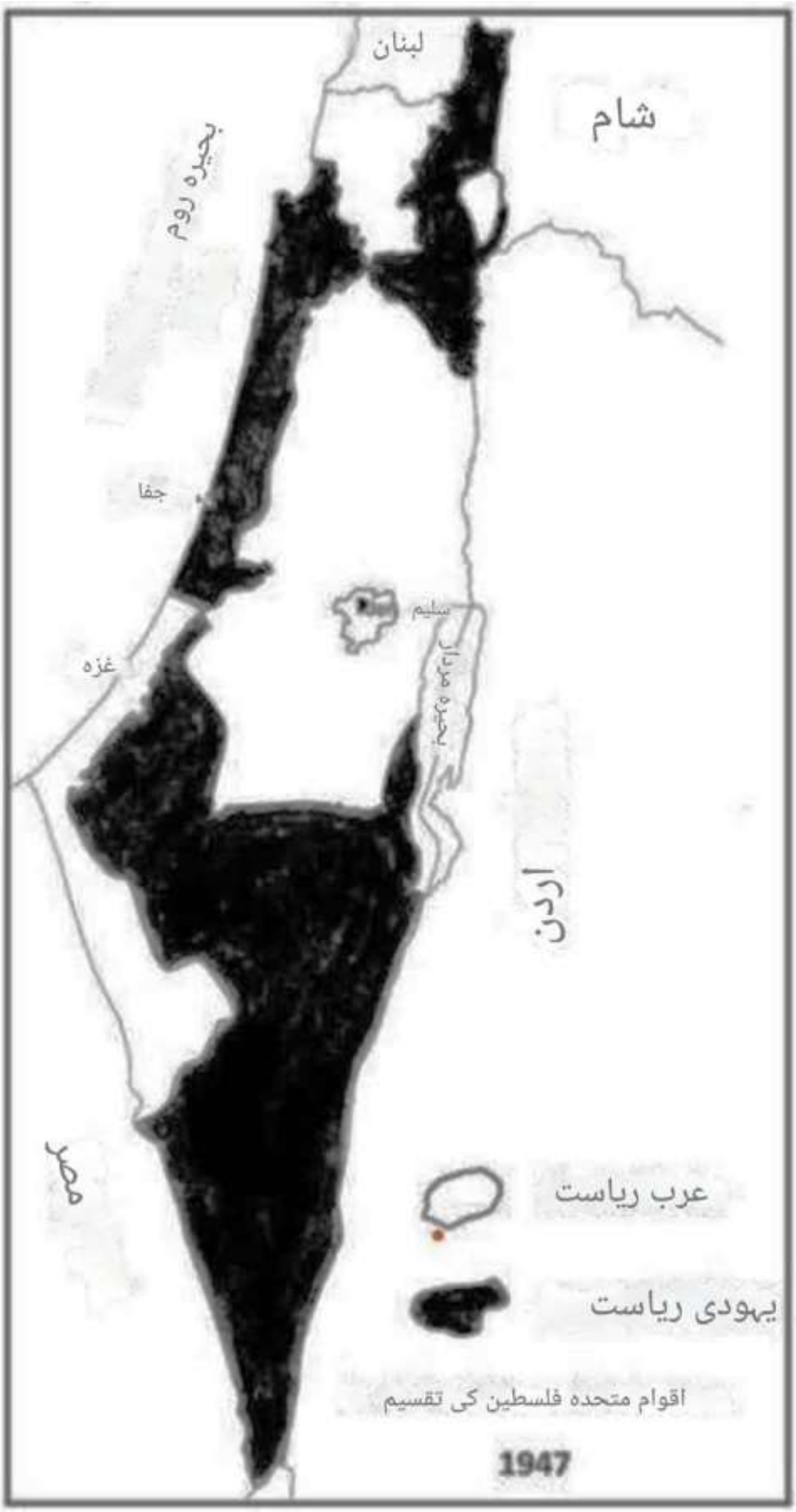
برطانیہ دوسری جنگ عظیم سے تباہ و برباد ہو کر ابھرا۔ جیسا کہ اس کا اثر و رسوخ کم ہوتا گیا، صیہونی تحریک نے اپنی کوششیں امریکہ میں نئی عالمی سپر پاور کے ساتھ صف بندی کی طرف موڑ دیں۔ اسی وقت، فلسطین میں صیہونی ملیشیاؤں نے برطانویوں کے خلاف ایک مہم شروع کی، اپنے آپ کو آزادی کی تحریک کے طور پر ڈھال کر

استعماری قابضین کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی۔ یہ بیانیہ خود ارادیت کے عالمی مباحث کے ساتھ ہم آہنگ ہے، جسے امریکہ اور سوویت یونین کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کی مدد سے حاصل ہوا، جب انہوں نے زوال پذیر برطانوی اور فرانسیسی سلطنتوں کے نوآبادیاتی قبضے کو سنبھالنے کے لیے خود کو پوزیشن میں لے لیا۔

سامراج کا امریکی ماڈل جدید تھا، براہ راست فوجی قبضے کے بجائے اثر و رسوخ اور مؤکل حکومتوں کے ذریعے بالواسطہ کنٹرول کے حق میں تھا۔ صہیونی تحریک نے مہارت کے ساتھ اس نقطہ نظر کو اپنایا اور برطانویوں کو فلسطین سے نکالنے کے لیے امریکی اثرورسوخ کے ایک آلے کے طور پر کام کیا۔ آزادی کی جدوجہد کا روپ دھار کر، اس نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کی مخالفت کرتے ہوئے عالمی ہمدردی کا فائدہ اٹھایا[1]۔ 1944 میں اٹلانٹا میں صہیونی کانگریس میں، تحریک نے رسمی طور پر فلسطین سے برطانوی افواج کے انخلاء کا مطالبہ کیا اور یہودی برادری کے لیے بین الاقوامی تحفظ کا مطالبہ کیا۔

صیہونیوں نے برطانوی افواج کے خلاف ایک حسابی گوریلا مہم کے ذریعے اپنی کوششیں تیز کر دیں، بم دھماکوں، قتل و غارت گری اور اغوا کی وارداتوں میں نمایاں اثر ڈالا۔ 1946 اور 1947 کے درمیان، برطانوی ہلاکتوں کی تعداد 169 تک پہنچ گئی۔ برطانوی مینڈیٹ کے اختتام تک صیہونی ملیشیا نے برطانوی اہداف کے خلاف 500 سے زائد کارروائیاں کی .

[1] المسیری، رحلت الفکریہ، ص 493؛ خالدی، صفحہ 29۔


لبنان
شام
بحیرہ روم
جفا
سلیم
غزہ
بحیرہ مردار
اردن
مصر
عرب ریاست
یہودی ریاست
اقوام متحدہ فلسطین کی تقسیم
1947

یہ خاص طور پر ستم ظریفی کی بات تھی کہ ونسٹن چرچل، جنہوں نے ابتدائی یہودی ملیشیا کو تربیت دینے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، عوامی طور پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا اور اقوام متحدہ میں انتباہ جاری کیا۔ اس کے باوجود، ان انتباہات کو بڑے پیمانے پر خالی بیانات کے طور پر سمجھا جاتا تھا جو معنی خیز کارروائی یا نتائج سے عاری تھیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود برطانیہ نے صیہونیوں کے خلاف کوئی قابل ذکر کارروائی کرنے سے گریز کرتے ہوئے بڑی حد تک خاموشی اختیار کی۔ اس وقت تک صیہونی تحریک نے امریکہ کا تحفظ حاصل کر لیا تھا۔ مزید یہ کہ فلسطین میں تعینات برطانوی پولیس اور فوجی دستوں کے بہت سے ارکان خود یہودی تھے یا صیہونی مفادات سے وابستہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی، برطانیہ نے فلسطینیوں کی مزاحمت کو دبانا جاری رکھا، اور صرف 1946 کے پہلے نصف میں 300 افراد کو حراست میں لینے کے لیے ہتھیار رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا۔

عالمی سطح پر صہیونی تحریک نے امریکی صدر ہیری ٹرومین کی مہم کی مالی معاونت میں اہم کردار ادا کیا، جو ایک عیسائی صہیونی ہمدرد تھا[1]۔ اپنی فتح کے بعد، ٹرومین نے فلسطین میں 100,000 یہودیوں کی ہجرت کی منظوری دے کر ان کی حمایت کا صلہ دیا۔ امریکہ میں صیہونی تنظیموں نے بھی یہودی کمیونٹیز کو متحرک کیا تاکہ اسرائیل میں فوجی صنعتوں کے قیام کے لیے فنڈز اکٹھے کیے جا سکیں۔ اس نے ہگناہ ملیشیا کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے ہتھیار خود تیار کرنا شروع کر دیں، اپنی پوزیشن کو مزید مضبوط کرتے ہوئے، یہاں تک کہ انگریزوں کے خلاف بھی۔

اس وقت تک، فلسطین کی صورت حال تین واضح حقیقتوں میں بدل چکی تھی:

1. برطانوی قبضہ: تقریباً تین دہائیوں کے کنٹرول کے بعد، برطانیہ امریکہ کی طرف سے انخلا کے لیے دباؤ میں تھا۔ دریں اثنا، اسے فلسطینی اور صیہونی دونوں قوتوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اس کی پوزیشن تیزی سے ناقابل تسخیر ہے۔
2. صیہونی توسیع: فوجی تنظیموں، تعلیمی نظاموں، صنعتی صلاحیتوں، میڈیا نیٹ ورکس، اور تجارتی اداروں کی مضبوطی کے ساتھ یہودی آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔ انہوں نے برطانوی راج سے آزادی کا مطالبہ

[1] ٹرومین کی صیہونیت پر، ریحینا شریف، صفحہ 137 ایف ایف دیکھیں

کیا اور انہیں مضبوط بین الاقوامی حمایت حاصل تھی، خاص طور پر ابھرتی ہوئی عالمی طاقت، امریکہ سے۔ مزید برآں، انہیں پڑوسی عرب حکومتوں کی بالواسطہ حمایت حاصل تھی۔

3. فلسطینی مزاحمت: مقامی فلسطینی آبادی، جو کئی دہائیوں کے جبر اور وسائل کی کمی سے تنگ تھی، برطانوی اور صہیونی قبضوں سے آزادی کی خواہاں تھی۔ تاہم، ان کے پاس مزاحمت کے ذرائع اور بااثر اتحادیوں کی حمایت کا فقدان تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی جدوجہد میں ایک اہم نقصان میں رہ گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد، فاتح طاقتوں نے ایک بین الاقوامی ادارہ (اقوام متحدہ) قائم کیا جس کے ذریعے وہ عالمی امور کی نگرانی کر سکتے تھے، مؤثر طریقے سے عالمی حکومت کے طور پر خدمات انجام دے سکتے تھے۔ اس تنظیم نے پانچ فاتح ممالک امریکہ، سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور چین کو اپنی سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنا کر، ہر ایک کو ویٹو کی طاقت سے خصوصی مراعات عطا کیں۔ اس ویٹو پاور نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اکثریتی اتفاق رائے سے قطع نظر قراردادوں کے نفاذ کو روکنے کی اجازت دی۔ اس طرح اقوام متحدہ عالمی قانون اور عالمی قراردادوں کی آڑ میں اپنے مفادات کا لبادہ اوڑھ کر عالمی تسلط برقرار رکھنے کے لیے فاتحوں کے لیے ایک آلہ بن گئی۔

مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان تنازعہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، دونوں فریقوں نے اس سرزمین پر تاریخی دعوے کا دعویٰ کیا تھا۔ برطانیہ نے اقوام متحدہ میں اپنے مینڈیٹ سے دستبردار ہو کر مئی 1948 تک فلسطین سے انخلا کے اپنے ارادے کا اعلان کیا۔ بین الاقوامی طاقتوں کے لیے اقوام متحدہ کے ذریعے ایک ایسی قرارداد کو آگے بڑھانے کا مرحلہ طے کیا گیا تھا جس نے زمین کو دو گروہوں کے درمیان تقسیم کیا تھا۔ یہ قرارداد، جسے قرارداد 181 کے نام سے جانا جاتا ہے، 1947 میں منظور کیا گیا تھا۔ اس نے فلسطین کا 54.7٪ حصہ یہودیوں کے لیے، 44.8٪ فلسطینیوں کے لیے مختص کیا اور یروشلم اور بیت المقدس کو بین الاقوامی زون قرار دیا[1]۔

[1] فلسطین کی دستاویزات کی فائل، والیم 1، صفحہ 895 ایف ایف میں قرارداد 181 کا متن دیکھیں۔

یہ قرارداد عجیب اور غیر معمولی تھی، کیونکہ اس نے قوموں کو کسی سرزمین کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا، وہ نہ تو اس کی ملکیت رکھتے تھے اور نہ ہی سمجھتے تھے۔ بہت سے ممالک جنہوں نے قرارداد کی حمایت کی، جیسے ہیٹی، فلپائن، گوئٹے مالا اور لائبیریا کا فلسطین سے کوئی تعلق نہیں تھا[1]۔ مزید برآں، قرارداد نے کسی ملک اور اس کے عوام کے مستقبل کا تعین ان سے مشورہ کیے بغیر یا انہیں حق خود ارادیت دیے بغیر کیا۔ اس میں اضافہ کرتے ہوئے، جنرل اسمبلی کی قراردادیں خود اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق بھی غیر پابند ہیں۔

زمین کی تقسیم بھی مکمل طور پر غیر منطقی اور غیر معقول تھی۔ یہودیوں کی کئی سالوں کی ہجرت، زمینوں کی خریداری اور قبضوں کے باوجود، فلسطینیوں کے پاس اب بھی فلسطین کی 90٪ اراضی ہے، جس میں اس کی 80٪ قابل کاشت اراضی بھی شامل ہے۔ پھر، ایک قرارداد میں فلسطینیوں کو صرف 44 فیصد علاقہ کیسے دیا جاسکتا ہے؟

اگر ہم اس قرارداد کو تیار کرنے اور اس کی منظوری کے پیچھے موجود بڑی طاقتوں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ برطانیہ شروع سے ہی اس کا اصل سرپرست اور سرپرست رہا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اب اس کی ذمہ داری سنبھال لی تھی، اس کا سروگیٹ چیمپئن بن گیا تھا۔ جہاں تک سوویت یونین کا تعلق ہے، اس کے لیڈروں کا بخوبی یقین تھا کہ ناجائز ریاست کمیونسٹ نظریہ کو اپنا سکتی ہے اور خطے پر اثر انداز ہونے اور بحیرہ روم تک رسائی کے لیے ان کے گیٹ وے کے طور پر کام کر سکتی ہے۔

جب تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا گیا تو اردن کے شاہ عبد اللہ کے علاوہ عربوں کا سرکاری موقف مسترد تھا۔ مغرب کی طرف اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے عزائم سے متاثر ہو کر، اس نے عربوں کے لیے مختص فلسطین کے حصے کو ضم کرنے کے مقصد سے اس منصوبے کی حمایت کی۔ اس پوزیشن نے برطانوی مفادات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی اور اس منصوبے کو آسان بنانے اور لاگو کرنے میں ان کی فعال شمولیت کا باعث بنی۔

---

1 کچھ ممالک نے ابتدائی طور پر اس قرارداد کی مخالفت کی یا ووٹنگ سے پرہیز کیا، جس سے اس کی منظوری خطرے میں پڑ گئی۔ تاہم، بڑی طاقتوں اور بااثر یہودی تاجروں کے دباؤ اور رشوت ستانی کے تحت ان کا موقف بدل گیا۔ کچھ لیڈروں کی شریک حیات کے لیے ہیرے اور پر تعیش فر کوٹ جیسے شاندار تحائف سیاسی عہدوں کو بدلنے کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ اسی طرح، اقتصادی ترغیبات کے وعدوں یا اقتصادی نتائج کی دھمکیوں نے بھی اسی طرح کے نتائج حاصل کئے۔ درحقیقت، فلسطین اور مسلمانوں کی سرزمین سب کے لیے پیش کی جانے والی دعوت میں سمٹ گئی۔ جو لوگ حصہ چاہتے تھے وہ اس میں پھاڑ دیتے تھے، جب کہ دوسروں نے اپنے شکار کا حصہ ذاتی فائدے کے لیے بیچ دیا تھا۔ (دیکھیں: محسن صالح، دی فلسطین کاز، صفحہ 59-60؛ راجر گاراڈی، دی فاؤنڈنگ متھز، صفحہ 228)۔

ایک اور نقطہ نظر سے، شاہ عبداللہ کا فلسطین کے باقی حصوں پر کنٹرول برطانوی اور صیہونیوں دونوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند منظر نامہ تھا۔ ان کے سب سے وفادار اور تعاون کرنے والے اتحادیوں میں سے ایک کے طور پر، اس نے ان کے ایجنڈوں کے ساتھ ہموار تعاون کو یقینی بنایا۔ تاہم، فلسطینیوں کے لیے اس الحاق کی شدید مخالفت کی گئی، کیونکہ انھوں نے اسے محض برطانوی اثر و رسوخ کے تحت براہ راست برطانوی قبضے سے بالواسطہ کنٹرول میں منتقل ہونے کے طور پر دیکھا۔[1]

تقسیم کے منصوبے کو عربوں کا سرکاری طور پر مسترد کرنا خالی بیانی سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان کے اعلانات ان کے حقیقی ارادوں سے ہم آہنگ نہیں تھے، اور اگر کچھ رہنما مخلص بھی تھے تو بھی ان کے موقف میں عملی ذرائع کا فقدان تھا۔ یہ کمزوری اس حقیقت سے پیدا ہوئی کہ یہ حکومتیں بڑی حد تک برطانوی تسلط کی تابع تھیں اور ان کے پاس صرف برائے نام آزادی تھی۔ مزید برآں، عرب لیگ جس کو عرب کوششوں کو مربوط کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، فطری طور پر کمزور تھی، جو برطانوی مفادات کی خدمت کے لیے قائم کی گئی تھی اور مضبوطی سے برطانوی اثر و رسوخ میں رہی تھی۔

عرب فوجی قوتیں اتنی ہی تیار نہیں تھیں، جن کی تعداد، سازوسامان اور تنظیم کی کمی تھی جو فلسطین پر پہلے سے موجود برطانوی افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار تھی۔ وہ زمین اور اپنے صہیونی مخالفین دونوں کے بارے میں ناکافی انٹیلی جنس کا بھی شکار تھے، اور وہ بغیر کسی متحد، یا جزوی طور پر متحد، کمانڈ ڈھانچے کے کام کرتے تھے۔

اگرچہ عرب لیگ کے اندر کچھ افراد حقیقی اسلامی، عرب اور قوم پرستی کے جذبات سے متاثر تھے، لیکن لیگ کے مجموعی اقدامات نے بالآخر صہیونی ریاست کے قیام میں سہولت کاری، حمایت اور حتیٰ کہ بااختیار بنایا۔ لیگ نے برطانوی پالیسی پر عمل کیا، جس نے 15 مئی 1948 تک برطانوی انخلاء کی سرکاری تاریخ تک عرب افواج کے فلسطین میں داخلے پر پابندی لگادی۔

[1] خالدی، صفحہ 87-88

دریں اثناء فلسطین پر برطانیہ سے صیہونیوں کے کنٹرول کی منتقلی کا عمل پہلے ہی سے جاری تھا۔ صیہونیوں نے خریداری کے ذریعے انگریزوں سے اسلحہ حاصل کیا اور براہ راست مدد کے ذریعے اضافی وسائل حاصل کئے۔ 1948 کے اوائل تک، انہوں نے 5 ملین پاؤنڈ میں 24 طیارے خریدے تھے۔ انتظامی اور عسکری طور پر، یہودی ایجنسی نے مؤثر کنٹرول قائم کر لیا تھا، جس نے ایک لڑاکا فورس کی کمانڈ کی تھی جس میں ہگناہ ملیشیا (35,000 ارکان)، 10,000 خصوصی جنگجو، اور شدت پسند تنظیمیں جیسے ارگن اور سٹرن گینگ شامل تھے۔

دوسری طرف فلسطینی معاشرہ ایک خاصی تباہی کا شکار تھا۔ 1936-1939 کی عظیم بغاوت سے تھک کر، اسے ہتھیار اٹھانے یا فوجی تربیت حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا۔ فلسطینیوں کو پڑوسی ممالک کی سیاسی یا فوجی حمایت بھی حاصل نہیں تھی۔ ان کا واحد دفاع ان کی بے مثال ہمت میں تھا۔ مزاحمتی تنظیموں میں شامل ہونے والوں کو سخت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے، اور ان کی تربیت جسمانی مشقوں اور نظریاتی اسباق تک محدود تھی۔[1]

فلسطینیوں کو ان کی بہادری سے بڑھ کر ایک اور ممکنہ فائدہ جو ان کی جدوجہد میں شامل ہونے کے لیے تیار عرب اور مسلم رضاکاروں کی افرادی قوت کا امکان تھا۔ تاہم، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، عرب حکومتوں اور بین الاقوامی طاقتوں نے انہیں اس لائف لائن سے بھی محروم کرنے کا کام کیا۔

تقسیم کا منصوبہ، جس کا مقصد امن کا مقصد تھا، بجائے اس کے کہ جنگ کا محرک بن گیا۔ صہیونیوں نے ان کو الاٹ کی گئی زمین پر دعویٰ کرنے اور اس کے عرب باشندوں کو نکالنے کے لیے جنگ لڑی، جب کہ عربوں نے اس تجاوز کے خلاف مزاحمت کی۔ انگریزوں نے اپنی طرف سے صہیونی مقصد کے لیے ایک آخری خدمت انجام دی۔ جب کہ انہوں نے مئی 1948 تک انخلاء کا اعلان کیا اور اس وقت تک اپنی افواج پر کسی بھی حملے کی سزا دینے کا عہد کیا، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک مربوط انداز میں کلیدی شہروں کو صیہونی افواج کے حوالے کرنے کا منصوبہ بنایا۔

---

[1] صلاۃ خلف، صفحہ 29-30۔

اس طرح، فلسطینیوں اور ان کی حمایت کرنے والی عرب افواج، اکثر اوقات قبل از وقت برطانوی انخلاء کی خبروں سے بیدار ہوئیں، صرف صہیونی افواج کو شہروں پر تیزی سے قبضہ کرنے اور سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرنے کے لیے۔ اس نے صیہونیوں کو اپنی علاقائی فتح اور آبادی کی نقل مکانی کی مہم شروع کرنے کے لیے فائدہ مند پوزیشن میں چھوڑ دیا۔

انگریزوں کا انخلاء اور صیہونیوں کے حوالے

10 مارچ 1948 کو، برطانوی مینڈیٹ کے خاتمے سے دو ماہ قبل، ہاگناہ کی قیادت نے فلسطینی دیہاتوں کو آباد کرنے کے لیے ایک پیچیدہ منصوبے کو حتمی شکل دی۔ اس منصوبے نے دہشت گردی کو فوجی برتری پر ترجیح دی، جس کا مقصد اتنا گہرا خوف پیدا کرنا تھا کہ رہائشی مزاحمت کی کوشش کیے بغیر بھاگ جائیں۔ قتل عام یا بڑے پیمانے پر حملوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ پکڑے گئے افراد کو مرکزی حراستی کیمپوں میں بھیجے جانے سے پہلے اکثر موقع پر ہی پھانسی دے دی جاتی تھی، جس سے خوف کی فضا کو یقینی بنایا جاتا تھا جو منظم مزاحمت کی کسی بھی کوشش کو مفلوج کر دے گا۔

دیہات کو عام طور پر تین اطراف سے گھیر لیا جاتا تھا اور شدید بمباری کا نشانہ بنایا جاتا تھا، جس سے فرار کے راستے کے طور پر ایک طرف کھلا رہتا تھا۔ جس سے مکین خوف وہراس میں بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ نقل مکانی کی مہم بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ شروع ہوئی اور مشرق کی طرف بڑھی، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ نئی آنے والی صہیونی ریاست کی سمندر تک رسائی برقرار رہے۔ اس آپریشن کا پہلا ہدف شمالی اور مغربی فلسطین کے دیہات اور قصبے تھے، جس کے ابتدائی مرحلے میں ایک اندازے کے مطابق 350,000 فلسطینیوں کو زبردستی بے گھر کیا گیا۔

صہیونی ملیشیاؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کئی طرح کے وحشیانہ طریقے اپنائے۔ ان میں دیہات پر براہ راست فوجی حملے، بازار میں بم دھماکے، کار دھماکے، سڑک کے کنارے گھات لگا کر حملے اور فلسطینیوں کا اندھا دھند قتل شامل تھا۔ مخصوص یونٹس، جیسے کہ مسطاراویم (عربوں کے بھیس میں کام کرنے والے)، خفیہ کارروائیاں انجام دیتے ہیں۔ کچھ معاملات میں، پانی کی سپلائی کو جان بوجھ کر بیکٹیریا سے آلودہ کیا گیا تھا، اور کچھ میں، پورے گاؤں کو آگ لگا دی گئی تھی جس میں مکین اندر پھنسے ہوئے تھے۔[1]

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں، The Ethnic Cleansing of Palestine، Ilan Pappe

ان تلخ، دردناک اور ہولناک واقعات کا سراسر دائرہ اس مختصر بیان میں مکمل دستاویزات سے انکاری ہے۔ بہر حال، ہر مسلمان کے لیے اپنے آپ کو اس علم سے آراستہ کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ نہ صرف ذہن کو آگاہ کرتا ہے بلکہ ضمیر کو بھی تشکیل دیتا ہے، جذبات کو ابھارتا ہے، اور انسانیت کے گہرے احساس کو جنم دیتا ہے جو اکثر وجدانی تفہیم کی اہمیت سے زیادہ ہوتا ہے۔

ان تلخ، دردناک اور ہولناک واقعات کا سراسر دائرہ اس مختصر بیان میں مکمل دستاویزات کی نفی کرتا ہے۔ بہر حال، ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس علم سے آراستہ کرے، کیونکہ یہ نہ صرف ذہن کو آگاہ کرتا ہے بلکہ ضمیر کو بھی تشکیل دیتا ہے، جذبات کو ابھارتا ہے، اور انسانیت کا گہرا احساس پیدا کرتا ہے جو اکثر وجدانی سمجھ کی اہمیت سے بالاتر ہے۔

اگر اس طرح کے کاموں کا مقصد بیداری اور عقل کی نشوونما کرنا ہے، تو انہیں ان تفصیلات کو سمجھنے کی اہم اہمیت کو بھی اجاگر کرنا چاہیے جو دشمن کی سفاکیت، ظلم اور بے جا تکبر کو واضح طور پر بے نقاب اور ناقابل تردید طور پر ظاہر کرتی ہیں۔ میناچم بیگن نے خود بھی بے دلی سے اس بات پر فخر کیا کہ دیریاسین کے قتل عام نے ہمسایہ خطوں میں دہشت پھیلانے میں ایک اہم کردار ادا کیا، جس سے حیفہ کے سقوط کو آسانی سے "مکھن میں چھری کاٹنا" کی سہولت فراہم کی گئی۔[1]

برطانیہ اور صیہونیوں کے درمیان مربوط کوششوں کے نتیجے میں، حیفا اپریل 1948 میں، برطانوی انخلاء سے ایک ماہ قبل گر گیا۔ یہ شہر ایک مشہور بندرگاہ اور آئل ریفائنری کے ساتھ ایک متحرک تجارتی مرکز کے طور پر اپنی حیثیت کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت حیفہ کی عرب آبادی 70,000 سے تجاوز کر چکی تھی۔ شہر پر صیہونیوں کے حملے دسمبر 1947 کے اوائل میں شروع ہوئے اور اپریل 1948 میں اس میں اضافہ ہوا، جس کی مدد توپ خانے اور فضائی حملوں سے کی گئی۔ حملے کے اختتام تک، حیفہ کی عرب آبادی، قتل وغارت اور جبری نقل مکانی کے ذریعے کم ہو کر محض 3,000 سے 4,000 رہ گئی تھی۔

[1] میناچیم بیگن، بغاوت، p.165

کچھ دنوں کے بعد، جفا نے اسی طرح کی قسمت کا سامنا کرنا پڑا. اس کے مضافات میں حملہ 27 اپریل 1948 کو شروع ہوا۔ جیسے ہی ہر ایک علاقہ گرتا گیا، صیہونی ملیشیا نے شہر کے باقی حصوں پر بمباری کرنے کے لیے حکمت عملی کے ساتھ توپ خانے کو کھڑا کر دیا، جس سے مکینوں کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ جفا، جو کہ تقریباً 70,000 عربوں کا گھر بھی تھا، صیہونیوں کے آپریشن مکمل ہونے تک اس کی آبادی کم ہو کر صرف 4000 یا 5000 رہ گئی تھی۔

دوسرے شہر، جیسے کہ سفید، بیسان، اور گلیل کے مختلف علاقے، اسی طرح کی منظم مہمات میں گرے۔ ان واقعات میں ایک بار بار آنے والا نمونہ صیہونی ملیشیاؤں کے ساتھ مل کر احتیاط کے ساتھ اہم مقامات سے برطانوی افواج کا قبل از وقت انخلا تھا۔ دریں اثنا، برطانیہ نے مستقل طور پر عرب افواج کو 14 مئی 1948 تک فلسطین میں داخل ہونے سے روک دیا، جو ان کے انخلاء کی سرکاری تاریخ تھی۔

اس طرح بے دفاع اور جنگ سے تنگ فلسطینی عوام کے خلاف سازش اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ وسائل کے تھکے ہوئے اور چھین لیے گئے، ان کے پاس دسیوں ہزار اعلیٰ تربیت یافتہ اور بھاری ہتھیاروں سے لیس صہیونی ملیشیا کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے لیے کوئی قابل عمل ذریعہ نہیں تھا۔

کسی شہر کے زوال یا گاؤں کے قتل عام کے ہر بیان میں، پناہ گزینوں کی لہریں نکلتی ہیں، خواہ ان شہروں سے بھاگ رہے ہوں جن پر قبضہ کیا گیا تھا، دیہات جو ان کے باشندوں کے ساتھ تباہ ہو چکے تھے، یا ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے ان ہولناکیوں کو اپنی قسمت کا محرک سمجھا۔ مزاحمت کے ذرائع چھین لیے گئے اور ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا، وہ اسی سنگین تقدیر سے بچنے کے لیے بھاگ گئے۔ انسانیت کی یہ مایوس لہریں بے مقصد بھٹکتی رہیں، کچھ مغربی کنارے، غزہ، لبنان، یا شام تک پہنچنے کا انتظام کر رہے تھے، اس پر انحصار کرتے ہوئے کہ ان کی گرفت میں کیا تھا۔ دوسرے بغیر سمت کے گھومتے رہے، اور بہت سے راستے میں ہلاک ہو گئے—تھکن، بیماری، بھوک، سردی، یا بچھوؤں اور سانپوں کے ڈنک سے۔ چند خوش نصیبوں کو غاروں، چٹانوں کے نیچے، یا پتھروں کی پناہ گاہ میں پناہ ملی، لیکن زیادہ تر کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں ملی۔

14 مئی 1948 کو انگریز رسمی طور پر فلسطین سے چلے گئے۔ ڈیوڈ بین گوریون ریاست اسرائیل کی آزادی کا اعلان کرنے کے لیے آگے بڑھے، تھیوڈور ہرزل کی ایک بلند و بالا تصویر کے نیچے کھڑے تھے، جو ایک نظریاتی بصیرت تھا جس نے صیہونیت کے بیج بوئے تھے۔ ہرزل اپنے وژن کو پیش کرنے کے صرف آٹھ سال بعد انتقال کر گیا تھا، پھر بھی چار دہائیوں بعد، اس کا خواب پورا ہوا۔

اس طرح، قدیم قرآنی پیشین گوئی کو پورا کیا گیا، یہودیوں کو مقدس سرزمین پر واپس لایا گیا

﴿وَقُلْنَا مِنۢ بَعْدِهِۦ لِبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱسْكُنُوا۟ ٱلْأَرْضَ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ ٱلْـَٔاخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ﴿١٠٤﴾﴾

اور ہم نے فرعون کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم زمین میں رہو اور جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو جمع کر کے نکالیں گے۔

اس واقعہ نے فلسطین، عربوں، مسلمانوں اور در حقیقت پوری دنیا کی تاریخ میں ایک نئے اور دردناک باب کا آغاز کیا۔

1948 کا نکبہ

تین دہائیوں کے دوران طاقتور برطانوی سلطنت کی طرف سے صیہونیوں کو ملنے والی بے مثال حمایت کے باوجود، ان کی فلسطین پر فتح آسان نہیں تھی۔ اسے فلسطینیوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ وہ سنگین حالات، کم وسائل اور وسیع پیمانے پر بین الاقوامی اور عرب دھوکہ دہی کی وجہ سے محصور تھے، لیکن وہ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور شاندار ہمت اور عزم کے ساتھ لڑے۔

اس ہنگامہ خیز اور پیچیدہ دور کی تاریخ کو آسان بنانے کے لیے، ہم مزاحمت کو تین کلیدی سطحوں میں درجہ بندی کر سکتے ہیں۔

1. فلسطینی مزاحمت، جس کی قیادت بنیادی طور پر عبد القادر الحسینی کی قیادت میں ہولی جہادی تحریک کر رہی تھی.
2. عرب لبریشن آرمی، جسے عرب لیگ نے فلسطین میں لڑائی کے لیے رضاکاروں کو منظم کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔
3. سرکاری عرب فوجیں، جو برطانوی مینڈیٹ کے خاتمے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئیں اور 1948 کی جنگ میں مصروف تھیں۔

یہ تسلیم کرنا بہت ضروری ہے کہ مزاحمت کی یہ تین سطحیں، چاہے وہ آزادانہ طور پر کام کریں یا اجتماعی طور پر، صہیونی ملیشیا کے مقابلے میں بہت کم وسائل کے حامل تھے۔ ان کے پاس کافی ہتھیار، گولہ بارود، فوجی تربیت اور لاجسٹک مہارت کی کمی تھی۔ مالی وسائل اور رسد کے راستے بھی سخت محدود تھے۔ مزید برآں، وہ اس مضبوط سیاسی پشت پناہی سے عاری تھے جس سے صیہونی طاقتیں مستفید ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ سرکاری عرب فوجیں بھی ناکافی تعداد اور سازوسامان سے دوچار تھیں، ان کے پاس پہلے سے جنگی تجربے کی کمی تھی، اور وہ حکومتوں کے تحت کام کرتی تھیں جو اب بھی غیر ملکی استعماری طاقتوں کے زیر کنٹرول ہیں۔

فلسطینی عوام سے اپنے اور اپنے وطن کے دفاع کے حق کو مؤثر طریقے سے چھین لیا گیا، باوجود اس کے کہ وہ اس ذمہ داری کو خود اٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی سرزمین اور دشمن سے سب سے زیادہ واقف ہونے کے ناطے، وہ صہیونی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پوزیشن میں تھے۔ انہیں صرف عرب ریاستوں سے ضروری مالی اور فوجی مدد درکار تھی[1]۔ مزید یہ کہ صرف فلسطینیوں کو مزاحمت کی ذمہ داری سونپنے سے اہم سیاسی فوائد حاصل ہوتے۔ اس سے صیہونی پروپیگنڈے کو نقصان پہنچتا، جس میں اسرائیل کو آزادی کی خواہاں ایک چھوٹی، جدوجہد کرنے والی ریاست کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور بڑی، زیادہ آبادی والی، اور بہتر ساز و سامان سے آراستہ عرب

[1] عارف المعارف، نقابت فلستین، جلد 1، صفحہ 14-15؛ بہجت ابو غربیح، جلد 1، صفحہ 146-47؛ محمود الصباغ، صفحہ 91، 169۔

اقوام کا غیر منصفانہ طور پر محاصرہ کیا گیا تھا۔ یہ تصویر مکمل طور پر گمراہ کن تھی، جیسا کہ صہیونی ملیشیا، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، مشترکہ عرب فوجوں کی تعداد اور اسلحے دونوں لحاظ سے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

اس کے باوجود عرب لیگ اور سرکاری عرب حکومتوں نے براہ راست مداخلت کرنے، صورتحال کو مزید خراب کرنے اور تباہ کن نتائج کی راہ ہموار کرنے پر اصرار کیا۔ تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں عرب پالیسیوں اور فوجی اقدامات نے اسرائیل کے قیام اور موجودگی کو فعال اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا[1]۔

مزید برآں، فلسطینی کمیونٹی کو زمینی سطح پر سیاسی قیادت کی عدم موجودگی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس دور کی ایک اہم غلطی حج امین الحسینی کی عدم موجودگی تھی، جو واحد سیاسی شخصیت ہیں جو ان کی قیادت کے لیے بڑے پیمانے پر پہچانی جاتی ہیں۔ جب کہ مصر کے شاہ فاروق نے انہیں فلسطین واپس آنے سے روک دیا تھا، لیکن الحسینی کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اس پابندی سے نکلنے کا راستہ تلاش کریں اور ایسے اہم وقت میں اپنا صحیح کردار ادا کریں۔[2]

مقدس جہاد کی تحریک

عوامی جذبات کو ایک منظم مسلح مزاحمت میں تبدیل کرنے کی عبدالقادر الحسینی کی کوشش عظیم فلسطینی بغاوت کے بعد سے فلسطینی مزاحمت کی تاریخ میں کامیاب ترین کوششوں میں سے ایک ہے۔ اس بغاوت کے دوران ایک ممتاز شخصیت، عبدالقادر زخمی اور گرفتار ہو گئے تھے لیکن بعد میں فرار ہو گئے اور مختلف عرب اور یورپی ممالک میں وقت گزارے۔

1946 کے موسم گرما میں، عبد القادر الحسینی نے قاہرہ میں اپنے کزن مفتی امین الحسینی سے ملاقات کی، جو فلسطینیوں کے سیاسی رہنما تھے۔ مفتی صہیونی ریاست کے لیے اتحادیوں کی حمایت کا مقابلہ کرنے کے لیے محوری

---

[1] امین الحسینی کی یادداشت، صفحہ 103؛ عبداللہ عزام، الذخائر الاعظام، جلد 1، صفحہ 835

[2] ابراہیم غوشہ، المذنۃ الحمراء: سیرۃ ذھتیہ (سرخ مینار: ایک خودنوشت)، صفحہ 23؛ عونی فرسخ، التحدیث والاجابہ (چیلنج اور جواب)، صفحہ 873-74

طاقتوں کے ساتھ اتحاد کی تلاش میں، فلسطین سے فرار ہو گئے تھے اور کئی ممالک کا سفر کیا تھا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم میں محور کی شکست نے اس کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ یہودی افواج اور اتحادیوں دونوں کے تعاقب میں، وہ آخر کار قاہرہ میں آباد ہو گیا۔ یہیں پر عرب اعلیٰ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور عبد القادر کی قیادت میں ایک مسلح مزاحمتی تحریک، مقدس جہاد موومنٹ قائم کرنے پر اتفاق کیا۔

عبد القادر نے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو بھرتی کرنے کے لیے اپنی شاندار شہرت اور گہرے روابط کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فلسطینی دیہاتوں کا وسیع سفر کیا۔ یہ بھرتیاں نہ صرف فوجی کارروائیوں کے لیے بلکہ مقامی رہنماؤں کے ساتھ مل کر گاؤں کی حفاظت اور انتظام کے لیے بھی منظم کی گئی تھیں۔ مقدس جہاد کی تحریک کو مختلف خصوصی اکائیوں میں تشکیل دیا گیا تھا، بشمول:

بائیکاٹ نافذ کرنے والے اور انسداد تعاون یونٹ: اس یونٹ نے یہودی افواج کے ساتھ تعاون کرنے والوں کو خبر دار کیا۔ اگر انتباہات کو نظر انداز کیا گیا تو، ان کے گودام، گھر، اور سامان کو تباہ کر دیا گیا تھا.

- زمین کے تحفظ کا یونٹ: زمین کی فروخت کو روکنے کے لیے وقف، اس نے دلالوں کو خبر دار کیا اور ان لوگوں کو قتل کیا جو صیہونی اداروں کو زمین فروخت کرنے پر بضد تھے۔
- علاقائی فوجی یونٹس: یہ مختلف علاقوں میں مسلح کارروائیوں کے لیے ذمہ دار تھے۔
- سپورٹ اور لاجسٹک یونٹس: معاون اور آپریشنل معاون کرداروں کے ساتھ کام کیا جاتا ہے۔
- انٹیلی جنس یونٹ: اہم معلومات اکٹھا کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔

یروشلم تحریک کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر کام کرتا تھا، جسے صہیونی بستیوں کے مرکز اور فلسطینی جدوجہد کے مرکز کے طور پر اس کی اسٹریٹجک اہمیت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس شہر کو فیصلہ کن میدان جنگ کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جس کا نتیجہ اس ناجائز ریاست کی تقدیر کو تشکیل دے گا جسے صیہونی قائم کرنا چاہتے تھے۔ در حقیقت، مقدس جہاد تحریک کی قیادت میں بہت سی اہم ترین لڑائیاں یروشلم اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں لڑی گئیں۔

اس تحریک کے کئی فوائد تھے جن کی عرب لبریشن آرمی (عرب رضاکاروں کو اکٹھا کرنے کے لیے بنائی گئی) اور سرکاری عرب فوجوں کی کمی تھی:

- ایک قابل اور سرشار قیادت
- جنگجو جو زمین کے مقامی تھے، اس کے علاقے، باشندوں اور دشمن کی نوعیت سے واقف تھے

ہولی جہاد آرمی نے اپنے محدود وسائل سے کہیں زیادہ غیر معمولی جرات اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے متعدد اہم لڑائیوں میں حصہ لیا۔ اس نے دشمنوں کے خلاف فیصلہ کن فتوحات حاصل کیں جنہوں نے ان کی تعداد کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تاہم، فوج بالآخر صہیونی ریاست کی پیش قدمی کو نہیں روک سکی، جسے بین الاقوامی طاقتوں کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ تلخ حقیقت یہ تھی کہ جنگجوؤں نے اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھی جب تک کہ ان کا گولہ بارود ختم نہ ہو گیا، ان کے بہت سے رہنما یا تو شہید یا گرفتار ہو گئے۔

اس ناکامی میں عربوں کی ملی بھگت نے اہم کردار ادا کیا۔ شروع سے ہی، عرب لیگ نے عبدالقادر الحسینی کی کوششوں کو روکنے اور ان کو کمزور کرنے کے لیے فعال طور پر کام کیا۔ اس نے اپنی مزاحمت پر قابو پانے اور اسے اپنے اختیار میں لانے کی کوشش کی۔ ان رکاوٹوں کے باوجود الحسینی اپنی آزادی پر زور دینے اور تحریک کو قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ تاہم، ان کی کوششوں کا انحصار مالی اور مادی مدد پر رہا، جس سے وہ عرب لیگ کے ساتھ ایک کمزور تعلق برقرار رکھنے پر مجبور ہوئے۔

طویل مذاکرات کے بعد، عرب لیگ نے محدود حمایت فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن پابندی والی شرائط سے منسلک کیا۔ ان میں اسے دیہاتوں سے براہ راست فنڈز اکٹھا کرنے سے روکنا، اس کی کارروائیوں کو یروشلم کے علاقے تک محدود رکھنا، اور دیگر اقدامات جن کا مقصد واضح طور پر اس کی تاثیر کو کم کرنا تھا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود، الحسینی نے ان مسلط کردہ حدود کو نیویگیٹ کرنے اور ان سے بچنے کے لیے انتھک محنت کی، زبردست مشکلات کے خلاف مزاحمت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

عرب لبریشن آرمی نہ صرف عبد القادر الحسینی کی حمایت کرنے میں ناکام رہی بلکہ فعال طور پر اس کی مخالفت کی، اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور نہ ہی اس کو ہتھیار اور گولہ بارود کی اشد ضرورت تھی۔ اپنی آخری کوشش میں، الحسینی نے کمک کی درخواست کرنے کے لیے دمشق میں عرب لبریشن آرمی کے ہیڈ کوارٹر کا سفر کیا۔ اس کی درخواست کو نہ صرف مسترد کیا گیا بلکہ اسے مسترد اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا.

دمشق میں ہی الحسینی کو تشویشناک خبریں موصول ہوئیں: حکمت عملی کے لحاظ سے اہم گاؤں القسطال صیہونی افواج کے قبضے میں آ گیا۔ یہ گاؤں بہت اہمیت کا حامل تھا کیونکہ یہ بندر گاہ جافا کے درمیان سپلائی روٹ پر واقع تھا جہاں سے کمک پہنچتی تھی اور یروشلم، صہیونی بستیوں اور کارروائیوں کا مرکز تھا۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، وہ اس نازک پوزیشن کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے واپس دوڑا۔ اگرچہ وہ القسطال کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ اپنی فوج کو ایک تباہ کن دھچکا پہنچاتے ہوئے اس جنگ میں المناک طور پر شہید ہو گیا۔

اپنی موت سے دو دن پہلے، عبد القادر الحسینی نے عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل کو ایک پُرجوش خط لکھا: "میں آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ میرے فوجیوں کو ان کی فتح کے عروج پر، بغیر حمایت اور ہتھیاروں کے چھوڑ دیا گیا۔"

افسوسناک بات یہ ہے کہ 9 اپریل 1948 کو، ان کی شہادت کے صرف ایک دن بعد، بدنام زمانہ دیر یاسین کا قتل عام سامنے آیا، جس نے ان کے جنازے پر ایک سیاہ سایہ ڈالا اور فلسطینی کاز کے مصائب کو مزید بڑھا دیا۔

عرب لبریشن آرمی

فلسطین میں جہاد کے لیے عرب اور اسلامی جذبے کی لہر ایسی بلندیوں پر پہنچ گئی کہ عرب حکومتیں اسے نہ دبا سکی اور نہ ہی روک سکیں۔ جوش و خروش کی اس لہر کو آگے بڑھانے کے لیے، ان حکومتوں نے "عرب لبریشن آرمی" کے قیام کا اعلان کیا، جو ظاہر ہے کہ رضاکاروں کو اس کی صفوں میں شامل ہونے کی اجازت دے گی۔ تاہم، اس

اقدام نے عرب عوام کے خلاف ایک حسابی سازش کا آغاز کیا، فوج کو کنٹرول کے طریقہ کار کے طور پر استعمال کیا۔

اس سازش کا پہلا قدم فوج کے براہ راست اختیار کے علاوہ کسی بھی تنظیم کے ذریعے رضاکارانہ خدمات کی ممانعت تھی۔ آزاد بٹالین پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، قائم کردہ گروپوں سے ان کی ہم آہنگی اور تنظیمی کارکردگی چھین لی گئی۔ جن لوگوں نے ان پابندیوں کے خلاف مزاحمت کی انہیں تعزیری اقدامات کا سامنا کرنا پڑا، بشمول ہتھیاروں اور گولہ بارود تک رسائی سے انکار، ایک ایسا حربہ جس نے نئے رضاکاروں کو متحد کرنے کی ان کی صلاحیت کو بری طرح مجروح کیا، خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں پہلے ہی ہتھیاروں کی کمی تھی۔[1]

دمشق میں ہیڈ کوارٹر، عرب لبریشن آرمی کی قیادت تین شخصیات نے کی جن کے پاس قابل ذکر فوجی تجربہ تھا۔ پھر بھی، تنازعہ کے دوران، ان کی کارکردگی تباہ کن سے کم نہیں تھی، جو ان کی سابقہ ساکھ سے بالکل متصادم تھی۔ انہوں نے رضاکار فوج کی قیادت کے حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے فوج کو اس طرح منظم کیا جیسے یہ ایک روایتی فوجی قوت ہو۔ ان کے اقدامات اکثر فلسطین کی جدوجہد کو نقصان پہنچانے میں برطانوی مفادات سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تین رہنما اسماعیل صفوت، طہٰ الہاشمی اور فوزی القواقجی تھے۔

1. اسماعیل صفوت ایک عراقی فوجی افسر تھے جنہوں نے صفوں میں اضافہ کیا تھا لیکن 1920 کی عراقی بغاوت میں اپنی شمولیت کے علاوہ بہت کم امتیاز حاصل کیا تھا۔ اس کا کیریئر ایک روایتی افسر کی عکاسی کرتا ہے، جس میں قابل ذکر کامیابیوں یا اختراعات کا فقدان تھا۔
2. ایک اور عراقی فوجی ماہر طہٰ الہاشمی نے جنگ کے فن اور تاریخ، خاص طور پر فوجی جغرافیہ اور شہری جنگ میں اپنی وسیع اور قابل قدر تحریروں کے لیے پہچان حاصل کی۔ ان کے کیریئر کو مختلف تنازعات میں نمایاں کرداروں سے نشان زد کیا گیا، جس میں 1938 میں عراق کے وزیر دفاع اور 1941 میں وزیر

1 مصطفٰی السبعی، جہاد نانی فلسطین، ص 9 الف۔

اعظم کے طور پر خدمات انجام دیں۔ 1948 تک، 60 سال کی عمر میں، الہاشمی کے پاس وسیع تجربہ اور مہارت تھی، لیکن یہ خصوصیات مہم کے دوران مؤثر طریقے سے ظاہر ہونے میں ناکام رہیں۔

فوزی القوقجی، 1948 تک، 60 سال کی عمر کے قریب تھا اور بڑے پیمانے پر گوریلا جنگ کے ماہر کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ ایک تجربہ کار تجربہ کار، اس کی مزاحمت کی ایک تاریخی تاریخ تھی: بصرہ میں انگریزوں سے لڑنا، پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانیوں کے ساتھ خدمات انجام دینا، اور عظیم تر شام پر فرانسیسی حملے اور قبضے کے خلاف مزاحمت کرنا، خاص طور پر میسالون کی جنگ میں۔ انہوں نے فرانسیسی افواج کے خلاف حما میں انقلاب کی قیادت کی اور 1920 کی شام کی وسیع تر بغاوت میں ایک اہم شخصیت تھے۔ ان کی زندگی انتھک جدوجہد سے عبارت تھی۔ جہاں بھی اسلحے کی پکار اٹھی، اس نے جواب دیا۔ القوقجی نے 1936 کی عظیم بغاوت کے دوران فلسطین میں بھی رضاکارانہ خدمات انجام دیں اور عراق میں راشد علی الکلانی کی قیادت میں 1941 کی ناکام بغاوت کی کوشش میں حصہ لیا۔ مزاحمت کے لیے ان کی غیر متزلزل وابستگی نے انھیں لیونٹ واپس لایا جب 1948 میں جنگ شروع ہوگئی۔[1]

اس کے برعکس، نہ اسماعیل صفوت اور نہ ہی طحہٰ الہاشمی کو گوریلا جنگ کا تجربہ تھا۔ انہوں نے کبھی فلسطین میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس کے علاقے سے ناواقف تھے[2]۔ مزید برآں، القوقجی کے ساتھ ان کے تعلقات باہمی بداعتمادی اور شکوک وشبہات کی وجہ سے خراب ہوئے، جس نے فوج کی کارروائیوں کو نقصان پہنچایا اور اس کی لڑائیوں کے نتائج کو منفی طور پر متاثر کیا[3]۔

تاہم، سب سے اہم اور نقصان دہ تقسیم عرب لبریشن آرمی کی قیادت اور فلسطینی رہنما حاج امین الحسینی کے درمیان ہے۔ مفتی اردن اور عراق دونوں میں ہاشمی حکومتوں کے سخت مخالف تھے۔ اردن کے شاہ عبداللہ کے

1 قووقجی کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھیں فلسطینی انسائیکلوپیڈیا، جلد 3، صفحہ 480۔

2 مدثر طہٰ الہاشمی، ج2، ص176۔

3 دیکھیں قویق جی کی یادداشت، صفحہ 335-37؛ طحہ کی یادداشت، جلد 2، صفحہ 188

ساتھ اس کی دشمنی قابل فہم تھی۔ یہ برطانیہ سے منسلک بادشاہ اور برطانوی اثر و رسوخ کے ایک ثابت قدم مخالف کے درمیان دشمنی تھی۔ اسی علاقے پر کنٹرول کے لیے ان کی مسابقت نے ان کی دشمنی کو مزید گہرا کر دیا۔ عراق میں ہاشمی حکومت کے خلاف الحسینی کی مخالفت اسی طرح برطانوی مفادات سے جڑی ہوئی تھی۔ اس نے راشد علی الکلانی کی قیادت میں ناکام بغاوت کی حمایت میں بھی کردار ادا کیا تھا، جس کا مقصد عراق سے برطانوی اثر و رسوخ کو نکالنا تھا۔ طحہ الہاشمی اور اسماعیل صفوت دونوں ہی عراقی حکومت کے وفادار تھے، جس سے الحسینی کے ساتھ کشیدگی بڑھ گئی تھی۔

عرب لیگ نے عرب لبریشن آرمی کی قیادت کو اس طرح سے تشکیل دیا جس نے جان بوجھ کر الحسینی اور اس کے پیروکاروں کو نظر انداز کیا۔ اس فیصلے سے فلسطینیوں کو اپنے دفاع کو آزادانہ طور پر منظم کرنے سے روکنے کی لیگ کی وسیع حکمت عملی کی عکاسی ہوتی ہے، جس سے انہیں درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی ان کی صلاحیت میں مزید کمی آتی ہے۔ مفتی نے فلسطین کے لوگوں کو مسلح اور تربیت دے کر ان پر انحصار کرنے کی سختی سے وکالت کی، اس بات پر زور دیا کہ منظم فوجی یونٹس غیر ضروری ہیں۔ اگر بیرونی مداخلت ناگزیر ہو جائے تو اس نے دلیل دی کہ کسی بھی رضاکار کو ان کی اور اس کے کزن، فیلڈ کمانڈر عبد القادر الحسینی کی قیادت میں رکھا جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ فلسطینیوں کو، جو اپنی سرزمین سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، کو اضافی افرادی قوت کی بجائے ہتھیاروں، فنڈنگ اور تربیت کی زیادہ ضرورت ہے[1]۔

عرب لبریشن آرمی کی قیادت اور مفتی کے دھڑے کے درمیان اختلاف نے تباہ کن اثرات مرتب کیے، جو تنازع کے نازک وقت کی وجہ سے بدتر ہو گئے، جب معمولی اختلاف بھی تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔

عرب لبریشن آرمی نے بڑی تعداد میں رضاکاروں کا خیر مقدم کیا، اس حد تک کہ فوزی القوقجی کی رہائش گاہ مبینہ طور پر ہر وقت بھرتی کرنے والوں سے بھری رہتی تھی۔ اس کے باوجود، عرب لیگ کی طرف سے فراہم کردہ

[1] طٰہٰ ہاشمی، ج2، ص181۔

ہتھیار انتہائی ناکافی تھے "دسیوں ہزار کے لیے چند سو رائفلیں جنہیں لڑنے کے لیے متحرک کیا جا سکتا تھا۔" لیگ نے اپنی ناکامی کا دفاع یہ کہہ کر کیا کہ اس نے فلسطین کو آزاد کرانے کی واحد ذمہ داری قبول کی ہے۔[1]

دریں اثنا، عرب لبریشن آرمی کو عرب حکومتوں کی طرف سے فراہم کردہ محدود وسائل، بشمول ناکافی فنڈز، سب پار ہتھیاروں، اور تاخیر سے رسد کی وجہ سے نقصان پہنچا۔ فوج کو ناقص ٹائمنگ اور محدود اختیار کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ حقیقی آپریشنل آزادی کے بغیر رہ گئی۔ اس کے رہنماؤں نے اکثر عرب حکومتوں پر تنقید کی، ان کی پالیسیوں، تاخیر، اور فراہم کردہ ہتھیاروں اور ساز و سامان کی ناکافی ہونے کا الزام لگایا۔

فوج کے مشن کے بارے میں وضاحت کی کمی کی وجہ سے یہ مسائل مزید بڑھ گئے۔ کیا اس کا مقصد براہ راست فلسطینیوں کی حمایت کرنا، صیہونیوں کے خلاف مکمل پیمانے پر مہم شروع کرنا، یا صرف اس وقت تک تناؤ کی حالت برقرار رکھنا تھا جب تک کہ عرب فوجیں مداخلت نہ کریں؟ اس ابہام نے فوج کی تاثیر کو کمزور کر دیا اور بامعنی نتائج حاصل کرنے کی اس کی صلاحیت کو روک دیا[2].

عرب لبریشن آرمی نے اپنے اختیار میں محدود وسائل اور اختیار کے باوجود کئی اہم غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ عینی شاہدین اور مورخین اس بارے میں منقسم ہیں کہ آیا یہ غیر ارادی غلطی، غداری کی کارروائیاں، یا دونوں کا مجموعہ تھیں۔ ذیل میں ان غلطیوں کا خلاصہ ہے، بغیر تجزیہ کے پیش کیا گیا ہے، کیونکہ یہاں گنجائش گہرائی سے جانچنے کی اجازت نہیں دیتی:

1. رضاکاروں کی بھرتی پر پابندی: اگرچہ فوج میں شامل ہونے کا زبردست جوش و خروش تھا، لیکن رضاکاروں کے صرف ایک چھوٹے حصے کو ہی قبول کیا گیا۔ بعد ازاں اس جواز کے تحت بھرتی روک دی گئی کہ بھرتی ہونے والوں کی تعداد فوج کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر بھرتی کو

---

[1] صلاۃ خلف، ص 65۔

[2] دیکھیں طحہٰ ہاشمی، ج 2، ص 177، ص 183 ایف۔

دوبارہ کھولنے کا ایک مبہم وعدہ لاتعداد شوقین افراد کو چھوڑ دیا گیا اور جدوجہد میں حصہ ڈالنے میں ناکام رہا۔

2. بھرتی کرنے والوں کا غلط انتخاب: قبول شدہ بھرتیوں میں سے بہت سے غیر تربیت یافتہ یا غیر موزوں گروہوں سے تیار کیے گئے تھے، بشمول غیر تربیت یافتہ شہری، مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد، اور بے کار نوجوان۔ انتخاب کے اس ناقص عمل کی وجہ سے چوری، لوٹ مار، اور شہریوں اور کاروباری اداروں پر حملوں کے بڑے پیمانے پر واقعات رونما ہوئے۔[1] بھرتی کرنے والوں کے درمیان اندرونی تنازعات کبھی کبھار مسلح تصادم تک بڑھ جاتے ہیں۔[2] مزید تشویشناک بات یہ ہے کہ جانچ کی سست روی نے صیہونیوں کے لیے کام کرنے والے یہودی جاسوسوں اور عرب ساتھیوں کو صفوں میں گھسنے کی اجازت دی، جس سے فوج کی تاثیر پر مزید سمجھوتہ ہوا۔[3]
3. غیر موثر تربیتی طرز عمل: جنگ کے تناظر کے مطابق گوریلا جنگ میں رضاکاروں کو تربیت دینے کے بجائے، فوج نے باقاعدہ فوجیوں کے لیے بنائے گئے طریقے اپنائے۔ یہ نقطہ نظر سست اور سخت تھا، زمین پر تیزی سے رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ رفتار برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔ تربیت کے طریقوں اور میدان جنگ کی حقیقتوں کے درمیان مماثلت نے فوج کو تیز اور مؤثر طریقے سے جواب دینے کے لیے تیار نہیں کیا۔[4]
4. جنگجوؤں کو مناسب منصوبہ بندی، تنظیم یا ہم آہنگی کے بغیر لڑائیوں میں تعینات کرنے کے نتیجے میں افراتفری اور غیر منظم پسپائی ہوئی، جو نہ صرف فتوحات حاصل کرنے میں ناکام رہے بلکہ اکثر اہم دھچکے

[1] مصطفیٰ الصباء، جہاد فی فلسطین (فلسطین میں ہماری جدوجہد)، صفحہ 109؛ کامل الشریف، الاخوان المسلمون فی حرب فلستین (فلسطین کی جنگ میں اخوان المسلمین)، صفحہ 28؛ عارف المعارف، نقابت فلستین، ج1، 247۔

[2] مدثرات فوزی القوقجی، صفحہ 346-47

[3] عارف المعارف، ج1، 247-48

[4] قواقجی، ص336

کا باعث بنے۔ بعض صورتوں میں، جنگجوؤں کو فرنٹ لائنز کے قریب کیفے میں سستی کرتے ہوئے، اپنی پوسٹوں کو ترک کرتے ہوئے اور اپنے جنگی فرائض کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھا گیا۔[1]

5. عرب لبریشن آرمی کی کارروائیوں کو تقسیم کے پلان[2] کے تحت عربوں کے لیے مختص علاقوں تک محدود کرنے سے اس کی توجہ ان علاقوں کی طرف موڑ دی گئی جو فوری طور پر خطرے میں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر، فوزی القواقجی نے اپنے آپ کو نابلس میں رکھا اور دفاع کی اشد ضرورت کے باوجود یہودیوں کے لیے مختص شہروں کی حمایت نہیں کی۔ نتیجے کے طور پر، جفا اور حیفہ جیسے شہر کافی مزاحمت کے بغیر گر گئے۔ اسی طرح فوج گاؤں کے قریب تعینات ہونے کے باوجود دیر یاسین میں بحران کا جواب دینے میں ناکام رہی۔[3]

6. دوسرے رضاکار دھڑوں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار اور گولہ بارود جیسے اہم سامان کو روکنے سے یروشلم کے دفاع میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر طحہٰ الہاشمی نے ان دھڑوں کو اپنی لڑائی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری وسائل سے انکار کیا۔ مزید برآں، عرب لبریشن آرمی نے انخلاء کے بعد اضافی برطانوی فوجی سازوسامان کی خریداری کے لیے مالی مدد فراہم کرنے سے انکار کر دیا، جس سے مزاحمتی کوششوں کو مزید نقصان پہنچا۔[4]

7. یروشلم کے دفاع کے دوران دیگر رضاکار دھڑوں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کرنے اور گولہ بارود جیسے اہم سامان کو روکنے سے اجتماعی مزاحمت شدید طور پر کمزور ہو گئی۔ مثال کے طور پر، طحہ الحشیمی نے

---

[1] شیخ مصطفیٰ السبائی نے بتایا کہ انہوں نے ایک بار مشیل افلق اور صلاح البطار (سیرین بعث پارٹی کے بانی) کو ایک کیفے میں بیٹھے دیکھا۔ اس نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ لڑائی کے لیے رضاکاروں کے طور پر بھرتی ہو چکے ہیں پھر بھی وہ کیفے میں خاموش بیٹھے تھے۔ پھر وہ انہیں میدان جنگ میں لے گیا۔ مشیل افلق رکنے سے پہلے کچھ فاصلے تک اس کے ساتھ چلتا رہا، جب کہ صلاح البطار مزید آگے بڑھا لیکن آخر کار خوفزدہ ہو کر رک گیا۔ دیکھیں: عدنان مسعودی، الاالموجہ (تصادم کی طرف)، صفحہ 57-58۔

[2] طحہٰ الہاشمی کی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عرب لبریشن آرمی کی کارروائیاں صرف عرب علاقوں تک محدود تھیں، یہ تجویز کرتی ہے کہ اسے تقسیم کے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے بنایا گیا تھا۔ دیکھیں: طہٰ الہاشمی، ج2، ص176-77۔

[3] مصحف السبعی، ص33؛ عارف المعارف، ج1، صفحہ 248-49، 256; بہجت ابو غربیہ، ج1، ص146

[4] مصطفی السبعی، ص33۔

ان دھڑوں کو ان کے انخلا کے بعد اضافی برطانوی فوجی ذخائر سے ہتھیار خریدنے کے لیے درکار فنڈز سمیت ضروری وسائل تک رسائی سے انکار کیا[1]۔

8. جفا، حیفہ، اور یہاں تک کہ یروشلم جیسے اہم شہروں کو تھوڑی مزاحمت کے ساتھ ہتھیار ڈالنا۔ طحہٰ الہاشمی نے اس بات کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی کہ یروشلم تزویراتی لحاظ سے اہم نہیں ہے اور بعد میں اسے آسانی سے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور تھا۔ یروشلم کے سقوط نے عربوں اور یہودیوں دونوں پر بہت زیادہ نفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ گہرے اسٹریٹجک اور سیاسی اثرات مرتب کیے تھے۔[2]

9. میدان جنگ کی حقیقتوں کی پرواہ کیے بغیر عرب حکومتوں کی ہدایات پر عمل کرنے نے عرب لبریشن آرمی کی تاثیر کو مزید متاثر کیا۔ پیش قدمی یا پسپائی کے احکامات اکثر سیاسی دارالحکومتوں سے آتے ہیں نہ کہ زمین پر موجود فوجی رہنماؤں کے۔ یہ نوکر شاہی طرز عمل، جو رضاکارانہ فوج کے لیے موزوں نہیں تھا، اس کے نتیجے میں بار بار اور ناقص منصوبہ بندی کی گئی واپسی ہوئی،[3] جس سے صیہونیوں کو حیرت انگیز آسانی کے ساتھ علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد ملی۔[4] اس موقع پر صہیونی بھی حیران رہ گئے کہ یہ علاقے کتنی جلدی گر گئے۔ مزید برآں، بعض محققین نے عرب لبریشن آرمی کے مختلف علاقوں میں دیہاتیوں کو غیر مسلح کرنے کے تباہ کن عمل پر روشنی ڈالی ہے، صرف صہیونی حملوں کا سامنا کرنے پر پسپائی اختیار کرنا، اس طرح یہ کمیونٹیز بے دفاع ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، فوزی القواقجی نے بالائی گلیل کے

---

[1] عارف المعارف، نقابت الفلسطین، جلد 1، 249-50

[2] امین الحسینی کی یادداشت، صفحہ 393-94، امیر الحسینی نے اپنی یادداشتوں کے متعدد اقتباسات میں طحہٰ الہاشمی کی بے ہودگی یا مختلف معاملات اور ماضی کے حالات سے آگاہی کی کمی کا حوالہ دیا ہے، جو عراق میں بطور وزیر ان کے دور سے متعلق ہے (دیکھیں صفحہ 70)

[3] مصطفیٰ السبعی، ص 33

[4] عارف المعارف، ج 1، 308-09۔

دیہاتوں میں ایسی کارروائیوں کو انجام دینے کی اطلاع دی ہے، جس سے مقامی آبادی کے خطرے میں اضافہ ہوا ہے۔[1]

10. اہم لمحات کے دوران جنگ بندی کو قبول کرنے سے صہیونیوں کو وقفے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، جنگ کے توازن کو افرادی قوت اور ہتھیاروں میں کمک حاصل کر کے اپنے حق میں تبدیل کر دیا گیا جس کی مثال فوزی القوقجی نے "مشمار حمیک" کی لڑائی کے دوران دی تھی۔[2]

مزید بر آں، نازک لمحات کے دوران، عرب فوجوں کے داخلے کے بعد بھی رضاکاروں کو عرب دارالحکومتوں سے کوئی مدد یا کمک نہیں ملی۔ جب افواج نے مدد کی اپیل کی تو عرب حکام نے بہت کم تشویش کا اظہار کیا، اکثر انہیں پیچھے ہٹنے کی ہدایت کی یہاں تک کہ اگر اس طرح کے انخلاء سے پناہ گزینوں اور مقامی باشندوں کے بڑے پیمانے پر قتل عام کا خطرہ ہو، بشمول یروشلم ہی میں![3]

ناگزیر نتیجہ ناہموار اور غیر منظم لڑائیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ بالآخر، یہ ناقص تربیت یافتہ اور منقطع قوتیں انتہائی منظم، اچھی تربیت یافتہ صہیونی ملیشیا کے سامنے جھک گئیں، جنہیں برطانوی فوجی اور سیاسی حمایت سے تقویت ملی۔

ان ناکامیوں نے عرب لبریشن آرمی کی قیادت کی ساکھ کو نمایاں طور پر داغدار کیا۔ نکبہ سے پہلے بڑے پیمانے پر تعریف کے ساتھ منائے جانے والے رہنما شکوک و شبہات کا نشانہ بن گئے[4] اور بعد میں دھوکہ دہی کے الزامات بھی[5]۔ ان کے اعمال کے مکمل تجزیہ کے لیے ایک سرشار اور تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

[1] میں نے یہ بات مشہور مفکر ڈاکٹر منیر شفیق سے سنی، جو یروشلم کے رہنے والے ہیں، جن کی عمر نقبہ کے وقت چودہ سال تھی اور وہ فلسطینی تاریخ کے محقق ہیں۔ تاہم، میں نے جن ذرائع کا جائزہ لیا ہے ان میں مجھے یہ معلومات دستاویزی نہیں ملی ہیں۔

[2] عارف المعارف، ج1، 198-99

[3] مصطفی السبعی، صفحہ 29-30۔

[4] ان تمام ذرائع میں جن کا میں نے جائزہ لیا ہے، نقبہ سے پہلے کے تمام لوگ طہٰ الہاشمی اور فوزی القوقجی کی تعریف کرتے ہیں۔

[5] دیکھیے، مثال کے طور پر، مصطفی السبعی، صفحہ 27-27، 36؛ عبداللہ عزام، حماس: الجود ھر والمشاق ان الذخائر الاعظام، جلد 1، صفحہ 834

تاہم، جو بات یقینی ہے، وہ یہ ہے کہ عرب لبریشن آرمی کی قیادت فلسطین اور یروشلم کے نقصان کی ذمہ داری کا کافی حصہ لیتی ہے۔ عبد القادر الحسینی کے ساتھ انتہائی مایوس کن اوقات میں ان کا سلوک ان کی ناکامیوں کی علامت ہے۔ اپنی آخری ملاقات میں، انہوں نے اسے ہتھیار فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ غصے میں اس نے اسماعیل صفوت اور طحہٰ الہاشمی کی طرف متوجہ ہو کر اعلان کیا، "تم غدار ہو، مجرم ہو، اور تاریخ لکھے گی کہ تم نے فلسطین کو کھویا۔[1] " وہ اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ اس کی قسمت شہادت تھی اور اسی طرح یہ ہوا۔

شام سے اخوان المسلمون کے رضاکاروں کی قیادت کرنے والے شیخ مصطفیٰ السبائی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عرب لبریشن آرمی کا قیام بامعنی لڑائی میں حصہ لینے کے لیے نہیں بلکہ سوز زدہ عرب جذبات کو پرسکون کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ لبریشن آرمی نے فلسطین میں ایک بھی سنگین جنگ میں حصہ نہیں لیا، اس کے قائدین کو زمینی صورتحال سے آگاہی کا فقدان تھا، اور اس کا بنیادی مشن عبد القادر الحسینی کی قیادت میں ہولی جہاد آرگنائزیشن کو ختم کرنا تھا[2]۔

مزید برآں، دوسروں نے دلیل دی ہے کہ عرب لبریشن آرمی فلسطینی عوام سے ہتھیاروں، امداد اور عطیات کو روکنے کے لیے ایک آلے کے طور پر کام کرتی ہے۔ اس نے عرب نوجوانوں کے رضاکاروں کی توانائی اور جوش کو جذب کرنے میں بھی کام کیا، تقسیم کے منصوبے پر عمل درآمد کی طرف ان کی کوششوں کو ری ڈائریکٹ کیا۔[3]

اس کے باوجود ان چیلنجوں کے باوجود فلسطینی عوام نے رضاکاروں کے ساتھ مل کر عرب فوجوں کے داخلے سے قبل 82 فیصد فلسطینی اراضی پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔[4]

---

1 عارف المعارف، ج1، 160-61؛ قاسم الریماوی، صفحہ 372-73

2 مصطفٰی السبعی، ص36۔

3 بہجت ابو غربیہ، ص147۔

4 محسن صالح، القدیہ الفلستینیہ، ص61۔

عرب افواج

برطانیہ نے 15 مئی 1948 کو برطانوی افواج کے طے شدہ انخلاء سے پہلے عرب فوجوں کو فلسطین میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ فوجوں نے اس ٹائم لائن کی پابندی کی، حالانکہ اس تاریخ سے پہلے بہت سے اہم شہروں کو برطانیہ نے ترک کر دیا تھا اور بعد میں صیہونیوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہولی جہاد فورسز اور عرب لبریشن آرمی کو اس برطانوی صیہونی ملی بھگت کے سامنے انتہائی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ عرب ریاستوں نے برطانوی انخلاء سے محض دو دن قبل 12 مئی 1948 تک اپنی فوجیں تعینات کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہ تاخیر شروع سے مداخلت کرنے کے حقیقی عزم کی عدم موجودگی کو نمایاں کرتی ہے۔ حقیقت پسندانہ طور پر، جنگ کے لیے متحرک اور حکمت عملی کی منصوبہ بندی کے لحاظ سے صرف دو دنوں میں کیا حاصل کیا جا سکتا ہے؟ مزید برآں، "عرب افواج کی کل تعداد 25,000 جنگجوؤں سے زیادہ نہیں تھی، جبکہ اسرائیلی دفاعی افواج (نئی قائم ہونے والی ریاست کی فوج نے اپنایا ہوا نام) ابتدائی طور پر 35,000 فوجیوں کی تعداد تھی۔ جنگ کے دوران، عربوں اور اسرائیلیوں نے اپنی فوجوں کو مزید تقویت بخشی۔ تاہم، عرب افواج کبھی بھی اسرائیل کے 50 فوجیوں کی تعداد کے قریب نہیں پہنچیں، جو کہ 50 کے مقابلے میں 60 تک پہنچ گئیں۔ جولائی کے وسط میں اور دسمبر 1948 میں 96,000 سے زیادہ تک پہنچ گئی[1]۔

مزید یہ کہ اسلحے اور تربیت میں تفاوت صہیونی طاقتوں کے حق میں بہت زیادہ تھا۔ صہیونی فوج نے برطانوی فوجی تربیت اور ہتھیاروں سے استفادہ کیا، نیز دوسری جنگ عظیم جیسے بڑے تنازعات میں حاصل ہونے والے اہم جنگی تجربے سے۔ اس کے برعکس، عرب فوجیں ناقص لیس اور ناکافی تربیت یافتہ تھیں، جو غیر ملکی تسلط کے تحت کام

[1] یوجین روگن، دی عربز: اے ہسٹری، صفحہ 343 [عربی ایڈ۔]۔

کرنے والی نوزائیدہ افواج پر مشتمل تھیں۔ یہ فوجیں صرف سطحی آزادی کے ساتھ ریاستوں کی نمائندگی کرتی تھیں، جن میں حقیقی خود مختاری یا پائیدار فوجی مصروفیت کے لیے ضروری وسائل کی کمی تھی۔[1]

صہیونی ملیشیاؤں نے معلومات کے لحاظ سے ایک اہم فائدہ اٹھایا، زمین پر رہتے اور تربیت حاصل کی۔ ان کے انٹیلی جنس نیٹ ورک 30 سالوں سے خطوں اور آبادی کا ڈیٹا اکٹھا کر رہے تھے، جس سے وہ گاؤں پر قبضہ کرنے کے لیے تفصیلی منصوبے تیار کر سکے۔ اس کے بالکل برعکس، عرب فوجوں کے پاس فلسطین کے حالات کے بارے میں بھی ابتدائی معلومات کی کمی تھی۔ مصری اخوان المسلمون کے رضاکاروں کے کمانڈر محمود الصباغ کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے مصری فوج کی قیادت سے نقشے مانگے تو انہوں نے انہیں 30 سال پہلے کے پرانے نقشے فراہم کیے تھے[2]۔ یہ نقشے مکمل طور پر بیکار تھے، کیونکہ نئی سڑکوں، بستیوں اور یہودیوں کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے ساتھ زمین کی تزئین یکسر بدل گئی تھی۔ نتیجے کے طور پر، رضاکاروں کو شروع سے انٹیلی جنس جمع کرنے پر مجبور کیا گیا تھا.

مزید برآں، عرب افواج کو صیہونی افواج کے برعکس سیاسی، مالی اور فوجی مدد کی کمی کا سامنا کرنا پڑا، جنھیں بڑی طاقتوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ سیاسی طور پر صہیونیوں کو بین الاقوامی تنظیموں اور حتیٰ کہ عرب حکمرانوں کی راہداریوں میں بھی حمایت حاصل رہی۔ مالی طور پر، انہوں نے کھلے سمندری راستوں پر سرمایہ کاری کی جس سے یہودی سرمائے کے بلاتعطل بہاؤ میں مدد ملی۔ فوجی طور پر، ضرورت پڑنے پر کمک اور مدد آسانی سے قابل رسائی تھی۔

آخر کار، ان فوجوں میں اعتماد، ہم آہنگی، یا جنگ میں مقصد کے ایک متحد احساس کی بھی بنیادی سطح کی کمی تھی۔ ایک برطانوی مؤرخ نے مشاہدہ کیا، "اگر عرب مداخلت کو معمولی حد تک ہم آہنگی، پیشگی منصوبہ بندی، اعتماد کی

[1] فلسطین میں مصری اخوان المسلمون کے رضاکاروں کی قیادت کرنے والے محمود الصباغ نے بتایا کہ مصر کے مغربی صحرا اور دوسرے مقامات جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران لڑائیوں کا مشاہدہ کیا تھا اس دور سے لاوارث ہتھیاروں اور گولہ بارود سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے نوٹ کیا کہ یہ بڑی مقدار عرب فوجوں کو پانچ سال کی لڑائی کے لیے فراہم کر سکتی تھی اگر وہ ان کو استعمال کرنے کی خواہش رکھتے۔ دیکھیں محمود الصباغ، خفیہ تنظیم کے بارے میں سچائی اور اخوان المسلمین کی تحریک میں اس کا کردار، صفحہ۔ 170.

[2] محمود الصباغ، ص177۔

جھلک اور مشترکہ مقصد سے بھی خصوصیت حاصل ہوتی تو شاید عرب افواج فتح حاصل کر سکتیں۔ اس کے بجائے، عرب یہودی ریاست سے لڑنے سے زیادہ ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے فلسطین میں داخل ہوئے۔[1] تنظیم کا یہ فقدان مضحکہ خیز اور تقریباً ناقابل یقین حالات کا باعث بنا۔ مثال کے طور پر عراقی فوج کو ٹینکوں سے لیس پہاڑی علاقے میں تعینات کیا گیا تھا جو اس علاقے میں ناکارہ تھے، جب کہ مصری فوج بغیر کسی ٹینک کے کھلے علاقوں میں لڑ رہی تھی۔ اسی طرح عراقی فوج کے پاس 25 پاؤنڈ کے توپ خانے کے ٹکڑے تھے لیکن گولہ بارود نہیں تھا، جب کہ مصری فوج کے پاس ایسے توپ خانے کے لیے گولہ بارود تھا لیکن اس کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے بندوقیں نہیں تھیں۔[2]

طاقت میں یہ سخت تفاوت کسی بھی جنگ کے توازن کو فیصلہ کن طور پر تبدیل کرنے کے لیے کافی تھے۔ یہاں تک کہ جوش، لگن اور بہادری سے بھری فوج سے بھی ایسے حالات میں عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نتیجہ کتنا برا ہو گا جب یہی فوجیں اضافی اندرونی ناکامیوں اور تباہی کے اسباب سے بوجھل ہوں گی؟

1948 کی جنگ سب سے زیادہ المناک اور عجیب و غریب تنازعات میں سے ایک تھی، جو اس کہاوت کی مظہر تھی کہ "تم نہیں جانتے کہ ہنسنا ہے یا رونا ہے!" پہلے سے سنگین حالات کے علاوہ، مزید ستم ظریفی اور تباہ کن عوامل تھے، بشمول:

1. اردنی فوج کے ماتحت قیادت: عرب فوجیں اردن کی فوج کے ماتحت تھیں، حالانکہ اردن کے بادشاہ نے تقسیم کے منصوبے کو قبول کر لیا تھا۔ تقسیم کی حمایت کرنے والا شخص اس کے خلاف جنگ کیسے لڑ سکتا ہے، خاص طور پر جب اس کا مقصد عربوں کے نامزد کردہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا تھا۔

---

[1] یوجین روگن، صفحہ 335۔

[2] محمود شیث خطاب، ارادت القتال فی الجہاد الاسلامی (اسلامی جہاد میں لڑنے کی خواہش)، صفحہ 39

2. اردنی فوج کی برطانوی کمان: اردنی فوج کی کمان خود برطانوی افسروں کے ہاتھ میں تھی، جس میں ایک برطانوی افسر گلوب پاشا تھا جو صیہونیوں سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اس طرح وہ عرب فوجیں جو فلسطین کو صیہونی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے داخل ہوئیں، وہ ایک برطانوی افسر کی سربراہی میں تھیں۔

3. برطانوی مسلح عرب فوجیں: بنیادی عرب فوجیں مصری، عراقی اور اردنی برطانوی ہتھیاروں اور گولہ بارود سے لیس تھیں۔ یہ فوجیں برطانوی قبضے کے دوران قائم کی گئی تھیں، اور ان کے ہتھیاروں کو برطانیہ کے مکمل علم اور محتاط حساب کتاب کے ساتھ فراہم کیا گیا تھا، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ یہ صیہونیوں کے لیے حقیقی خطرہ نہیں بنیں گے۔

4. عرب فوجوں نے سیاست دانوں کی طرف سے جاری کردہ سیاسی ہدایات پر سختی سے عمل کیا جو خود برطانوی قابضین کے تابع تھے۔ ان کے اعمال کا حکم حکم کے مطابق کیا گیا تھا: جب حکم دیا گیا تو وہ آگے بڑھے اور جب ہدایت دی گئی تو پیچھے ہٹ گئے، کسی بھی تحریک کے لیے میدان جنگ کی حکمت عملی کی منصوبہ بندی کیے بغیر۔ بعض اوقات جب حالات ان کے حق میں ہوتے تو اقوام متحدہ جنگ بندی نافذ کرنے کے لیے مداخلت کرتی، جسے عرب حکومتوں اور فوجوں نے فوری طور پر مان لیا۔ اس وقفے نے صیہونیوں کو دوبارہ منظم اور مضبوط ہونے کا موقع دیا، جنگ بندی کے بعد زیادہ تعداد اور بہتر آلات کے ساتھ واپس لوٹے۔ دریں اثنا، عرب فوجیں جنگ بندی کی شرائط کی پابند، غیر متحرک اور مفلوج رہیں۔

5. ان میں سے بہت سی فوجوں نے فلسطینی آبادی کے ساتھ ایک معاون اڈے کے بجائے ایک ذمہ داری کا سلوک کیا۔ فوجیوں کا گاؤں کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے کے بہانے گائوں میں داخل ہونا اور ہتھیاروں کو ضبط کرنا ایک عام سی بات تھی۔ تاہم، جب ان فوجوں کو صیہونی ملیشیا نے شکست دی، تو دیہات بے آسرا رہ گئے، وہاں کے باشندے قتل عام کے خوف سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ [1]

---

[1] تاریخ نے اس موقف کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ نیز، احمد منصور، صفحہ 37 دیکھیں۔

6. جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، فلسطینی مزاحمتی قوتوں نے اکثر اس بات کو ترجیح دی کہ سرکاری فوجیں تنازع میں براہ راست مداخلت سے گریز کریں۔ اس کے بجائے، انہوں نے عرب ریاستوں سے مقامی آبادی کو مالی اور فوجی مدد فراہم کرنے کی وکالت کی، جو علاقے سے زیادہ واقف تھے۔ یہ نقطہ نظر صہیونیوں کو عالمی سطح پر تنازعہ کا فائدہ اٹھانے سے بھی روکے گا تاکہ وہ خود کو ایک چھوٹی، کمزور ریاست کے طور پر پیش کر کے مزید مالی اور سیاسی حمایت حاصل کر سکیں جو بڑی اور بہتر لیس عرب فوجوں کے حملے کی زد میں ہے۔[1]

اس طرح، یہ اندازہ لگانا بہت ضروری ہے کہ اس طرح کے حالات میں کام کرنے والے دو فریقوں کے درمیان تنازعہ کیسے جنم لے سکتا ہے۔

اردن کے شاہ عبداللہ نے "صہیونی" کے طور پر شہرت حاصل کی، بین گوریون نے انہیں "دانشمند حکمران" کے طور پر بیان کیا[2]۔ اس نے صیہونی رہنماؤں کے ساتھ متعدد خفیہ ملاقاتیں کیں[3]، جس کے دوران اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑیں گے۔ اس نے اس وعدے کو ایک اعرابی ہاشمی بادشاہ کے اٹوٹ عہد کے طور پر پیش کیا اور اسے ایک عورت کے لیے دی گئی نذر سے تشبیہ دی۔

مزید بر آں، 1948 کی جنگ میں اردن کی شرکت 17 فروری 1948 کو لندن میں ایک خفیہ میٹنگ میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں اردن کے وزیر اعظم توفیق ابو الہدا، اردنی فوج کے برطانوی کمانڈر گلوب پاشا اور برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون شامل تھے[4]۔ شاہ عبداللہ کے عزائم عربوں کے لیے مختص فلسطین کے حصے کو الحاق کرنے سے آگے بڑھ گئے۔ اس کی دھوکہ دہی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے لبنانی عیسائیوں کے ساتھ مل

Ibid., p.38[1]

[2] میناچیم بیگن، .p.334

[3] عبداللہ الطال، قرطاس فلستین: مذکرات عبداللہ الطیل قدمار قات القدس، ص64 ایف۔ حرب فلستین: الروایاہ الاسرائیلیہ الرسمیہ، ص224؛ طٰہٰ الھاشمی، ج2، ص180

[4] مریم ولسن، صفحہ 12

کر لبنان میں ایک عیسائی ریاست قائم کی جس کے بدلے میں ملک کے مسلم اکثریتی علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔[1]

عرب فوجوں کی حکمت عملی ابتدائی طور پر عمان میں وضع کی گئی تھی، صرف اسے تبدیل کرنے، نظر ثانی کرنے اور بالآخر اس کی اصل شکل میں واپس لانے کے لیے۔ یہ بار بار تبدیلیاں اس وقت ہوئیں جب فوجوں نے پہلے ہی ترمیم شدہ منصوبوں کی بنیاد پر پیش قدمی شروع کر دی تھی، جس کے نتیجے میں الجھنیں اور بکھری کوششیں ہوئیں۔ اس انتشار نے نہ صرف بداعتمادی کو ہوا دی بلکہ غیر مربوط اور ناقص متحد قوتوں کو منظم اور اچھی طرح سے تیار صہیونی ملیشیاؤں کے لیے آسان اہداف کے طور پر چھوڑ دیا جس کا انہیں سامنا تھا۔

افراتفری میں اضافہ کرتے ہوئے، گلوب پاشا نے جان بوجھ کر اردنی افواج کو یروشلم میں داخل ہونے سے روکا، جس سے صیہونیوں کو شہر پر کنٹرول حاصل کرنے اور تنازعہ کے توازن کو اپنے حق میں منتقل کرنے کا ایک اہم موقع فراہم ہوا۔ اس کے نتیجے میں پُر تشدد اور بھیانک دنوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جسے اب یروشلم میں "پانچ سرخ دن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نتیجتاً، صہیونیوں نے مغربی یروشلم پر قبضہ کر لیا، اور اقوام متحدہ کی تقسیم کے منصوبے کو مؤثر طریقے سے منسوخ کر دیا، جس نے اس شہر کو بین الاقوامی سطح پر زیر انتظام علاقہ قرار دیا تھا۔ اس قبضے نے تقریباً 60,000 فلسطینیوں کی جبری نقل مکانی کو بھی متحرک کیا، جس سے تنازعہ کے المیے میں مزید اضافہ ہوا۔

اردنی فوج کی کارروائیاں نہ تو صیہونیوں کے ساتھ تصادم تھی اور نہ ہی مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کی کوشش تھی۔ اس کے بجائے، وہ مغربی کنارے کے علاقوں پر قبضہ کر کے تقسیم کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ مرکوز کر رہے تھے تاکہ انہیں سلطنت اردن سے الحاق کیا جا سکے۔ درحقیقت، فوج اسرائیل کے قیام کے منصوبے پر عمل پیرا تھی جیسا کہ بین الاقوامی طاقتوں نے بیان کیا تھا اور جیسا کہ شاہ عبداللہ، صیہونیوں اور برطانیہ

[1] طہ الہاشمی، ج2، ص182

کے درمیان طے پایا تھا۔ بعض ذرائع سے ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اردنی فوج نے ایک ایک کر کے براہ راست پوزیشنیں صہیونی افواج کے حوالے کر دیں۔[1]

اردنی فوج نے اپنے برطانوی افسران سمیت یروشلم کے پرانے شہر اور مسجد اقصیٰ پر قبضے کی کوششوں کو فعال طور پر ناکام بنا دیا۔ اس وقت برطانوی پالیسی کو تشویش تھی کہ صہیونیوں کے ہاتھوں مسجد الاقصیٰ کے نقصان سے عرب دنیا اور ہندوستان میں مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر غم و غصہ پھیل سکتا ہے۔[2]

مصری فوج، جو جنوب سے داخل ہوئی، کو حکم دیا گیا کہ وہ براہ راست یروشلم کی طرف بڑھیں۔ صہیونی افواج نے کوئی مزاحمت پیش نہ کرتے ہوئے انہیں گزرنے دیا۔ تاہم، جیسے ہی مصری افواج یروشلم کے قریب پہنچی، ان پر ان بستیوں کے فوجیوں نے گھات لگا کر حملہ کر دیا جو انہوں نے پیچھے چھوڑے تھے - ایک سادہ ترین فوجی جال، اتنا واضح ہے کہ ایک بچہ بھی اس سے بچ سکتا تھا۔ مصری فوج بکھر گئی، کچھ یونٹوں کو گھیر لیا گیا اور اس کی نقل و حرکت مفلوج ہو گئی۔ بعد میں، انخلاء کے احکامات دیے گئے، اور پسپائی کو ایک مشکل اور لمبے انداز میں انجام دیا گیا، حالانکہ فوج کے لیے اسرائیلیوں کو گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اپنے فرار کا راستہ خود نکالنا بہت آسان ہوتا۔[3]

ان فوجوں نے فلسطینیوں کی یادداشت پر انمٹ نقوش چھوڑے، بعض لمحات گہرے طور پر جڑے ہوئے تھے، جیسے کہ جب بھی فلسطینی مدد کے لیے پکارتے ہیں تو عراقی فوج کی طرف سے بار بار جواب دیا جاتا ہے: "ماکو عومر" (ہمیں کوئی حکم نہیں ہے)، یعنی "ہم آپ کی مدد کرنے کے مجاز نہیں ہیں"۔[4]

جب کہ ان فوجوں کے کچھ یونٹوں نے ہمت کا مظاہرہ کیا، زبردست لڑائی کی، اور قابل ذکر لڑائیوں میں مصروف تھے، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سیاسی ہدایات کی خلاف ورزی کی یا میدان جنگ کی حقیقتوں کی وجہ سے اعلیٰ کمان سے آزادانہ طور پر کام کرنے پر مجبور ہوئے۔[5] بدقسمتی سے ان جنگجوؤں نے جو بھی فتوحات حاصل کیں وہ بالآخر

[1] عبداللہ عزام، الذخائر الاعظام، جلد 1، صفحہ 835

[2] منیر شفیق، من جمر الاجمر: صفات من مدخرات منیر شفیق، صفحہ 49-50

[3] احمد منصور، ص36

[4] عبداللہ عزام، ج1، ص835، 847؛ احمد جبریل، ذکر التراث، ص217

[5] ان میں سے کچھ بہادری کے کام تھے جو تقریباً مافوق الفطرت لگتے تھے۔ ایک اہم مثال احمد منصور، صفحہ 35-36 ہے۔

خود عرب حکومتوں نے انخلاء کے احکامات، سٹریٹجک پلان میں تبدیلی، پیش قدمی روکنے، جنگ بندی کے معاہدوں پر عمل کرنے[1]، یا مصر میں اخوان المسلمون جیسے جنگجوؤں کو قید کرنے یا واپسی کے حکم سے انکار کرنے والے عراقی رہنماؤں کے خلاف مقدمہ چلانے کے ذریعے ختم کر دیا۔[2]

لڑائی کا پہلا مرحلہ عربوں کے لیے سب سے زیادہ ساز گار تھا اور اسرائیلیوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن تھا، باوجود اس کے کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسرائیلیوں کو افراتفری میں ڈال دیا گیا، ایک ہی وقت میں کئی محاذوں پر لڑنا پڑا۔ اس نازک لمحے میں، سیاسی مداخلت اقوام متحدہ کی قرارداد کی شکل میں سامنے آئی، جس میں ایک مقررہ مدت کے لیے جنگ بندی کا مطالبہ کیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ اسلحے کی پابندی بھی۔ عرب رہنماؤں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جنگ بندی پر عمل کیا۔ تاہم، اسرائیلیوں نے اقوام متحدہ کی قرارداد کی براہ راست خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی صفوں کو مضبوط کرنے اور اپنی افواج کو دوبارہ سپلائی کرنے کے لیے جنگ بندی کا فائدہ اٹھایا۔ پہلی جنگ بندی ختم ہونے تک صیہونیوں نے صورتحال پر دوبارہ کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ لڑائی دوبارہ شروع ہوئی، اور انہوں نے شامی اور لبنانی فوجوں کو شکست دے کر شمالی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اردنی فوج سے لدہ اور رملہ کے شہروں پر بھی قبضہ کر لیا اور اپنی توجہ جنوب میں مصری محاذ کی طرف مرکوز کر دی۔ اس کے بعد، اقوام متحدہ نے ایک اور طویل جنگ بندی نافذ کی، جو تین ماہ تک جاری رہی (19 جولائی سے 14 اکتوبر تک)۔ اسرائیلیوں نے اس مدت کو اپنی افواج کو مزید تقویت دینے اور اپنے سامان کو بھرنے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے شامی اور لبنانی افواج کو شمال کی طرف دھکیلنا جاری رکھا، اور مصری افواج نے جنوب کی طرف، بالآخر خلیج عقبہ کے قریب مصری سرزمین پر قبضہ کر لیا، خاص طور پر ام الرشرش کے گاؤں پر۔ اس کے بعد، افواج کے درمیان سرحدوں کی حد بندی جنگ بندی کے معاہدوں کے ذریعے کی گئی، جس نے مؤثر طریقے سے اسرائیل کو زمین پر ایک مستقل حقیقت کے طور پر قائم کیا۔

[1] محمود الصباغ، ص183

[2] عبداللہ عزام، ج1، ص834

دریں اثنا، مصری حکام نے رضاکاروں کے ذریعے جمع کیے گئے ہتھیاروں اور آلات کو اپنے قبضے میں لے لیا،[1] جس سے عرب فوجوں کی شکست کے بعد کسی بھی طرح کی مزاحمت کو مؤثر طریقے سے روکا گیا۔

اس طرح فلسطین گر گیا۔ اس سانحہ میں شریک کاروں کا کردار اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ صہیونیوں یا غاصبوں کا۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ عزام نے بجا طور پر کہا ہے کہ "صرف پانچ مہینوں میں یہودیوں نے پچھلے پچاس سالوں میں جتنا قبضہ کیا تھا اس سے پانچ گنا کمایا۔"[2]

نکبہ کا حتمی نقصان 531 فلسطینی دیہاتوں اور قصبوں کی تباہی تھا،[3] جس کے نتیجے میں اسرائیل نے تقریباً 78 فیصد فلسطینی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل نے فوجی فتح کے ذریعے اقوام متحدہ کی تقسیم کے منصوبے کے ذریعے مختص کردہ 55 فیصد سے زیادہ علاقہ حاصل کیا۔ گویا عرب فوجیں اسرائیلیوں کے خلاف نہیں بلکہ ان کے نصب العین کی حمایت میں لڑ رہی ہیں، نادانستہ طور پر صہیونی منصوبے کو آگے بڑھا رہی ہیں!

مزید بر آں، جنگ مہاجرین کا تباہ کن المیہ لے کر آئی، جس میں 58٪ فلسطینی آبادی (805,076 افراد) بے گھر ہو گئی۔ بہت سے لوگوں کے لیے، بھاگنا ہی واحد دستیاب آپشن تھا، کیونکہ وہ غیر مسلح، تھکے ہوئے لوگ تھے جو بھاری مسلح اور بے رحم صیہونی ملیشیاؤں کا سامنا کر رہے تھے۔ اس وقت، فلسطینیوں میں مروجہ عقیدہ یہ تھا کہ عرب ریاستیں اس ناانصاف کو قائم نہیں رہنے دیں گی۔ انہیں امید تھی کہ عرب فوجیں مداخلت کریں گی، صیہونی ملیشیا کو نکال دیں گی، اور انہیں ان کے گھروں میں بحال کریں گی۔ اپنے دیہاتوں سے ان کی روانگی کو ہتھیار ڈالنے یا شکست کے طور پر نہیں دیکھا گیا بلکہ اسے دو عوامل سے چلنے والے فیصلے کے طور پر دیکھا گیا: ایک طرف ان کی اپنی کمزوری اور بے بسی، اور دوسری طرف عرب ریاستوں کے وعدوں سے متاثر امید[4] یہ نوٹ کرنا بہت ضروری ہے کہ عرب فوجوں کے داخل ہونے سے پہلے ہی نصف پناہ گزینوں کو ان کے دیہاتوں سے نکال دیا

[1] محمود الصباغ، ص89 الیف

[2] عبداللہ عزام، ج1، ص837۔

[3] الان پاپے، صفحہ 3، سلمان ابو سیطہ، حق العودہ (واپسی کا حق)، صفحہ 8۔

[4] صلاح خلاف، p.32

گیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ پناہ گزینوں کا بحران جنگ کا براہ راست نتیجہ نہیں تھا بلکہ صیہونی حملے اور اس کے متعدد قتل عام کا نتیجہ تھا، جس کی حمایت برطانوی ملی بھگت تھی۔

مہاجرین تین سمتوں میں منتشر ہوئے: غزہ کی پٹی، مغربی کنارے، اور فلسطین سے آگے کی منزلیں، جیسے اردن، شام، لبنان، اور دیگر ممالک۔ فلسطین غزہ کے بقیہ حصے (فلسطین کے کل رقبے کا 1.3٪) اور مغربی کنارے (21.5٪) کو فلسطینیوں کے حوالے کرنے کے بجائے پڑوسی ریاستوں نے تیزی سے اپنے ساتھ الحاق کر لیا۔ مصر نے غزہ کی پٹی پر قبضہ کر لیا جبکہ اردن نے مغربی کنارے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردنی حکومت نے لدا (اللد) اور رملہ کو چھوڑ دیا، جب کہ مصری حکومت نے غزہ کی پٹی کے ان حصوں کو ہتھیار ڈال دیے جو اسرائیلیوں نے جنگ میں نہیں لیے تھے بلکہ مصری نمائندے کے مذاکرات کے دوران انہیں دے دیا گیا تھا[1]۔ مزید برآں، مصر نے ام الرشش گاؤں کو چھوڑ دیا، اسرائیل کو بحیرہ احمر تک سمندری راستہ فراہم کیا۔

اردن کے ذریعہ مغربی کنارے کے الحاق کی زیادہ تر فلسطینیوں نے مخالفت نہیں کی۔ اس کے برعکس، کچھ لوگوں نے اسے تحفظ کی ایک شکل کے طور پر دیکھا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ باقی ماندہ فلسطینی علاقوں کو بغیر دعوی کے نہیں چھوڑا جائے گا، جیسا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا جب عثمانی تحفظ تحلیل ہو گیا تھا۔ اسی طرح، جس طرح یروشلم میں پہلی عرب کانگریس میں فلسطینی رہنماؤں اور معززین نے ایک بار فلسطین کے شام کے ساتھ الحاق کا مطالبہ کیا تھا، اسی طرح مغربی کنارے کے الحاق کو شاہ عبداللہ کے جزوی طور پر انجینئر ہونے کے باوجود فلسطینی معززین اور رہنماؤں نے بنیادی طور پر مسترد نہیں کیا۔

جو لوگ الحاق کے بارے میں خوفزدہ تھے یا اس کی مخالفت کرتے تھے وہ بنیادی طور پر شاہ عبداللہ کی پالیسیوں کے بارے میں فکر مند تھے، کیونکہ ان کی ساکھ برطانویوں کے ایک مستحکم اتحادی کے طور پر تھی۔ ان کی مخالفت کی جڑ عرب یا اسلامی اتحاد کی مزاحمت میں نہیں بلکہ بادشاہ کے مقاصد پر عدم اعتماد تھی۔

[1] سلیمان ابو سیطہ، کیف قدمت اسرال قطاغزہ فی اتفاقیہ سریہ (اسرائیل نے ایک خفیہ معاہدے میں غزہ کی پٹی پر کیسے تجاوز کیا)؟ الحیاۃ اخبارات، لندن، مارچ 28، 2009

1948اور1967کے درمیان فلسطین

اسرائیل کی پوزیشن

صہیونی ریاست کے قیام کے بعد، اسے فوری طور پر بڑی بین الاقوامی طاقتوں نے تسلیم کرلیا، جن میں اس وقت کی عالمی سپر پاورز امریکہ اور روس شامل ہیں، اس کے بعد یورپی ممالک بھی شامل ہیں۔ اپنے آغاز سے ہی اسرائیل نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا۔ بین گوریون کے ابتدائی اقدامات میں سے ایک یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دینا تھا، یہ فیصلہ اس کے بین الاقوامی اتحادیوں بشمول صیہونیوں کی حمایت کرنے والوں کی خواہشات کے خلاف تھا۔ اس کے باوجود، بین گوریون نے اپنے سرپرستوں کے اعتراضات کو نظر انداز کرتے ہوئے، حکومتی ہیڈ کوارٹر اور وزارتوں کو یروشلم منتقل کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

تل ابیب میں صرف وزارت خارجہ ہی رہ گئی، کیونکہ سفارت خانے اور سفارتی مشن وہاں کام کرتے رہے۔ نتیجتاً، یروشلم شروع سے ہی اسرائیل کا ڈی فیکٹو دارالحکومت بن گیا، جو ملک کے انتظامی مرکز کے طور پر کام کرتا ہے، جبکہ تل ابیب نے سرکاری دارالحکومت کے طور پر اپنی حیثیت برقرار رکھی۔ منتقلی تیز تھی؛ وزراء نے یروشلم جانے کے لیے جلدی کی، اور گولڈا میئر کو، مثال کے طور پر، عارضی طور پر چھت پر ایک کمرے میں رہنا پڑا جب تک کہ مناسب وزارتی رہائش گاہ تیار نہ ہو جائے۔

سیاسی سطح پر، اسرائیل نے اپنے قدم جمانے اور اپنے وجود کو ایک ناقابل تردید حقیقت کے طور پر مستحکم کرنے کے لیے انتھک محنت کی۔ اس وقت سے آگے، سلامتی کے خدشات اس کی اولین ترجیح بن گئے، جس سے اس کی پالیسیوں اور اقدامات کی تشکیل ہوئی۔

سیاسی میدان میں، اسرائیل نے عالمی سطح پر خود کو ایک ناقابل تردید حقیقت کے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، اپنی موجودگی کو قائم کرنے اور مستحکم کرنے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ اس کے آغاز سے ہی، سلامتی کے خدشات اس کی پالیسیوں کی بنیاد تھے۔

زمین کے اصل باشندوں کے کافی حصے کی نقل مکانی پر قائم ہونے کے بعد، اسرائیل نے ان بے گھر آبادیوں میں خوف و ہراس پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ ان کی سرزمین پر دوبارہ دعویٰ کرنے یا اسرائیل کی سرحدوں کے اندر اب دراندازی کرنے والی کسی بھی کوشش کو روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔

ایک ایسی عرب دنیا سے گھری ہوئی جس نے اپنے وجود کو بڑے پیمانے پر مسترد کر دیا اور اس کے خاتمے کی کوشش کی، اسرائیل نے اپنی فوجی طاقت اور اپنے دفاع کی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر توجہ دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، عرب ممالک کی ٹوٹی پھوٹی ریاست نے اسرائیل کو مضبوطی سے آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کی، اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے اور یہاں تک کہ مغربی کنارے اور غزہ میں فلسطین کے بقیہ حصوں سمیت اضافی علاقوں کو بھی الحاق کرنے کی خواہش کی۔

اس مقصد کے لیے اسرائیل نے مغربی کنارے، غزہ، شام اور اردن پر متعدد حملے کیے، جس کے نتیجے میں بہت سے شہری، پولیس افسران اور فوجی مارے گئے۔ یہاں تک کہ اس نے ان لوگوں کی لاشوں کو مسخ کرنے کا سہارا لیا جن پر اس نے 1948 میں قبضہ کر لیا تھا[1].

اسرائیل کی سب سے اہم اور دور رس فوجی کارروائیوں میں سے ایک اس کا 1956 میں جزیرہ نما سینائی پر مصری سرزمین کے اندر بڑے پیمانے پر حملہ تھا۔ اس آپریشن نے ایک تنازعہ کا آغاز کیا جس نے صدر جمال عبدالناصر کی جانب سے سویز کینال کمپنی کو قومیانے کے اعلان کے بعد برطانوی اور فرانسیسی مداخلت کا بہانہ فراہم کیا۔ ناصر کی حکومت کی کمزوریوں اور بدعنوانی کو فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیل نے سینائی میں پیش قدمی کی۔ دریں اثنا، برطانوی اور فرانسیسی افواج نے سوئز کینال کے علاقے پر تیزی سے قبضہ کر لیا، مصری فوج کو زبردست دھچکا پہنچا۔ اس جارحیت کو، جسے سویز بحران یا سہ فریقی جارحیت کہا جاتا ہے، کو امریکہ اور سوویت یونین دونوں کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں سپر پاورز نے اس خطے میں پرانی نو آبادیاتی طاقتوں برطانیہ اور فرانس

[1] مزید تفصیلات کے لیے، رپورٹ دیکھیں: اسرائیل کی جنگ بندی کی خلاف ورزیاں، جو نیویارک میں عرب لیگ کے دفتر سے شائع ہوئی اور 1955 میں قاہرہ میں جاری ہوئی۔ رپورٹ میں 1949-1954 کے سالوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کے دوبارہ وجود میں آنے کے خلاف مزاحمت کی۔ امریکہ نے سہ فریقی جارحیت کے خلاف بہت زیادہ سفارتی دباؤ ڈالا، بالآخر تمام فریقوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

برطانوی اور فرانسیسی افواج کی حتمی پسپائی کے باوجود، اسرائیل نے خطے میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرتے ہوئے، تنازعہ سے کئی اہم اور سٹریٹیجک فوائد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ سب سے اہم فوائد میں سے یہ ہیں:

1. کامیاب حیرت انگیز حملوں کے لیے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ: سب سے بڑے عرب ملک مصر پر حملہ، سب سے بڑی عرب فوج کے ساتھ، جولائی کے انقلاب کی فوجی حکومت کا پہلا امتحان تھا۔ اس حکومت نے کئی وجوہات کی بنا پر انقلاب برپا کرنے کا دعویٰ کیا تھا، ان میں سے اہم وجہ فلسطین ہے۔ تاہم، جنگ نے اس طرح کے وعدوں کو پورا کرنے میں اپنی نااہلی کو ظاہر کر دیا۔
2. خلیج عقبہ میں نیویگیشن کی آزادی کے حق کا تحفظ: یہ اہم آبی گزرگاہ اسرائیل کو جنوبی نصف کرہ سے جوڑتی ہے۔ جبکہ اسرائیل پہلے ہی خلیج کے شمالی سرے پر ایلات پر کنٹرول رکھتا تھا، اس کے جنوبی حصے کو مصر کے دو جزیروں نے مسدود کر دیا تھا۔ اس جنگ کے ذریعے، اسرائیل نے مقبوضہ علاقے سے دستبرداری کے بدلے آزادانہ نقل و حرکت کا حق حاصل کر لیا، ایک ایسی رعایت جس پر مصری عوام نے زیادہ تر توجہ نہیں دی تھی۔
3. مصر-اسرائیل سرحد پر بین الاقوامی افواج کو تعینات کرنا: اس تعیناتی نے مؤثر طریقے سے مصر کو اسرائیل کے خلاف اچانک حملہ کرنے سے روک دیا۔ کسی بھی منصوبہ بند مصری جارحیت کے لیے ان بین الاقوامی افواج کو مطلع کرنے یا ان کی روانگی کی درخواست کی ضرورت ہوگی، جس سے بین الاقوامی طور پر محفوظ فوجیوں کے خلاف حملہ کرنا انتہائی ناممکن ہے۔

اسرائیل بھی غزہ کو بین الاقوامی نگرانی میں رکھنے کے قریب پہنچ گیا۔ تاہم، غزان کے اسلام پسندوں کی قیادت میں وسیع پیمانے پر ہونے والے مظاہروں نے بالآخر اس بات کو یقینی بنایا کہ یہ پٹی مصری خودمختاری کے تحت رہے۔[1]

1956 کی جنگ کے ذریعے، اسرائیل نے اپنی علاقائی طاقت اور اثر ورسوخ کو مضبوط کیا، اپنی سٹریٹجک اہمیت کو بڑھایا، اور اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو دلیری سے ظاہر کیا۔ جنگ نے انکشاف کیا کہ اسرائیل 1948 کے علاقائی فوائد سے مطمئن نہیں تھا۔ سینائی پر قبضہ کرنے میں نسبتاً آسانی نے اسرائیل کو مزید حوصلہ بخشا، جس نے 1967 میں اپنے اقدامات کی راہ ہموار کی۔

اس عرصے کے دوران اسرائیل کی سب سے خطرناک حکمت عملیوں میں سے ایک انتہائی حساس عہدوں پر تعینات ایجنٹوں کے ذریعے عرب حکومتوں میں دراندازی تھی۔ سب سے نمایاں افراد میں شام میں نائب صدر کے عہدے پر فائز ہونے والے ایلی کوہن اور جمال عبدالناصر کے داماد اور ان کے پرسنل انفارمیشن سیکرٹری اشرف مروان شامل تھے۔ دونوں نے 1967 کی جنگ (جسے اکثر دوسری تباہی کہا جاتا ہے) اور 1973 کی اکتوبر جنگ کے دوران اسرائیل کو اہم انٹیلی جنس فراہم کرنے میں اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

دو تباہیوں کے درمیان فلسطین کی ریاست

برطانوی تسلط کے تحت، فلسطینی معاشرے میں ایک الگ فلسطینی تشخص ابھرنے لگا۔ تاہم، اس دور میں اسلامی شناخت اور یکجہتی کے ساتھ اجتماعی وابستگی میں بھی واضح کمی دیکھنے میں آئی، جس کا کئی عوامل سے پتہ لگایا جا سکتا ہے:

1. اسلامی خلافت کے زوال کے بعد پوری مسلم دنیا میں اسلامی تشخص کا زوال۔ زیادہ تر مسلم اکثریتی ممالک پر غیر ملکی طاقتوں کے قبضے یا ان کے براہ راست غیر ملکی اثر ورسوخ کے تابع ہونے سے اس میں اضافہ ہوا۔

[1] احمد منصور، صفحہ 48-49۔

2. پورے خطے میں سیکولرازم کا عروج، جو دو غالب نظریات کے درمیان منقسم تھا: سوشلسٹ کمیونزم سوویت کی زیر قیادت مشرقی بلاک کے ساتھ منسلک، اور سرمایہ دارانہ لبرل ازم نے امریکی زیر قیادت مغربی بلاک کے ساتھ اتحاد کیا۔

3. قوم پرستی کا عروج، جیسا کہ وسیع تر اسلامی دنیا نئی تشکیل شدہ قومی ریاستوں میں بٹ گئی۔ ان ریاستوں نے منفرد قومی شناخت کو فروغ دیتے ہوئے الگ الگ جھنڈے، آئین اور قانونی ڈھانچہ اپنایا۔ اپنی آزادی پر زور دینے کے لیے، انھوں نے اکثر نوادرات اور قدیم ورثے کو تلاش کر کے تاریخی داستانیں تیار کرنے کی کوشش کی، اس طرح الگ الگ قومی تاریخیں تیار کیں۔

یہ تین عناصر - اسلامی خلافت کی عدم موجودگی، سیکولرازم کا پھیلاؤ، اور قوم پرستی کی جڑیں باہمی طور پر تقویت دینے والے انداز میں کام کرتی تھیں۔ ہر ایک کو غیر ملکی طاقتوں کے زبردست اثر ورسوخ کی حمایت اور برقرار رکھا گیا، اور ان کے اجتماعی اثرات کو مزید مضبوط کیا۔

تاہم، غالب اسلامی بندھن سے وابستگی کی یہ عمومی کمزوری، فلسطینیوں کے معاملے میں، وسیع تر عرب شناخت سے الگ خالص قومی شناخت کی طرف بڑھنے کی نشاندہی نہیں کرتی ہے۔ فلسطینی عوام اپنے وطن کی آزادی کو ایک مشترکہ عرب ذمہ داری کے طور پر دیکھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ فلسطین میں عرب کی کوششیں خیرات یا امداد کے کام نہیں ہیں بلکہ ایک فطری فرض ہیں۔ اس عرب تشخص کی نشوونما اور تقویت میں کئی عوامل نے کردار ادا کیا، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر ہے:

1. گہرے اور پائیدار روابط کی بنیاد: فلسطینی آبادی پڑوسی برادریوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی، خاندان اکثر فلسطین، اردن، مصر، شام اور لبنان میں تقسیم ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر، زمیندار اکثر لبنان یا شام میں رہتے تھے جب کہ ان کی جائیدادیں فلسطین میں تھیں۔ ان حقائق نے الگ الگ قومی سرحدوں کے تصور کو عملی طور پر بے معنی بنا دیا، جس میں جدید فلسطین اور اس کی پڑوسی ریاستوں کے درمیان کوئی واضح جغرافیائی یا آبادیاتی علیحدگی نہیں تھی۔ مزید برآں، اس حقیقت سے ہٹ کر کہ فلسطین ایک

مقدس اسلامی مقصد ہے جو پوری مسلم دنیا میں گونجتا ہے، فلسطین میں لڑنے والے بہت سے عرب رضاکاروں نے اپنے خاندان، زمینوں اور عزت کے دفاع کے لیے براہ راست فرض کے احساس کے تحت ایسا کیا۔[1]

2. عرب ریاستوں کی سیاسی اور عسکری مصروفیات بالخصوص فلسطین کی سرحدوں سے متصل: ان اقوام نے فلسطین کی آزادی اور صیہونیت کے خلاف جنگ کو اپنی اجتماعی ذمہ داری کے طور پر پیش کرتے ہوئے عرب اتحاد کے جھنڈے تلے فلسطینی جدوجہد میں مداخلت کی۔ ایسا کرتے ہوئے، انہوں نے اکثر فلسطینیوں کی اپنے دفاع کی کوششوں کو محدود کر دیا، اور اس بات پر زور دیا کہ اس کا مقصد انفرادی جدوجہد کے بجائے پان عرب ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ تنازعہ کے لیے آزاد ملیشیاؤں کے بجائے منظم فوجوں کی ضرورت ہے، جیسا کہ پہلے بحث کی گئی تھی۔ اس بیانیے کو عرب رہنماؤں نے سراہا، سرکاری میڈیا کے ذریعے اس کی بازگشت سنائی دی، اور دانشوروں نے اسے تقویت دی۔ یہ دہائیوں سے پہلے ہی سوکھے ہوئے اور کمزور معاشرے کے ساتھ گہرائیوں سے گونجتا ہے، جہاں امید افزا بیان بازی کی اپیل نے آسانی سے مظلوموں اور حق رائے دہی سے محروم لوگوں کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

نقبہ کے دور میں یہ بیان بازی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ سیکولر عرب قوم پرستی نے مصر میں ناصریت اور شام اور عراق میں بعث پارٹی کے عروج کے ساتھ اپنے اثر ورسوخ کی بلندی کو حاصل کیا۔ اس عربی بیانیے میں عرب قوم کے اتحاد، فلسطین کی آزادی اور صیہونی ملیشیا کے خاتمے پر زور دیا گیا تھا۔ مصری فوجی بغاوت (23 جولائی 1952) کے پہلے اعلان میں فلسطینی کاز کو نمایاں طور پر اجاگر کیا گیا تھا۔ اس وقت، مصر نے اپنے ریڈیو اور پریس کے

---

[1] ایک اہم نکتہ کو واضح کرنا ضروری ہے: جب ہم "عرب" اور "وہ آئے" جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو ہم غالب ثقافتی فریم ورک اور جدید قوم پرست نقطہ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس وقت، ان افراد کو نہ تو "عرب" کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو "فلسطینیوں" سے ممتاز کرتے تھے۔ انہوں نے جہاد کی سرزمین تک اپنے سفر کو ایک الگ لوگوں کی مدد کے لیے "آنے" کے طور پر نہیں سمجھا، اور نہ ہی فلسطینی اسے اس لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ بہر حال، ہم بعض اوقات عصر حاضر کے سامعین کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے ان تاثرات کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نہ تو ہم اور نہ ہی وہ ان مروجہ نظریات کے اثر سے پوری طرح بچ سکتے ہیں جو ہماری موجودہ حقیقت کو تشکیل دیتے ہیں یا ان نظریات نے ہماری زبان اور اصطلاحات کو جس طرح سے ڈھالا ہے۔

ذریعے عرب دنیا میں میڈیا پر تقریباً اجارہ داری کا کنٹرول حاصل کر رکھا تھا، جس سے فلسطینیوں اور وسیع تر عرب عوام میں بڑے پیمانے پر جوش و خروش اور بے پناہ امید پیدا ہوئی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس بیان بازی نے فلسطینیوں کے وسیع تر عرب قوم پرست شناخت سے تعلق رکھنے کے احساس کو تقویت دی۔

اس کے باوجود بلند و بالا نعروں اور وعدوں سے ہٹ کر حقیقت تیزی سے ہٹ گئی اور اکثر اس بیانیے کی مخالفت کی۔ عرب حکومتوں نے فلسطینی کاز کو ایک سیاسی لیور کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا، اسے اپنی طاقت کو تقویت دینے کے ایک آلے میں تبدیل کر دیا۔ جب کہ پچھلے دور میں متحدہ فلسطینی قیادت کے ظہور میں رکاوٹ ڈالنے کی برطانوی کوششوں کی نشاندہی کی گئی تھی، اس دور میں عرب حکومتوں کی طرف سے اب اسی طرح کے حربے استعمال کیے گئے تھے۔

عرب اعلیٰ کمیٹی نے حج امین الحسینی کی سربراہی میں، برطانوی انخلاء سے پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو دور کرنے کے لیے فلسطینی حکومت کے قیام کی کوشش کی۔ نکبہ کی قیادت میں کی جانے والی اس کوشش کو عرب حکومتوں نے مسترد کر دیا، اردن کے شاہ عبداللہ سخت ترین مخالف تھے۔ عبداللہ، اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے ارادے سے، شریف حسین کا بڑا بیٹا ہونے کے باوجود ایک چھوٹا، بنجر علاقہ دیے جانے پر دیرینہ ناراضگی کا شکار تھا۔

نکبہ اور عرب فوجوں کی شکست کے بعد، عرب اعلیٰ کمیٹی نے 23 ستمبر 1948 کو آل فلسطین حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ جب کہ زیادہ تر عرب ممالک نے اس حکومت کو تسلیم کیا، خاص طور پر اردن نے نہیں کیا۔ یکم اکتوبر 1948 کو کمیٹی نے غزہ میں ایک قانون ساز کونسل کا اجلاس بلایا جس کی صدارت حاج امین الحسینی نے کی تاکہ حکومت کی قانونی حیثیت کو یقینی بنایا جاسکے۔

تاہم، مصری حکومت نے جلد ہی مداخلت کرتے ہوئے، حاج امین الحسینی، سرکاری اہلکاروں، اور کونسل کے متعدد ارکان کو زبردستی قاہرہ منتقل کر دیا، اور مؤثر طریقے سے غزہ کی پٹی کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس نے حکومت کو خالصتاً علامتی طور پر جلاوطنی میں کسی حقیقی اختیار سے خالی حکومت کا درجہ دیا۔ قاہرہ میں، الحسینی کو سخت نگرانی

کا سامنا کرنا پڑا، اور عرب اعلیٰ کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر کی کڑی نگرانی کی گئی۔ آل فلسطین حکومت کے سربراہ کا کردار بالآخر عرب لیگ میں فلسطین کے نمائندے کے طور پر کام کرنے تک محدود کر دیا گیا۔

اس طرح، عرب ریاستوں نے نادانستہ طور پر اسرائیل کی علاقائی توسیع کو قابل بنایا، جس سے اسے تقسیم کے منصوبے میں مختص کردہ علاقوں سے باہر کے علاقوں کو ضم کرنے کی اجازت ملی۔[1] مصری اور اردن کی حکومتوں نے غزہ اور مغربی کنارے پر کنٹرول رکھتے ہوئے، "اسرائیلی" سرحدوں میں دراندازی کی کسی بھی مزاحمتی کارروائی یا فلسطینی کوششوں کو دبانے کے لیے ٹھوس کوششیں کیں۔[2] ان کے حفاظتی آلات نے اسرائیل کے مسلسل حملوں اور خلاف ورزیوں کے باوجود بھی نو آموز عسکریت پسند گروہوں میں دراندازی کی۔

عرب لیگ کی ایک رپورٹ میں دراندازی کو روکنے کے لیے سرکاری اقدامات کی تفصیل دی گئی ہے، جس میں مزاحمتی جنگجوؤں کو قید، جرمانے، جلاوطنی، اور جسمانی زیادتیوں کی مختلف اقسام، جیسے مار پیٹ اور تشدد کے ذریعے سزا دینا شامل ہے[3]۔ شروع ہی سے عرب حکومتوں نے فعال طور پر اسرائیل کی حفاظت کی اور اس کے مخالفین کا تعاقب کیا۔[4]

ان حالات میں یہ سوال کرنا بے ہودہ ہو گا کہ کیا عرب حکومتوں نے اپنی فوجوں کو متحرک کرنے یا اسرائیلی جارحیت اور خلاف ورزیوں کا فوجی جواب دینے پر بھی غور کیا تھا کہ فلسطین کی آزادی پر غور کیا جائے۔[5]

اگر عرب حکومتوں نے فلسطین کو صیہونیوں کے حوالے کر دیا اور ان کے کنٹرول میں سہولت فراہم کی تو یہ محض ایک نظر بندی یا غیر ارادی غلطی نہیں تھی۔ بلکہ فلسطین کے حوالے سے ان حکومتوں کے اقدامات ایک دانستہ

---

[1] صلاح خلاف ، صفحہ 65 ۔

[2] آئیبڈ۔ پی پی۔ 81، 84، 87۔

[3] صلاۃ خلف، ص82-83؛ احمد مسرور، ص75

[4] شیخ عبداللہ عزام نے اپنے گاؤں سلات الحارثیہ کے ایک پڑوسی کے بارے میں ایک کہانی سنائی، جس نے دیکھا کہ اسرائیلی اس کے باغ میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ جنین میں اردنی فوج کے مرکز میں واقعے کی اطلاع دینے گیا لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا، قید کر دیا گیا اور فوجی عدالت کے سامنے لایا گیا۔ اسے جج کے سامنے یہ دعویٰ کرنے کے بعد ہی رہا کیا گیا کہ وہ سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا، اور جاگنے پر، اس نے اسے حقیقت سمجھا۔ عزام نے دوسری کہانیاں بھی شیئر کیں جو اردنی حکام کے ظلم اور ان کی ملی بھگت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو الذخائر العزام۔

[5] درحقیقت، نیویارک میں عرب لیگ کے دفتر کی رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ "اقوام متحدہ کی چار مشترکہ کمیٹیوں میں سے کسی کو بھی اسرائیل کی سرزمین پر حملے کی منصوبہ بندی، تنظیم یا آغاز کرنے کے لیے کسی عرب حکومت کی مذمت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔" (p.4)

اور جامع خیانت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ ریاستیں جن کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ انہوں نے "آزادی حاصل کر لی" اور "خود کو نو آبادیاتی حکمرانی سے آزاد کر لیا" انہوں نے غیر ملکی قبضے کے تحت اس سے مختلف سلوک نہیں کیا۔

فلسطینی معاشرہ نقبہ کے بعد سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور پر ایک گہرے اتھل پتھل سے گزرا اور اس کے نتیجے میں نقل مکانی کی لہروں نے اس کے تانے بانے کو نئی شکل دی۔ جو معاشرہ کبھی برطانوی قبضے سے کمزور اور سوکھا ہوا تھا اسے اب ایک نئی حقیقت کا سامنا ہے: ایک کمیونٹی حیران، بکھری اور اس حد تک منتشر ہو گئی کہ اس کی ہم آہنگی پر سوالیہ نشان تھا۔

تباہ کن نقل مکانی نے نئے سماجی طبقات اور طبقوں کو جنم دیا، خاص طور پر مہاجر کیمپوں اور آس پاس کے شہری علاقوں میں۔ بہت سے فلسطینیوں نے پڑوسی ممالک میں پناہ حاصل کی، جبکہ دیگر خلیجی ریاستوں کی طرف ہجرت کر گئے، جہاں تیل کی تیزی سے گزر رہی تھی اور اہم ترقیاتی منصوبے شروع کر رہے تھے۔ ان فلسطینیوں کے لیے، خلیج نے امید کی کرن اور غربت سے فرار کی پیشکش کی، جب کہ اس خطے نے مختلف شعبوں میں ان کی ہنر مند محنت سے فائدہ اٹھایا۔

تعلیم فلسطینی لچک کی بنیاد بن گئی، جو زمین، جائیداد، یا تجارت کی عدم موجودگی میں اوپر کی طرف نقل و حرکت کا بنیادی راستہ بن کر ابھری۔ اس زور نے فلسطینیوں کو عرب دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی آبادی میں سے ایک بنا دیا، جس نے عرب، یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں سے بہت سی ڈگریاں حاصل کیں۔[1]

تاہم عرب ریاستوں بالخصوص مصر اور اردن کی پالیسیوں کے ساتھ مل کر اس وسیع سماجی و اقتصادی تبدیلی نے سیاسی اور عسکری دونوں لحاظ سے فلسطینی مزاحمت کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈالی۔ سیاسی طور پر، عرب اعلیٰ کمیٹی غیر متعلق ہو گئی، اور ایک زمانے کے ممتاز حاج امین الحسینی نے اپنا اثر و رسوخ کم ہوتے دیکھا۔ 1958 میں لبنان منتقل ہونے سے پہلے وہ قاہرہ میں مجازی قید میں رہتے تھے۔

[1] صلاۃ خلف، ص39۔ احمد جبریل، صفحہ 35-36؛ مسین صالح، ص 71

فوجی مزاحمتی محاذ پر، کوششیں چھوٹے آپریشنز تک محدود تھیں جو افراد یا چھوٹے گروہوں کی طرف سے سرحدوں میں دراندازی کرنے یا فوجیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے معمولی وسائل کے باوجود، انہوں نے اہم نتائج حاصل کیے، مبینہ طور پر سات سالوں (1949-1956) کے دوران تقریباً 1,200 اسرائیلی ہلاکتیں ہوئیں۔ تاہم، یہ کارروائیاں اس وقت بند ہو گئیں جب نصری حکومت نے 1956 کی جنگ میں ذلت آمیز شکست کے بعد سرحدی حفاظت کو سخت کر دیااور اسرائیل کے خلاف حملوں کو روک دیا۔

در حقیقت، "ان حکومتوں نے غزہ کے نوجوانوں کے خلاف جو کچھ کیا، اس کا غدار اور خونی ریکارڈ، جب بھی انہوں نے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے مزاحمت کو منظم کرنے کی کوشش کی، اس کا دستاویزی ثبوت ہونا باقی ہے۔ ان میں سے بہت سے نوجوان 1956 کی جنگ تک ناصر کی جیلوں اور حراستی مراکز میں پڑے رہے، جب یہ فائلیں اسرائیلی افواج کے حوالے کر دی گئیں۔"

بڑے پیمانے پر مایوسی اور مکمل سیاسی خلا کے درمیان، نوجوان فلسطینیوں نے 1957 میں ایک نئی تحریک فتح کے قیام کے لیے پہل کی۔ اس تنظیم کی بنیاد کویت میں رکھی گئی تھی، جو اس وقت بڑھتی ہوئی فلسطینی کمیونٹی کا گھر بن چکی تھی۔ نو سال تک، الفتح نے خاموشی سے منظم اور تیار کیا، بالآخر دسمبر 1964 میں اپنا پہلا فوجی آپریشن شروع کیا۔

ابتدائی طور پر، الفتح نے اپنی بنیاد اسلامی اصولوں سے کھینچی اور اخوان المسلمین کے نوجوانوں پر بہت زیادہ انحصار کیا۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ، یہ ایک سیکولر تحریک میں تبدیل ہوا جس کی شکل مختلف حالات اور عوامل کی وجہ سے تھی جسے ہم بعد میں دریافت کریں گے، انشاءاللہ

اس مختصر مطالعہ کی حدود میں سے ایک پناہ گزینوں کے مسئلے کو مکمل طور پر حل کرنے میں ناکامی ہے - یہ ایک گہرا المیہ ہے جو فلسطینی معاشرے کے تجربے کے مرکز میں ہے۔ خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے، مختلف ممالک اور یہاں تک کہ براعظموں میں بکھرے ہوئے، مختلف حالات، تعلیم کی سطح، ہنر، اور ہر ایک کے لیے دستیاب مواقع کی بنا پر۔ پناہ گزینوں نے ہر اس عرب ملک میں بڑے پیمانے پر ذلت، پسماندگی اور اخراج کا سامنا کیا جس

میں انہوں نے پناہ مانگی، اکثر دوسرے غیر ملکیوں کے مقابلے میں بدتر سلوک کیا جاتا ہے، برابری یا شہری کے طور پر چھوڑ دیں۔

کسی بھی عرب ریاست نے فلسطینیوں کی صلاحیتوں کو مکمل طور پر استعمال نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اپنے معاشروں میں برابر کے طور پر ضم کیا۔ اس کے بجائے، ان کا علاج ناکافی سے لے کر سراسر امتیازی سلوک تک تھا، جس نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا: سفر، تعلیم، اور صحت کی دیکھ بھال سے لے کر ملازمت، رہائش، بچپن کے تجربات، اور یہاں تک کہ ان کے مردہ کی تدفین تک۔ سیاسی بدامنی اور جنگ کے ادوار کے دوران، پناہ گزین اکثر قربانی کے بکرے بنے، بے پناہ مصائب کا نشانہ بنے اور سب سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور ہوئے۔

اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پناہ گزینوں کے بحران کی گہری کھوج کے بغیر فلسطینی مقصد کی جامع تفہیم نامکمل ہے، لیکن اس مطالعے کی مختصر اور مرکوز ہونے کی کوشش ہمیں خود کو اس مختصر اعتراف تک محدود رکھنے پر مجبور کرتی ہے، جس سے یہ تکلیف دہ باب بڑی حد تک غیر دریافت شدہ رہ جاتا ہے۔

1948 کے نکبہ کے بعد عرب ممالک کی ریاست

نقبہ نے پورے خطے میں خاص طور پر آس پاس کی ریاستوں میں بغاوتوں، قتل وغارت اور انقلابات کی ایک پر تشدد لہر کو جنم دیا۔ نقبہ اور اس کے اسباب کی تشریحات مختلف ہیں، جو مستقبل کے لیے مختلف تصورات کو جنم دیتے ہیں۔ وسیع پیمانے پر عرب اور اسلامی غم وغصے کی وجہ سے پیدا ہونے والی یہ اندرونی ہلچل ایک اور اہم پیشرفت کے ساتھ ڈھل گئی: امریکہ اور سوویت یونین کی صورت میں مغربی اثر ورسوخ خطے میں برطانوی اور فرانسیسی تسلط کی جگہ لے رہا ہے۔ یہ علاقہ مسابقتی طاقتوں کے لیے ایک تھیٹر بن گیا، جو اداکاروں، مہم جوئیوں، باہم جڑی ہوئی تنظیموں اور متضاد پالیسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مقامی دھڑوں نے بیرونی حمایتیوں کو حاصل کیا، جبکہ بیرونی طاقتوں کو مداخلت اور استحصال کے لیے زرخیز زمین مل گئی۔

نکبہ کے بعد کے سال عرب دنیا میں خاص طور پر لیونٹ، مصر اور عراق میں سب سے زیادہ ہنگامہ خیز، متحرک اور افراتفری میں سے تھے۔ آخر کار دوسری جنگ عظیم کی فاتح طاقتیں امریکہ اور سوویت یونین خطے میں غالب قوتوں کے طور پر سامنے آئیں۔

مسئلہ فلسطین ایک واضح یاد دہانی ہے کہ عرب دنیا کے اندر بغاوتیں اور تبدیلیاں عرب عوام کے فائدے کے لیے بامعنی تبدیلی لانے یا انہیں بیرونی اثر ورسوخ سے آزاد کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ بادشاہت سے جمہوریہ کی طرف تبدیلی، بادشاہوں کی تبدیلی، اور صدور کی تبدیلی کے باوجود، فلسطین کے بارے میں موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کسی عرب رہنما نے اسرائیل کے خلاف حقیقی کارروائی کرنے یا فلسطین کو آزاد کرانے یا اس کے عوام کی حمایت کی حقیقی کوشش کرنے کی ہمت نہیں کی۔[1]

جگہ کی حدود کے پیش نظر، یہ بحث ارد گرد کے ممالک مصر، اردن، شام اور لبنان کے حالات پر مرکوز ہو گی جن کا فلسطینی کاز پر اثر خاص طور پر نمایاں رہا ہے۔

[1] صلاح خلاف ، صفحہ 65 ۔

مصر

اس سے پہلے کہ 1948 کی جنگ کا غبار ٹھنڈا ہو جائے، مصری حکام نے اخوان المسلمون کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا جو فلسطین کے لیے لڑنے والے رضاکاروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ حکومت نے تنظیم کو تحلیل کرنے، اس کے اثاثوں کو ضبط کرنے، اور اس کے رہنماؤں اور بہت سے ارکان کو گرفتار کرنے کا فیصلہ جاری کیا، جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو میدان جنگ میں مصری فوج کی سرگرم حمایت کرتے ہیں[1]۔ حکومت نے یہاں تک کہ یہ نعرہ بھی اپنایا: "اخوان صیہونیوں سے زیادہ خطرناک ہے۔"[2] اس مہم کے فوراً بعد، اس گروپ کے بانی اور رہنما حسن البنا کو قتل کر دیا گیا، جس نے اس وحشیانہ دھچکے کے بعد اخوان کو ایک انتشار کے دور میں ڈال دیا۔

مصری فوج کے اندر ایک دھڑا، جس کی قیادت جمال عبد الناصر کر رہے تھے، بعد میں اخوان، کمیونسٹ اور دیگر گروہوں کی فوجی بغاوت اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی پیشگی کوششوں پر قائم ہوا۔ یہ بغاوت مصر میں برطانوی نوآبادیاتی اثر و رسوخ کو تبدیل کرنے کے لیے امریکی حمایت یافتہ حکمت عملی کا حصہ تھی جس کا مقصد بالآخر حاصل ہو گیا۔ اس ہتھکنڈے کے ذریعے مصر برطانویوں سے امریکی تسلط میں تبدیل ہو گیا۔

بغاوت کو فعال بنانے میں اخوان کے اہم کردار کے باوجود، اس کے ارکان نے قاہرہ اور اسکندریہ میں شاہی محلات کا محاصرہ کرنے جیسی اہم ذمہ داریاں سنبھالی تھیں، اس گروپ کو بالآخر ایک تباہ کن غداری کا سامنا کرنا پڑا۔ عبد الناصر نے اس کی صفوں میں گھس لیا، اس کی قیادت کو ختم کر دیا، اور اسے ایک زبردست دھچکا پہنچا۔ اس نے طاقت کو مضبوط کیا اور آمرانہ حکمرانی کے دور کا آغاز کیا، جس میں بڑے پیمانے پر جبر، بدعنوانی اور جمود کا نشان تھا، اس نے اپنے دور کو سنگین مانیکر بنایا: "ظلم اور شکست کا دور۔"[3]

---

[1] اخوان المسلمون کی رضاکار بٹالینز کے جہاد کی دستاویز کرنے والی سب سے زیادہ قابل ذکر کتابوں میں کمال الشریف کی دی مسلم برادرہڈ ان دی فلسطین وار، حسین حجازی کی ایک گروپ جو کہ ایک قوم کو نجات دلاتا ہے، اور محمود الصباغ کی The Truth About the Special Organization and Its Mission's Role in the Muslim's Brotherhood شامل ہیں۔

[2] محمود صبغة، ص35

[3] مصری مورخ ڈاکٹر احمد شلابی نے اپنے انسائیکلوپیڈیا آف اسلامک ہسٹری کی نویں جلد میں اس کو یوں بیان کیا ہے۔

یہ دور برطانوی قبضے سے زیادہ سخت ثابت ہوا جسے اس نے بدل دیا۔ عبدالناصر ایک بھی فوجی فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس نے سوڈان کو مصر سے الگ ہونے کی اجازت دی، شام کے ساتھ مختصر اتحاد کو برقرار رکھنے میں ناکام رہا، یمن میں ذلت کا سامنا کرنا پڑا، اور اسرائیل کے خلاف دو کرشناک شکستیں برداشت کیں۔ اس کی موت کے وقت تک مصر سوڈان، غزہ کی پٹی اور جزیرہ نما سینائی سے محروم ہو چکا تھا۔

ان سیاسی اور فوجی ناکامیوں کے علاوہ، مصر سیاست، معیشت، معاشرت، ثقافت اور اخلاقیات کے ہر شعبے میں زوال کی طرف بڑھ گیا جس نے قوم کو شدید بحران اور جمود کی حالت میں چھوڑ دیا۔

فلسطین کو آزاد کرنے، "وعدہ شدہ ریاست" اور اسی طرح کے نعروں کے بارے میں وسیع اور پرجوش بیانات کے باوجود، عبدالناصر نے کبھی بھی سنجیدگی سے اسرائیل پر حملے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔[1] رپورٹس یہاں تک بتاتی ہیں کہ اس نے اسرائیل کے ساتھ امن کا تعاقب کرنے پر غور کیا لیکن اردن کے شاہ عبداللہ کی طرح قتل کے خوف سے گریز کیا۔[2] اپنی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں، اس نے فوجی بجٹ[3] میں کٹوتی کی اور 1956 میں شکست کے ذمہ دار انہی فوجی رہنماؤں کو برقرار رکھا جو بعد میں 1967 میں اس سے بھی زیادہ تباہ کن ناکامی کی صدارت کریں گے۔ اس عرصے کے دوران، فوج اور دیگر ریاستی ادارے بدعنوانی اور زوال کی لپیٹ میں تھے، جس سے قوم کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوا۔

شام نے عرب دنیا میں فوجی بغاوتوں کے دور کا آغاز کیا، یہ بغاوتیں اکثر نوآبادیاتی طاقتوں کے آلہ کار کے طور پر کام کرتی ہیں۔ صرف ایک سال میں، شام میں مسلسل تین فوجی بغاوتیں ہوئیں: حسنی الزعیم کی بغاوت (مارچ 1949)، سمیع الحنوی کی بغاوت (اگست 1949)، اور ادیب الششکلی کی بغاوت (دسمبر 1949)

ادیب الششکلی نے ابتدائی طور پر شہری محاذ کے ذریعے حکومت کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، جب یہ حکمت عملی ناکام ہو گئی، تو اس نے نومبر 1951 میں شام کی تاریخ میں چوتھی بار بغاوت کی، اور ایک مطلق العنان فوجی

---

[1] محمد حسنین ہیکل، قصات السویس: اخر المارک فی عصر العمالقہ (سویز کی کہانی: جنات کے دور میں آخری لڑائیاں)، صفحہ 22۔

[2] گولڈ امیر، صفحہ 176

[3] ایم ایچ ہیکل، صفحہ 22

حکومت قائم کی۔ یہ حکومت فروری 1954 میں ایک اور بغاوت تک قائم رہی، جس کی قیادت فیصل العطاسی نے کی، جس نے الشِشکلی کو معزول کر دیا اور اقتدار عام شہریوں کو بحال کیا۔ اس واقعہ نے شام کی جمہوری بہار کے نام سے جانے جانے والے آغاز کی نشاندہی کی، جو کہ نسبتاً سیاسی کھلے پن کے چار سال کا مختصر عرصہ تھا۔

1958 میں، شکری القوتلی نے مصر کے ساتھ اتحاد کی تجویز پیش کی۔ اگرچہ جمال عبدالناصر نے ابتدا میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، لیکن آخرکار وہ متفق ہو گئے، جس کے نتیجے میں متحدہ عرب جمہوریہ مصر اور شام کے درمیان ایک ہی جھنڈے کے نیچے اتحاد بنا۔ تاہم، یونین صرف تین سال بعد ہی تحلیل ہو گئی، 1961 میں مصری انتظامیہ کے خلاف فوجی بغاوت کے بعد، جس نے شام میں بدعنوانی اور آمریت کو جنم دیا تھا۔

بغاوت پر ناصر کا غیر فعال ردعمل اس کی وسیع تر ناکامی کی عکاسی کرتا ہے۔ ناقص پالیسیوں اور عزم کی کمی کے ذریعے، اس نے جدید تاریخ کے ایک نازک موڑ پر دو اہم ترین عرب ممالک کو متحد کرنے کا ایک تاریخی موقع ضائع کیا۔

1963 میں، بعث پارٹی کی ملٹری کمیٹی کی طرف سے منظم فوجی بغاوت نے شام کو ایک سخت اور جابرانہ بعثی حکومت کے دور میں دھکیل دیا۔ 1966 میں ایک اور اندرونی بغاوت کے ساتھ صورتحال مزید خراب ہوئی، جس نے بعث پارٹی کے پرانے محافظ کو معزول کر دیا اور عراق اور شام میں اس کے دھڑوں کے درمیان دراڑ کو مزید گہرا کر دیا۔ یہ عدم استحکام 1970 میں تیسری داخلی بغاوت پر منتج ہوا، جس کی قیادت حافظ الاسد نے کی۔ اسد نے سویلین گورننس اور سیاسی کثرتیت کی آخری باقیات کو ختم کر دیا، ایک آمرانہ حکومت کا آغاز کیا جسے بڑے پیمانے پر لیونٹ کی تاریخ کے سیاہ ترین بابوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔

یہ جائزہ فلسطینی کاز کو بامعنی مدد فراہم کرنے کے لیے شام کی تیاری اور صلاحیت کی کمی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے برعکس، پہلی بغاوت کے رہنما، حسینی الزائم نے اسرائیل کے ساتھ ایک امن معاہدے کی پیروی کی جس میں مکمل معمول پر لانا، سفیروں کا تبادلہ، اور شام میں 300,000 فلسطینی پناہ گزینوں کی دوبارہ آبادکاری شامل تھی۔ تاہم، ڈیوڈ بین گوریون نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، کیونکہ اس نے شام کے ساتھ جھیل ٹائبیریاس پر مکمل

کنٹرول حاصل کرنے کی بجائے اسے شام کے ساتھ بانٹنے کی کوشش کی اور ایسی سرحدیں متعین کرنے سے انکار کر دیا جو ایک عظیم تر اسرائیل کے لیے اس کے وسیع عزائم کو روکتی تھیں۔[1]

شام میں ہونے والی بغاوت اور مصر اور عراق میں بادشاہتوں کے خاتمے کے بالکل برعکس، اردن نے قابل ذکر حد تک استحکام اور تسلسل حاصل کیا۔ یہ واحد عرب ملک کے طور پر کھڑا تھا جہاں حکمرانی کا نظام بدستور برقرار رہا، بادشاہت شاہ عبداللہ اور ان کی اولاد کے تحت قائم رہی۔ تاہم، اس استحکام کی جڑیں مقبول منظوری یا اندرونی طاقت میں نہیں تھیں جو دونوں ہی بہترین تھے۔ اس کے بجائے، اسے نوآبادیاتی طاقتوں نے برقرار رکھا جو اسے محفوظ رکھنے کے لیے پرعزم تھیں۔ اردن کی حکومت غیر ملکی مفادات، خاص طور پر فلسطین کے سلسلے میں سب سے زیادہ تعمیل اور وفادار ثابت ہوئی۔

1948 کی جنگ کے اختتام کے بعد شاہ عبداللہ نے مغربی کنارے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ انگریزوں اور صیہونیوں کے ساتھ اس کی گہری صف بندی تیزی سے واضح ہو گئی، جس نے اسے فلسطین کے ساتھ غداری میں مرکزی شخصیت کے طور پر جگہ دی۔ اس غداری کو مصر، سعودی عرب اور شام کی حکومتوں کے ساتھ ان کے مخالفانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ سب سے ممتاز فلسطینی رہنما حج امین الحسینی کے ساتھ ان کی دشمنی نے مزید اجاگر کیا۔ ان عوامل نے مل کر اس کی مخالفت میں شدت پیدا کر دی۔

20 جولائی 1951 کو جب شاہ عبداللہ مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کر رہے تھے تو ایک یروشلم نے انہیں مسجد کی سیڑھیوں پر قتل کر دیا۔ اس کا قتل فلسطین کے ساتھ غداری کرنے کے بدلے کا سامنا کرنے والے حکمران کی پہلی مثال ہے۔

ان کے پوتے، حسین بن طلال جو بعد میں تخت پر چڑھیں گے، نے بتایا کہ شاہ عبداللہ نے ان کے قتل کی پیشین گوئی کی تھی، جو اس نے اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ شیئر کی تھی۔ تقریب کے دوران موجود نوجوان حسین نے اس سانحے کا خود مشاہدہ کیا اور وہ اس بات سے متاثر ہوا کہ کتنی جلدی بادشاہ کے وفد نے اسے چھوڑ دیا، اس کی

---

[1] عادل ارسلان، جلد2، صفحہ 839، 841-42، 846؛ یوجین روگن، پی پی 348-49

موت کے لمحے میں بکھر گئے۔ یہاں تک کہ امریکی سفیر، دوسروں کے علاوہ، نے بھی اس طرح کے نتائج کا اندازہ لگایا تھا۔[1]

اس قتل نے عرب قیادت میں صدمے کی لہریں بھیج دیں، جس سے دوسرے حکمرانوں میں بھی اسی طرح کے انجام کا خوف پیدا ہوا۔ جمال عبدالناصر نے خود اعتراف کیا کہ اگر اس نے اسرائیل کے ساتھ امن کی کوشش کی تو اسے قتل کا خدشہ تھا۔[2] اردن کی حکومت نے جواباً عرب قوم پرستانہ رویہ اپنایا تاکہ اس کی گہری جڑی ہوئی دھوکہ دہی پر پردہ ڈال سکے۔ پس منظر میں، اس ڈرامائی واقعے نے تقریباً تین دہائیوں کے لیے اسرائیل کے ساتھ کھلے عربوں کو معمول پر لانے اور اردن کے معمول پر آنے میں تقریباً چار کے لیے تاخیر کی۔

عبداللہ کے قتل کے بعد، ان کا بیٹا طلال، 42 سال کی عمر میں، تخت پر بیٹھا لیکن ایک سال سے بھی کم عرصے بعد، بظاہر ذہنی بیماری کے دعووں کی وجہ سے معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسے بیرون ملک ایک سینیٹوریم میں قید کر دیا گیا، جہاں اس نے اپنی موت تک 20 سال گزارے۔ اس کی برطرفی کے صحیح حالات جدید عرب تاریخ کے پائیدار معمہوں میں سے ایک ہیں۔ یہ بڑے پیمانے پر قیاس کیا جاتا ہے کہ طلال کا برطانوی مفادات[3] کے مطابق ہونے سے انکار ان کے والد کی طرح ان کے خلاف ایک سازش کی طرف لے گیا تھا، جس کی منصوبہ بندی جنرل گلوب پاشا (اردن کی فوج کے برطانوی کمانڈر) اور توفیق ابوالہدا (شاہ عبداللہ کے برطانوی نواز وزیر اعظم) نے کی تھی۔[4]

اردن کی حکومت کو وسیع پیمانے پر عرب حکومتوں میں سب سے زیادہ خطرناک، چالاک اور فریب کار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء اور حالات نے اسے اپنے تمام معاملات میں حسابی تدبیر کی حکمت عملی اپنانے پر مجبور کیا۔ کئی اندرونی اور بیرونی عوامل نے اس نقطہ نظر کو تشکیل دیا، بشمول:

---

1 حسین بن طلال، میرا کام بادشاہ ہے، صفحہ 36 ایف ایف [عربی ایڈیشن]۔

2 گولڈ امیر، صفحہ 176۔

3 اس کی تائید ان سے منسوب کچھ کھاتوں سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ کریں، مثال کے طور پر، امین الحسینی کی یادداشت، ص.38

4 واشنگٹن پوسٹ، فروری 17، 1977۔ اس کے علاوہ، ایم ایچ ہیکل، کلام فی السیاس: قدایا ور جال، ص 117 ایف ایف اور ص 133 ایف۔

1. کمزور بنیادیں: حکومت کی اس سرزمین میں گہری سماجی یا تاریخی جڑوں کا فقدان ہے جس کی حکومت بنیادی طور پر برطانوی نوآبادیاتی طاقت کے ذریعے قائم اور برقرار رہی ہے۔

2. بیرونی حمایت پر انحصار: اردن ایک چھوٹے، وسائل سے محروم ملک پر حکومت کرتا ہے جو برطانوی نوآبادیاتی حکام کی خاطر خواہ مدد کے بغیر اپنی حکمرانی برقرار نہیں رکھ سکتا تھا، بعد میں اس کا انحصار امریکی اور اسرائیلی حمایت پر منتقل ہو گیا۔

3. عرب قوم پرستی کی خواہشات: اگرچہ عرب قوم پرستی کو ابتدا میں شاہ حسین کے پردادا شریف حسین بن علی نے چیمپیئن کیا تھا، اور بعد میں اسے ان کے دادا شاہ عبداللہ بن حسین نے اپنایا تھا، لیکن آخر کار عرب قیادت کی مشعل مصر، شام اور عراق تک چلی گئی۔ یہ بڑی، وسائل سے مالا مال قومیں، جو اپنے لیڈروں کی علاقائی تسلط کی خواہشات اور فلسطینی کاز کو اپنانے کی وجہ سے اردن کی حکومت کی مخالف بن گئیں۔

4. متضاد جغرافیائی سیاسی صف بندی: جب کہ مصر، عراق، اور شام پر سوشلزم، کمیونزم اور سوویت یونین کے ساتھ منسلک حکومتیں چل رہی تھیں، اردن نے خود کو مضبوطی سے امریکہ اور مغربی بلاک کے ساتھ جوڑ دیا۔ اس اختلاف نے اہم تناؤ، پولرائزیشن اور دشمنی کو فروغ دیا۔

5. فلسطینی آبادیاتی غلبہ: اردن کی حکومت ایک ایسی آبادی پر حکومت کرتی ہے جس میں فلسطینیوں کی اکثریت ہے۔ برطانوی قبضے اور اردن کی تخلیق سے پہلے، خاندانی اور قبائلی روابط دریائے اردن کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ فلسطین پر قبضے کے بعد اردن نے مغربی کنارے کا کنٹرول سنبھال لیا اور بے گھر فلسطینیوں کی بڑی تعداد کو ضم کر لیا۔ اس آبادیاتی حقیقت نے مملکت کی پالیسیوں کو تشکیل دیا ہے اور اس کے اندرونی اور بیرونی چیلنجوں میں اضافہ کیا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر اردن کی حکومت نے مسلسل فریب، ہیرا پھیری اور چالبازی کی حکمت عملی اپنا رکھی ہے۔ اگرچہ یہ عرب قوم پرستانہ بیان بازی اور نعرے پیش کرتا ہے، اس کی پالیسیاں اور وفاداریاں صہیونی اور امریکی

مفادات کے ساتھ مضبوطی سے منسلک ہیں۔ حکومت نے اپنے دروازے کھول دیے اور یہاں تک کہ مصر، شام اور عراق کی جابرانہ حکومتوں سے فرار ہونے والے اسلامی فراریوں کو ہمدردی کی بنا پر جگہیں دی گئیں، بلکہ ایک حسابی اقدام کے طور پر اس کی عوام کو ناصر یا دیگر جیسے لیڈروں کے پیچھے اکٹھے ہونے سے روکا گیا۔ اس کے ساتھ ہی، اس نے فلسطینی کاز کا استحصال کیا، محدود اور سختی سے کنٹرول شدہ سرگرمیوں کی اجازت دی جو جہادی کوششوں کی حقیقی حمایت کے لیے نہیں، بلکہ صیہونیت کے خلاف مزاحمت اور فلسطین کی آزادی کے لیے آواز دینے والی پرجوش توانائیوں کو قابو میں رکھنے، پرسکون کرنے، اور چینلج کرنے کے لیے ہے۔

اس نقطہ نظر کے ذریعے، اردن اسرائیل کا سب سے زیادہ قابل اعتماد تحفظ بن گیا ہے، اس کے ساتھ 650 کلومیٹر طویل سرحد کا اشتراک کرنے کے باوجود فلسطینی آبادی کی اکثریت مزاحمت کے لیے تڑپ رہی ہے اور حکومت کی جانب سے اسلام پسند اور فلسطینی مزاحمتی تحریکوں کے لیے محدود جگہ کی اجازت ہے۔ اردن آزادی اور اسلامی تحریکوں کو بے اثر کرنے کے ایک منفرد ماڈل کی نمائندگی کرتا ہے، ظاہری جبر کے ذریعے نہیں بلکہ حسابی نرم کنٹینمنٹ کے ذریعے۔ تاہم، یہ مواقع پیدا ہونے پر سختی کی کمی کا مطلب نہیں ہے۔ بلکہ، یہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ چالاکی، فریب اور حسابی ہیرا پھیری نے حکومت کی حکمت عملی میں ظالمانہ طاقت اور جبر سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔

اردنی ماڈل مصر، شام اور عراق کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کچھ فلسطینیوں کے لیے یہ دعویٰ کر کے اپنی ناکامیوں کا جواز پیش کرنے کے لیے ایک آسان بہانہ بن گیا کہ اردن فلسطین[1] کی آزادی کی ان کی کوششوں میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ جب کہ دونوں فریق سچائی کے ساتھ ایک دوسرے کی بداعمالیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، سبھی شریک ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی معزز، دیانتدار یا بے گناہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

[1] شاہ حسین کے موقف کے لیے ملاحظہ فرمائیں، احمد الشقیری، جلد 5، صفحہ ff1392؛ حسین بن طلال، میرا کام بادشاہ ہے، پی پی 204، 212 ایف ایف

اپنے آغاز سے لے کر ان سطور کو لکھنے کے لمحے تک، اردن کی حکومت اپنے نقطہ نظر میں مستقل مزاجی سے کام کر رہی ہے۔[1] اس مستقل مزاجی کا خلاصہ اسرائیلی وزیر اعظم بنجمن نیتن یاہو نے اپنی یادداشتوں میں کیا ہے، جہاں انہوں نے کہا، "میں نے انہیں (یعنی شاہ حسین) کو یقین دلایا کہ میں اردن کی ہاشمی بادشاہت کی بقا کو ایک اہم مفاد کے طور پر دیکھتا ہوں اور اگر ضرورت پڑی تو ہم اس کو روکنے کے لیے فوجی مداخلت کریں گے۔[2]

فلسطین کے بارے میں عرب ریاستوں کے طرز عمل سے درج ذیل اہم نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں :

1. حقیقی اتحاد کا فقدان: ان حکومتوں نے کبھی حقیقی طور پر عرب اتحاد کی پیروی نہیں کی۔ اس کے بجائے، ہر ایک نے اپنی طاقت کو مستحکم کرنے اور اپنے مقامی قومی تشخص کو تقویت دینے کو ترجیح دی، باوجود اس کے کہ وہ عرب قوم پرستی اور "اتحاد ہی آزادی کا راستہ ہے" جیسے نعرے لگائے۔ ان کی باتوں نے ان کے حقیقی ارادوں کو جھٹلایا۔
2. فلسطینی پناہ گزینوں پر ظلم: ان ریاستوں نے اپنے علاقوں میں بے گھر فلسطینیوں کو فلسطین کی آزادی کے لیے بامعنی کوششوں میں مشغول ہونے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے فلسطینی رہنماؤں اور نوجوانوں کی فطری نقل و حرکت کو محدود کر دیا۔ درحقیقت، فلسطینیوں کو اکثر ان حکومتوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جتنا نقصان مقامی آبادیوں کو ہوتا ہے، اگر زیادہ نہیں۔
3. فلسطینی کاز کا استحصال: مصر، شام اور عراق جیسی بڑی طاقتوں نے فلسطین کو ایک سیاسی سودے بازی کے لیے کم کر دیا، اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اس نقطہ نظر نے فلسطینی عوام کو ٹکڑے ٹکڑے اور تقسیم کر دیا، حسد اور دشمنی کو فروغ دیا، اور موقع پرستوں کو اتحاد کی قیمت پر قیادت کے لیے لڑنے کی ترغیب دی۔

---

[1] 7 ستمبر 2023 کو اسرائیلی اخبار Haaretz کی شائع کردہ ایک دستاویز؛ ایک اہم تاریخی واقعہ پر روشنی ڈالتا ہے: اردن کے شاہ حسین نے مبینہ طور پر اکتوبر 1973 کی جنگ سے کچھ دیر پہلے اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شام کے اسرائیل پر حملہ کرنے کے منصوبے کے بارے میں تصدیق شدہ خفیہ معلومات شیئر کیں۔ ہاریٹز نے اس دستاویز کو شاہ حسین اور اسرائیل کے درمیان گہرے اور اسٹریٹجک تعلقات کے ثبوت کے طور پر اجاگر کیا۔

[2] بینجمن نیتن یاہو، بی بی: میری کہانی، صفحہ 374 [ای بک]، صفحہ 296 [پیپر کاپی]۔

4. اسرائیل کے خلاف فوجی کارروائی کی عدم موجودگی: ان میں سے کسی بھی عرب ریاست نے سنجیدگی سے اسرائیل کے خلاف جنگ چھیڑنے یا فلسطین کی آزادی کے لیے فعال طور پر کام کرنے پر غور نہیں کیا۔ اس کے بجائے، ہر حکومت نے اپنی فوج اور سیکورٹی فورسز کی توجہ اپنی حکمرانی کو محفوظ بنانے اور اپنے لوگوں کو دبانے پر مرکوز رکھی۔ یہ دور بالآخر دوسری تباہی پر منتج ہوا جو پہلی سے بھی زیادہ شدید اور تباہ کن تھی: 1967 کا نقبہ

1967 کا نکبہ اور اسرائیلی توسیع کا اضافہ

1967 کی جنگ کے تقریباً چھ دہائیوں بعد، اس کے واقعات اور اسباب کے بارے میں بہت کچھ پوشیدہ ہے۔ اس دور کی پائیدار عرب حکومتوں نے اپنے آرکائیوز کو جاری کرنے سے گریز کیا ہے، جس کی وجہ سے مورخین شائع شدہ عینی شاہدین کے بیانات اور غیر ملکی تحقیق پر منحصر ہیں۔

1967 کا نکبہ

اس جنگ کے سب سے حیران کن پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ مصری صدر جمال عبدالناصر کس طرح اس تنازعہ میں بھاگتے ہوئے نظر آئے گویا وہ مکمل طور پر تیار تھے، صرف ایک ایسی شکست سے دوچار ہونے کے لیے جو بالکل غیر متوقع لگ رہی تھی۔ جنگ کے نتائج مصر سے بھی آگے بڑھے، کیونکہ اسرائیل نے ایک ہی دن میں (5 جون 1967) چار عرب ریاستوں کے علاقوں پر قبضہ کر لیا:

1. مصر: اسرائیل نے غزہ پر قبضہ کر لیا، جو پہلے مصر کے کنٹرول میں تھا، اور جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کر لیا جو اسرائیل سے بھی بڑا ہے اور تمام فلسطین کا حجم دوگنا ہے۔
2. شام: اسرائیل نے گولان کی پہاڑیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا، جو کہ قدرتی قلعہ بندی کی وجہ سے انتہائی تزویراتی اہمیت کا حامل علاقہ ہے۔
3. اردن: اسرائیل نے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا جو پہلے اردن کی خودمختاری کے تحت تھا۔
4. فلسطین: تاریخی فلسطین یعنی غزہ اور مغربی کنارے میں جو کچھ بچا تھا وہ کھو گیا۔ عرب قوم پرستی کے جھنڈے تلے مصر اور اردن کے زیر انتظام ان علاقوں کو بالآخر اسرائیل کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ ہتھیار ڈالنا جدید عرب تاریخ میں ایک اہم ترین غداری کی نمائندگی کرتا ہے۔

مصر اور اردن نے بالترتیب غزہ اور مغربی کنارے پر حکومت کی تھی، اپنی حکمرانی کو عرب قوم پرستی کے لبادے میں لپیٹ کر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود، ان علاقوں کو اسرائیل کے حوالے کرنے کے بعد، دونوں حکومتیں وسیع

تر عرب کاز کو ترک کرتے ہوئے قوم پرست نعروں کی طرف منتقل ہو گئیں۔ یہ نہ صرف ایک فوجی اور سیاسی ناکامی بلکہ عرب دنیا کے نظریاتی منظر نامے میں بھی ایک اہم تبدیلی ہے۔

یہ جنگ، جسے چھ روزہ جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے، فیصلہ کن طور پر اپنے پہلے چھ گھنٹوں میں جیت لیا گیا، ایک ایسا کارنامہ جسے اکثر جدید فوجی تاریخ میں سب سے زیادہ جامع فتوحات میں سے ایک کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، جو بازنطینی سلطنت کے دور کے خاتمے کے متوازی عرب افواج کے ساتھ ہے۔

یہ تنازعہ اس وقت شروع ہوا جب مصری صدر جمال عبدالناصر نے آبنائے تیران کو اسرائیلی جہاز رانی کے لیے بند کر دیا۔ اس اقدام سے نہ صرف ایک اہم فوجی اضافہ ہوا بلکہ مصریوں کے سامنے بھی پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ 1956 سے اسرائیلی جہاز ان کے پانیوں سے گزر رہے تھے۔ جلد ہی اس بندش کے بعد ناصر کی جانب سے مصر اسرائیل سرحد سے اقوام متحدہ کی ایمرجنسی فورس کے انخلاء کا مطالبہ کیا گیا، جو کہ آنے والی جنگ کا واضح اشارہ ہے۔ اس کے باوجود، ان ڈرامائی اشاروں سے آگے، کوئی خاطر خواہ جنگی تیاری نہیں کی گئی تھی۔

ہت سے مؤرخین ناصر کے اقدامات کو حساب کتاب کے طور پر دیکھتے ہیں جس کا مقصد سیاسی یا اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لیے بین الاقوامی مداخلت کو اکسانا تھا۔ تاہم، اس کی حکمت عملی واپس آگئی۔ اقوام متحدہ کی افواج کے انخلاء نے اسے بیرونی حمایت یا ثالثی کے بغیر چھوڑ دیا، اور وہ بعد کے واقعات کے لیے تیار نہیں تھے۔

دور اندیشی اور منصوبہ بندی کی کمی نے مصری فوج کو مفلوج کی حالت میں چھوڑ دیا۔ اس کی فوجیں تیار نہیں تھیں، اور ریزروسٹوں کو فوری طور پر متحرک کیا گیا اور مناسب تربیت، واضح مقاصد، یا علاقے اور دشمن کی پوزیشنوں کی سمجھ کے بغیر میدان جنگ میں تعینات کیا گیا۔ ان عوامل نے مصر کی پہلے سے ہی غیر یقینی پوزیشن کو مزید پیچیدہ کر دیا، جس کا نتیجہ اس کی تیز اور فیصلہ کن شکست پر ہوا۔

ناصر کے فلسفی اور ترجمان، محمد حسنین ہیکل نے نوٹ کیا کہ مصر نے 1967 کی جنگ میں پہلی ہڑتال کو جذب کرنے کا انتخاب کیا تھا۔ تاہم، یہ فیصلہ تباہ کن ثابت ہوا، کیونکہ مصری قیادت اس کے تباہ کن اثرات کو کم کرنے

کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابتدائی اسرائیلی حملہ بہت زیادہ تباہ کن تھا، جس نے تیاری کے دعووں کے باوجود مصر کو چوکس کر دیا۔

تنازعہ مصر کی فضائیہ کی تقریباً مکمل تباہی کے ساتھ شروع ہوا، جسے بغیر تحفظ کے رن وے پر بے نقاب چھوڑ دیا گیا تھا، بظاہر فنا ہونے کا انتظار تھا۔ اس بے مثال فوجی ناکامی نے ایک تیز رفتار اور تباہ کن خاتمے کا مرحلہ طے کیا۔ مصری فوجوں کو بغیر کسی مربوط منصوبے کے، بے ترتیبی میں سینائی سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا۔ پیچھے ہٹنے والی فوجیں اسرائیلی فضائی اور زمینی حملوں کا آسان ہدف بن گئیں، پسپائی کو قتل عام میں بدل دیا۔ 10,000 سے زیادہ مصری فوجی مارے گئے، اور 5000 سے زیادہ پکڑے گئے بہت سے لوگوں کو پھانسی دے دی گئی یا اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا، جب کہ دیگر کو ذلت آمیز حالات برداشت کرنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

مصری میڈیا نے فتوحات کی جھوٹی خبریں پھیلا کر حالات کو مزید خراب کیا، دشمن کے طیاروں اور ٹینکوں میں ہونے والے نقصانات کا دعویٰ کرتے ہوئے تل ابیب پر پیش قدمی کی تصویر کشی کی۔ اس غلط معلومات نے عرب عوام میں کامیابی کا وسیع تر وہم پیدا کیا۔ تلخ حقیقت صرف 9 جون 1967 کو سامنے آئی، جب صدر جمال عبدالناصر نے سرعام شکست کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے اپنے استعفیٰ کا اعلان کرتے ہوئے کہا، "میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اور میں اس کے لیے آپ کا تعاون چاہتا ہوں،" اور تباہی کی ذمہ داری قبول کی۔ ناصر نے وزیر داخلہ زکریا محی الدین کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

تاہم، حقیقی اور منظم مظاہروں کا ایک مرکب شروع ہوا، جس نے ناصر کو اقتدار میں رہنے پر زور دیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس نے اپنی واپسی کو عوامی مطالبے کے جواب کے طور پر پیش کیا، مؤثر طریقے سے اپنے اختیار کو مستحکم کیا۔ اس کے بعد ناصر نے سیاسی اور فوجی حریفوں کو ختم کرنے کے لیے تیزی سے حرکت کی، بشمول اس کے قابل اعتماد اتحادی، جنرل عبدالحکیم عامر، آرمی کمانڈر۔ عامر کی موت، جسے سرکاری طور پر خودکشی قرار دیا گیا، شکوک و شبہات میں گھرا ہوا ہے۔ صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ناصر نے مصر کی فوجی قیادت

کی تنظیم نو کی اور ایک نئی پالیسی متعارف کرائی جسے اس نے "جارحیت کے نتائج کو دور کرنا" کہا، جنگ کے نتیجے میں استحکام اور کنٹرول کو دوبارہ حاصل کرنے کی ایک حسابی کوشش کی نشاندہی کی۔

دریں اثنا، اسرائیل نے سینائی پر مکمل قبضہ کر لیا تھا اور نہر سویز کو ایک زبردست قدرتی رکاوٹ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس آبی گزرگاہ کا تزویراتی فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسرائیل نے نہر کے مشرقی کنارے پر مٹی کا ایک بڑا قلعہ تعمیر کیا، جس میں دفاع کی ایک اور تہہ شامل کی گئی۔ اس قلعہ بندی کو مضبوط بارلیو لائن کے ذریعہ تقویت ملی جس کا نام اس کے معمار کے نام پر رکھا گیا ہے اور اس نے اپنے اسٹریٹجک ڈیزائن اور لچک کی وجہ سے ایک اہم فوجی چیلنج پیش کیا ہے۔

1948 کا نقبہ، اگرچہ تباہ کن تھا، کسی حد تک متوقع تھا۔ اس کی جڑیں برطانوی سہولت کاری، عرب ممالک پر غیر ملکی تسلط اور غیر ملکی اثر و نفوذ یا کنٹرول میں کمزور، ناقص لیس عرب فوجوں میں پیوست ہیں۔ اس کے بالکل برعکس، 1967 کا نقبہ ایک اچانک اور زبردست تباہی تھی۔ اس وقت تک، عرب ممالک نے آزادی حاصل کر لی تھی، عرب قوم پرستی کو قبول کر لیا تھا، اور جمال عبدالناصر کو اپنے لیڈر کے طور پر پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ناصر کی حکومت نے کثرت سے فلسطین کو آزاد کرانے کی اپنی ذمہ داری کا اعلان کیا، فوجی طاقت کے بیانیے کو فروغ دیا جس میں راکٹوں اور جدید ترین ہتھیاروں جیسی پیش رفت کو نمایاں کیا گیا تھا۔

تاہم، ناصر کے شدید ترین مخالف بھی شکست کے پیمانے اور تیز رفتاری کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ مصری فوج، اپنے ہتھیاروں کے ساتھ، بکھرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، جس سے قاہرہ خطرناک حد تک خطرے سے دو گھنٹے کے اندر ایک ایسے دشمن سے تھا جس کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تل ابیب کے راستے میں شکست کے دہانے پر ہیں۔

شام میں، گولان کی پہاڑیاں، جو قدرتی طور پر مضبوط اور بلند خطہ ہے، حیرت انگیز آسانی کے ساتھ گر گئی۔ یہ چونکا دینے والا نقصان، جو شاید بنیادی فوجی تیاریوں اور چوکسی کے ساتھ ٹل گیا تھا، جس کے نتیجے میں 1,000 شامی فوجی ہلاک ہوئے اور اس نے تنازع کے دوران عرب افواج کے اندر موجود خلفشار کو واضح کیا۔

اردن میں، شاہ حسین، اسرائیلیوں اور امریکیوں کے درمیان قریبی تعلقات نے بادشاہ کو اپنے اتحادیوں پر خاصا بھروسہ دلایا، جس سے ان کے ارادوں پر سوال اٹھانا ان کے لیے ناقابل تصور ہو گیا۔ شاہ حسین اور صیہونی رہنماؤں کے درمیان خفیہ ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں- ایک ایسی کارروائی جسے اس وقت گہرا متنازعہ اور ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ یہ خفیہ تعلق اس قدر اہم تھا کہ اسرائیل نے مبینہ طور پر شاہ حسین کو اپنی جارحیت شروع کرنے سے چند دن یا گھنٹے پہلے اپنے فوجی منصوبوں سے خبردار کر دیا تھا۔

اس کے باوجود، اسرائیلی افواج نے کسی بھی موجودہ معاہدوں یا اعتماد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغربی کنارے پر، پھر اردن کے کنٹرول میں حملہ کیا۔ کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ یہ حملہ دونوں فریقوں کے درمیان پہلے سے ترتیب دیا گیا ہو گا، حالانکہ ایسے دعوے قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ اردن کے 6000 سے زیادہ فوجی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور دریائے اردن اردن اور اسرائیل کے درمیان نئی سرحد بن گیا۔ اس شکست نے شاہ حسین کے دادا مرحوم شاہ عبداللہ اول کے اردن کی سرحد کو وسعت دینے کے عزائم کو ختم کر دیا۔

اس حملے کے ایک حصے کے طور پر، مسجد اقصیٰ اسلام کا تیسرا مقدس ترین مقام کم سے کم مزاحمت کے ساتھ اسرائیلی قبضے میں آ گیا۔ حیران کن طور پر، جیسا کہ مختلف اکاؤنٹس میں لکھا گیا ہے، مٹھی بھر جوان یا اردنی فوجی بھی مبینہ طور پر اس کے دفاع میں ہلاک نہیں ہوئے۔ الاقصیٰ کا سقوط عرب اور اسلامی دنیا کے لیے ایک گہرے علامتی اور تزویراتی دھچکے کی نمائندگی کرتا ہے، جس سے خطے کے اجتماعی نقصان اور ذلت کے احساس میں اضافہ ہوا ہے۔

اسرائیل نے 11 جون 1967 کو جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد یروشلم میں مسجد اقصیٰ سے متصل مراکشی کوارٹر کو تیزی سے مسمار کر دیا۔ مکینوں کو زبردستی بے دخل کر دیا گیا، اور اس علاقے کو مغربی دیوار کے سامنے یہودیوں کی عبادت کی جگہ کے طور پر دوبارہ تبدیل کر دیا گیا (جسے یہودی "Walling Wall" کہتے ہیں)۔ 27 جون 1967 کو، صرف بارہ دن بعد، اسرائیل نے یروشلم کو اسرائیلی خود مختاری کے تحت ایک متحد شہر قرار دیا۔

اس کے بعد، اسرائیل نے فوری طور پر مشرقی یروشلم میں نئ یہودی بستیاں قائم کرنا شروع کر دیں، جبکہ اسلامی تاریخی اور ثقافتی نشانات کو ضبط یا مسمار کر دیا۔ مسجد اقصیٰ کے قریب نئ عبادت گاہیں تعمیر کی گئیں۔ تاہم، سب سے زیادہ مسئلہ مسجد کے نیچے کھدائی کا آغاز تھا، ایک ایسا منصوبہ جو جاری ہے اور اب مسجد کے ڈھانچے کے استحکام کو خطرہ ہے۔ دیواروں اور بنیادوں میں دراڑیں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں اور مسجد کو آگ لگانے کی سنگین کوشش 21 اگست 1969 کو پیش آئی۔

پین عرب ازم اور ناصری ازم کا زوال

پوری تاریخ میں، نظریات اس وقت پروان چڑھتے ہیں جب وہ فتح سے منسلک ہوتے ہیں اور جب ان پر شکست ہوتی ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ 1967 کے تباہ کن فوجی نقصان نے ایک نازک موڑ کو نشان زد کیا، جس نے ناصریت، پان عربزم، اور کمیونزم کے نظریات کے زوال کا اشارہ دیا جس نے ناصر کی قیادت کے دوران مصر اور عرب دنیا کے بیشتر حصے کو تشکیل دیا تھا۔ یہ نظریاتی حل اتنا گہرا تھا کہ مبینہ طور پر کچھ اسکالرز نے اس شکست کو مروجہ سوچ کے نمونوں کو دوبارہ ترتیب دینے کے موقع کے طور پر دیکھتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔[1]

اس دور کے دوران، ریاست کے زیر کنٹرول میڈیا میں صریح الحاد اور اخلاقی گراوٹ پھیلی ہوئی تھی، اس کے ساتھ فلموں اور ٹیلی ویژن میں غیر اخلاقی مواد کا سیلاب تھا۔ اس طرح کے حالات نے بہت سے لوگوں کو خطے میں اسلامی تشخص کے خاتمے کا خوف پیدا کر دیا۔

1967 کی شکست سے چند ہفتے قبل، ابراہیم اخلاص نے شامی فوج کے اخبار میں دلیری سے اعلان کیا، "خدا، سرمایہ داری، سامراج، اور ماضی کے معاشرے کی تمام اقدار تاریخ کے عجائب گھروں میں محفوظ ہو چکی ہیں۔"[2]

---

1 شیخ محمد متولی الشعراوی نے انٹرنیٹ پر دستیاب ایک وسیع پیمانے پر زیر گردش ویڈیو کلپ میں اپنے بارے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

2 عبداللہ عزام، ج 1، ص 839

اس جذبے نے ناصر کی شخصیت اور وژن سے دل کی گہرائیوں سے متاثر ہونے والے معاشرے کے زیٹجیسٹ کی عکاسی کی، جہاں ایک اسلامی کتاب لے جانے سے بھی کسی شخص کو خارجی قرار دیا جاسکتا ہے۔[1]

صفحہ 166

دوسرے نکبہ کے اہم ترین نتائج میں سے خاص طور پر فلسطین کی تاریخ کے حوالے سے درج ذیل ہیں۔

1. ناصریت اور سیکولر عرب نیشنلزم کا خاتمہ

1967 کی شکست نے جمال عبدالناصر کے سیاسی اور نظریاتی غلبے اور سیکولر پان عرب قوم پرست ایجنڈے کو فیصلہ کن طور پر کمزور کر دیا۔ یہ نظریہ، جس نے کبھی اتحاد اور طاقت کا وعدہ کیا تھا، فوجی ناکامی کے نتیجے میں بے سود ہونے کا انکشاف ہوا، جس سے عرب دنیا میں بڑے پیمانے پر مایوسی پھیل گئی۔[2]

2. اسلامی فکر کا احیاء

شکست کے بعد، اسلامی نظریات نے خاص طور پر مصر اور لیونٹ میں، شناخت اور مزاحمت کے لیے ایک نئے فریم ورک کی پیشکش کرتے ہوئے، دوبارہ اپنا اثر حاصل کرنا شروع کیا۔ یہ بحالی سیکولر نظریات سے ایک اہم تبدیلی کی نمائندگی کرتی ہے جس نے پچھلی دہائیوں کو نمایاں کیا تھا[3]۔

3. فلسطینی مایوسی اور قوم پرستی

غیر موثر عرب افواج کے تحفظ میں اپنے وطن سے محروم ہونے والے فلسطینیوں نے غداری کے گہرے احساس کا تجربہ کیا۔ اس غداری نے عرب حکومتوں یا سیکولر قوم پرستی پر انحصار کو مسترد کرتے ہوئے فلسطینی قومی شناخت کے مضبوط احساس کو فروغ دیا۔ نتیجے کے طور پر، بہت سے فلسطینی قوم پرست دھڑوں اور مزاحمتی تحریکوں کی طرف متوجہ ہو گئے جو اسرائیلی قبضے کے ساتھ براہ راست تصادم کے خواہاں تھے۔

[1] احمد منصور، pp.78-81 ff. شکست نے نہ صرف فوجی امیدوں کو توڑا بلکہ ان نظریات کی ساکھ کو بھی ختم کر دیا جنھوں نے آزادی اور اتحاد کا وعدہ کیا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی پورا نہیں ہوا۔ [مترجم]

[2] صلاۃ خلف، ص94۔ فتح الشقاقی، ج1، ص179۔

[3] عبداللہ عزام، جلد 1، صفحہ 851-52۔

4. فلسطینی مزاحمت کے ساتھ مصری اور وسیع تر عرب مشغولیت

پہلی بار، مصری حکومت نے مسترد اور شکوک کے اپنے سابقہ موقف سے ہٹ کر فلسطینی مزاحمتی تحریکوں کے ساتھ محدود تعاون کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک محتاط صف بندی کا آغاز کیا جس کا عکس مختلف حدوں تک، دوسری عرب حکومتوں کے ذریعے تھا۔ تاہم، بعض حکومتیں فلسطینی مزاحمتی گروپوں کے بارے میں گہری شکوک وشبہات یا مخالف رہی۔[1]

ان پیش رفتوں نے علاقائی سیاسی منظرنامے اور فلسطینی جدوجہد دونوں کو نئی نظریاتی اور تزویراتی سمتوں میں لے کر نئی شکل دی۔

اسرائیل: اہم علاقائی طاقت

اسرائیل نے 1967 کی جنگ میں کئی اہم سنگ میل حاصل کیے، جو خطے میں اپنی عسکری اور سیاسی عروج پر پہنچ گئے۔ اس جنگ کو درج ذیل وجوہات کی بنا پر اسرائیل کی طاقت کا ایک اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔

1. آزاد طاقت کا مظاہرہ کرنا

جب کہ 1948 میں اسرائیل کا قیام بہت زیادہ برطانوی سرپرستی اور مضبوط نوآبادیاتی حمایت پر منحصر تھا، 1967 کی جنگ نے اپنی طاقت کو آزادانہ طور پر برقرار رکھنے اور بڑھانے کی صلاحیت کو ثابت کیا۔ اس فتح نے عالمی سپر پاور پر براہ راست انحصار کیے بغیر خودمختاری سے کام کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کیا۔

2. اس کی قانونی حیثیت کو محفوظ بنانا

اس کے قیام کے بعد سے، اسرائیل کی بقا پر بڑے پیمانے پر سوال اٹھائے گئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ایک دشمن عرب خطے میں ایک چھوٹی ریاست کے پائیدار ہونے کے امکانات پر شک کیا۔ تاہم، 1967 کی فتح نے ان

[1] صلاۃ خلف، صفحہ 88، 96 ایف۔

شکوک و شبہات کو دور کر دیا، جس سے اسرائیل کی ترقی، توسیع اور طویل مدتی بقا کی صلاحیت ثابت ہوئی۔ اس کامیابی نے اسرائیل کو سیاسی، اقتصادی اور فوجی معاہدوں کے لیے ایک قابل عمل پارٹنر کے طور پر کھڑا کیا۔

3. سیمنٹنگ 1948 کے فوائد

جنگ نے 1948 میں اسرائیل کو حاصل کیے گئے علاقائی اور سیاسی فوائد کو مستحکم کیا۔ اسرائیل کو ختم کرنے کی بات بین الاقوامی سیاسی گفتگو سے غائب ہو گئی۔ یہاں تک کہ کئی دہائیوں بعد بھی، مذاکرات نے اسرائیل کے وجود پر سوال اٹھانے کی بجائے 4 جون 1967 کی سرحدوں پر واپسی پر توجہ مرکوز کی ہے۔

1967 کی جنگ کے بعد، اسرائیل خطے کی ممتاز طاقت کے طور پر ابھرا، جس کی اس کے پڑوسیوں سے کوئی مثال نہیں ملتی۔ ارد گرد کی اقوام مصر، اردن اور شام کو بیک وقت شکست دینے کی اس کی صلاحیت نے اسے مغربی طاقتوں کے لیے خطے میں واحد قابل اعتماد اتحادی قرار دیا۔

جنگ سے پہلے، امریکہ جیسی بڑی طاقتیں اس بات پر بحث کرتی تھیں کہ آیا اسرائیل یا خطے کی دیگر کلائنٹ ریاستوں، جیسے مصر، ترکی یا ایران پر شرط لگائی جائے۔ ان ممالک کو، اپنی بڑی آبادی، وسائل، اور جغرافیائی سیاسی عزائم کے ساتھ، غیر ملکی مفادات کے لیے ممکنہ علاقائی رہنما اور زیادہ فطری اتحادی کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

ایک غیر ملکی وجود ہونے کے باوجود جو ایک دشمن خطے میں نصب کیا گیا ہے، اسرائیل کی فتح نے عالمی طاقتوں کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ خطے میں وسائل سے مالا مال ممالک کو پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ اس نے نوآبادیاتی حساب کتاب کو تبدیل کر دیا، اسرائیل کو مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے بنیادی ایجنٹ بنا دیا، مصر، ترکی اور ایران جیسے علاقائی حریفوں کو مؤثر طریقے سے سائیڈ لائن کر دیا۔

1967 میں فیصلہ کن طور پر جیت کر، اسرائیل نے نہ صرف اپنے علاقائی کنٹرول کو بڑھایا بلکہ نوآبادیاتی طاقتوں کے ساتھ اپنے اسٹریٹجک تعلقات کو بھی از سر نو تشکیل دیا، اور خطے کی غالب قوت کے طور پر ایک غیر چیلنج والی پوزیشن کو تشکیل دیا۔

1967 کی جنگ میں 300,000 اضافی فلسطینی بے گھر ہوئے۔ اگرچہ یہ تعداد اہم ہے، لیکن یہ 1948 کے نقبہ کے دوران نقل مکانی کے پیمانے سے بہت زیادہ متصادم ہے۔ اس فرق میں کئی عوامل نے کردار ادا کیا:

1. 1948 سے اسباق

نکبہ کے دوران، فلسطینیوں کا خیال تھا کہ نقل مکانی عارضی تھی، عرب فوجوں کی کامیابی کے بعد تیزی سے واپسی کی توقع تھی۔ 1967 تک، انہوں نے تجربے سے سیکھا تھا کہ اسرائیلی افواج کا مقصد طویل مدتی قبضے اور آبادکاری ہے، جس سے بہت سے لوگوں کو تنازعات کے باوجود اپنی جگہ پر کھڑے ہونے اور اپنے گھروں میں رہنے پر اکسایا گیا۔

2. 1967 میں اسرائیلی نقطہ نظر

1948 کے برعکس، اسرائیل نے بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی ایک منظم پالیسی کو نافذ نہیں کیا۔ 1967 میں اس کے علاقائی فوائد اتنے تیز اور وسیع تھے کہ وہ آبادی کو زبردستی منتقل کرنے کی اپنی فوری صلاحیت سے تجاوز کر گئے۔

3. انٹیلی جنس ونڈ فال

مصری اور اردنی انٹیلی جنس آرکائیوز کو قبضے میں لینے سے اسرائیل کو فلسطینی مزاحمتی نیٹ ورکس کے بارے میں معلومات کا خزانہ ملا۔ اس نے اہم شخصیات کی شناخت اور غیر جانبداری کو فعال کر کے مزاحمت کو کمزور کیا۔

4. نفسیاتی اور نظریاتی کمزوریوں کا اثر

1967 کی شکست نے فلسطینیوں اور دیگر عرب آبادیوں کے حوصلے پست کر دیے۔ اس وقت اسلامی تحریکوں کو دبانے اور اسلامی شعور میں کمی کے ساتھ، آبادی اسرائیلی حکام کی جانب سے بھرتیوں یا جبر کے لیے زیادہ حساس تھی۔

رسوں کے دوران، ہدف بنائے گئے فوجی اور حفاظتی اقدامات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی دباؤ کے ذریعے، اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں مزاحمتی تحریکوں کو مؤثر طریقے سے کمزور کیا، جس سے 1973 تک ان میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔

اسرائیل کی ان اہم کامیابیوں کے لیے، بعض نے اسرائیل میں جمال عبدالناصر کا ایک عظیم الشان مجسمہ کھڑا کرنے کی تجویز بھی پیش کی، یہ دلیل دی کہ ان کی پالیسیوں اور فیصلوں کے بغیر، اسرائیل کو اتنی یادگار کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔[1]

[1] جلال کشک، صفحہ 23،614

ہتھیار ڈالنے اور معمول پر لانے کا راستہ

نہر سویز کے کنارے مصری اور اسرائیلی افواج کے درمیان وقفے وقفے سے جھڑپوں کے نتیجے میں دستبرداری کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس تنازعے کے دوران، اسرائیل نے جنوبی مصر میں گہرائی سے حملے کیے، جب کہ مصری یونٹس اسرائیلی خطوط کے پیچھے محدود کارروائیاں کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کارروائیوں کے باوجود، مصروفیات مجموعی اسٹریٹجک توازن کو تبدیل کرنے میں ناکام رہیں۔ یہ تنازع جمال عبدالناصر کی طرف سے جنگ بندی کے لیے امریکی ثالثی کے راجرز پلان کو قبول کرنے کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کے فوراً بعد، ناصر کا انتقال ہو گیا، اور ان کے نائب صدر، انور سادات نے صدارت سنبھالی، مصر کو ایک طویل مرحلے میں داخل کر دیا جسے "جنگ نہیں، امن نہیں" کہا جاتا ہے۔

اکتوبر کی جنگ

اپنی صدارت کے تیسرے سال تک، سادات نے اقتدار کو مضبوط کر لیا تھا، ناصر کے وفاداروں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، اور فیصلہ کن کارروائی کی تھی۔ مصری فوج نے سینائی پر ایک حیرت انگیز حملہ کیا، نہر سویز کو عبور کیا اور اس کے مشرقی کنارے پر 10 سے 15 کلومیٹر گہرائی میں قدم جمائے۔ ان کامیابیوں کو تقویت دینے کے لیے، مصر نے اپنی پوزیشنوں کی حفاظت کے لیے فضائی دفاعی نظام تعینات کیا۔

اس کے ساتھ ہی شامی افواج نے ابتدائی پیش قدمی کرتے ہوئے گولان کی پہاڑیوں پر حملہ شروع کر دیا۔ تاہم، اسرائیل نے تیزی سے بالادستی حاصل کر لی، شامی افواج کو پسپا کرتے ہوئے اور کھوئی ہوئی جگہوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اسرائیلی فضائی حملے شام کی سرزمین میں گہرائی تک گھس گئے اور دمشق کے علاقوں کو نشانہ بنایا۔ شام کا محاذ آخر کار بگڑ گیا، جس نے خطے کو پہلے سے بھی بدتر حالت میں چھوڑ دیا، مستقبل میں اسرائیلی پیش قدمی کی ممکنہ حد کے بارے میں غیر یقینی صورتحال بڑھ گئی۔

مصری محاذ پر، مہم پہلے چھ دنوں تک کامیابی سے آگے بڑھی، مصری افواج نے منصوبہ بندی کے مطابق اپنی نئی آزاد کردہ پوزیشنوں کو برقرار رکھا۔ حکمت عملی اس بنیاد پر مبنی تھی کہ اسرائیل بڑے پیمانے پر شہری متحرک ہونے پر انحصار کرنے کی وجہ سے ایک طویل جنگ برداشت نہیں کر سکتا، جس نے اس کی معیشت کو مفلوج کر دیا۔ مزید برآں، وسیع اور ویران جزیرہ نما سینائی میں اسرائیلی افواج کے لیے قابل دفاع خطہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ مسلسل دباؤ بالآخر اسرائیلی انخلاء پر مجبور ہو جائے گا۔

تاہم، ان ابتدائی فوائد کے بعد پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ صدر انور سادات نے اپنے فوجی کمانڈروں کو زیر کرتے ہوئے سینائی کی گہرائی میں پیش قدمی کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ تباہ کن ثابت ہوا، کیونکہ اس نے مصری افواج کو تباہ کن اسرائیلی فضائی حملوں سے بے نقاب کیا، اور انہیں اپنے فضائی دفاعی نظام کی حفاظتی حد سے باہر لے جایا۔ اس کا نتیجہ مصر کے 400 ٹینکوں میں سے نصف سے زائد کا نقصان تھا جسے ٹینک قتل عام کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ناجائز پیش قدمی نے مصری خطوط میں بھی ایک سنگین خلاف ورزی کی جس کا اسرائیلی افواج نے فائدہ اٹھایا۔ ایک اسرائیلی ڈویژن مصری تھرڈ آرمی کو گھیرے میں لے کر نہر سویز کے مغربی کنارے تک پہنچ گئی۔ اس ہتھکنڈے نے قاہرہ کو براہ راست خطرہ لاحق کر دیا، جس نے مصر کو ایک غیر یقینی حالت میں ڈال دیا۔

جو فتح کے طور پر شروع ہوا وہ ایک اسٹریٹجک شکست میں بدل گیا۔ اس موقع پر، امریکہ نے سفارتی طور پر مداخلت کی، جنگ بندی پر بات چیت کرتے ہوئے دشمنی کو ختم کیا۔ مصری محاذ پر نتیجہ، بہترین طور پر، ایک تعطل تھا، لیکن بہت سے لوگوں نے اسے مصر کے لیے ایک دھچکا سمجھا۔ اسرائیل نے ابتدائی حیرت انگیز حملے سے کامیابی کے ساتھ سر توڑ جواب دیا اور دوبارہ بالادستی حاصل کر لی۔

جنگ کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے سادات کے ارادوں اور حکمت عملی پر اہم بحث کو جنم دیا:

کیا اس کا مقصد مصری سرزمین پر دوبارہ دعویٰ کرنے کے لیے حقیقی جنگ چھیڑنا تھا، صرف اسرائیل کی فوجی صلاحیتوں اور امریکہ کی بے دریغ حمایت سے مغلوب ہو کر اسے امن کی طرف لے جانا تھا؟ یا جنگ شروع سے ہی ایک محدود آپریشن کے طور پر تیار کی گئی تھی، جو سیاسی تعطل کو توڑنے، اس کی قانونی حیثیت کو قائم کرنے، اور بالآخر طاقت کے مقام سے امن مذاکرات کو آگے بڑھانے کے لیے بنائی گئی تھی؟

شواہد تیار ہو رہے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اکتوبر کی جنگ میں سادات کا بنیادی مقصد اسرائیل کے ساتھ امن کی منزل طے کرنا تھا۔ اس تشریح کی حمایت کرنے والے اہم نکات میں شامل ہیں:

1. اکتوبر کے جنگی کمانڈروں کے بیانات

ایک سے زیادہ کمانڈر سادات کو یاد کرتے ہیں جو جنگ سے پہلے کہتے تھے، "مجھے آپ کی ضرورت ہے کہ آپ نہر کے مشرق میں 10 سینٹی میٹر کو آزاد کرو؛ باقی مجھ پر چھوڑ دو۔"[1] یہ جنگ کو سفارتی مذاکرات کی جانب ایک قدم کے طور پر استعمال کرنے کے پہلے سے طے شدہ منصوبے کی سختی سے نشاندہی کرتا ہے۔ جنگ سے قبل سادات سے ملنے والی غیر فوجی شخصیات نے بھی اسی طرح کے جذبات کی تصدیق کی ہے۔[2]

2. قبل از وقت امن کی تجاویز

جب کہ عوامی توقعات کا جھکاؤ سینائی کی آزادی سے لے کر مسلسل فوجی پیشرفت کی طرف تھا، امید کے ساتھ، یروشلم سادات نے امن کی تجویز پیش کر کے اور میدان جنگ کی حرکیات کو تبدیل کرنے سے پہلے اسرائیل کا دورہ کرنے کی تیاری کا اظہار کر کے مبصرین کو حیران کر دیا۔ اس سے اس کے وسیع مقاصد کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے۔

---

[1] محمد فوزی، حرب اکتوبر: دراسہ و درس، ص124

[2] صلاۃ خلف، ص، 195-6، 200

3. امن کی غیر سمجھوتہ جستجو

سادات کا امن معاہدے کو حتمی شکل دینے کا عزم، یہاں تک کہ سیاسی ہلچل کی قیمت پر، دو وزرائے خارجہ سمیت اعلیٰ سطح کے استعفوں کا باعث بنا۔ اس کے پُر عزم اعلان، "اکتوبر کی جنگ آخری جنگ ہے،" نے مصر کی مذاکراتی پوزیشن کو کمزور کر دیا اور معاہدے کے لیے اس کی غیر متزلزل وابستگی کو اجاگر کیا۔

4. اسرائیلی خلاف ورزیوں پر نرمی

امن مذاکرات کے دوران اور اس کے بعد، سادات نے اہم اسرائیلی اقدامات کی کم سے کم مخالفت کا مظاہرہ کیا، جیسے عراق پر بمباری اور یروشلم کو اس کا متفقہ دارالحکومت قرار دینا جس نے مصر کو سیاسی طور پر شرمندہ کیا۔ اس کے برعکس، وہ اکثر دیگر عرب اقوام کے ساتھ تعزیت اور تکبر سے پیش آتے تھے۔

5. مغربی طاقتوں کے ساتھ صف بندی

سادات کی مغربی ہم آہنگ پالیسیوں کی طرف سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر تبدیلی نے مصر کو امریکی زیر قیادت دائرہ میں مضبوطی سے پوزیشن دینے کے اس کے ارادے کو واضح کیا، اسرائیل کے مغربی حمایتیوں کے ساتھ صف بندی کا اشارہ دیا۔

ان عوامل نے بہت سے لوگوں کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ اکتوبر کی جنگ نے بظاہر معزز شرائط پر اسرائیل کو عرب دنیا میں لانے کے لیے ایک حسابی تدبیر کا کام کیا[1]۔ کچھ دور اندیش مبصرین نے ابتدائی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ جنگ کی ابتدائی فوجی کامیابیاں بالآخر سیاسی مراعات سے گرہن لگیں گی، جس سے جزوی فتح کو ایک جامع شکست میں

1 موشے ساسن، مصریوں کی سرزمین میں 7 سال، صفحہ 234 [عربی ایڈیشن]؛ لیپیڈس، جلد 2، صفحہ 859

تبدیل کر دیا جائے گا[1]۔ جب کہ اسرائیل سرکاری طور پر سینائی سے پیچھے ہٹ گیا، وہ امن کے دروازے سے قاہرہ میں مؤثر طریقے سے داخل ہوا۔

اکتوبر کی جنگ کے دوران، مصری عوام نے بڑے پیمانے پر تنازعہ کو فلسطین کو آزاد کرانے کی وسیع تر جدوجہد کے ایک حصے کے طور پر دیکھا، اکثر یہ سمجھتے تھے کہ فلسطین کے قبضے کو سینائی کے مقابلے میں زیادہ دباؤ کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔[2]

جنگ کے دوران فلسطینی مزاحمتی جنگجوؤں کی شراکت کو اکثر کم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی گوریلا کارروائیوں میں روایتی فوجی کارروائیوں کی اہمیت نہیں تھی، لیکن انہوں نے ایک قابل ذکر کردار ادا کیا۔ انور سادات اور حافظ الاسد دونوں نے فلسطینی لبریشن آرمی ((PLAسے وابستہ فلسطینی جنگجوؤں کی کوششوں کو بروئے کار لایا۔ پی ایل او کی قیادت کے ساتھ ہم آہنگی کے ذریعے، ان جنگجوؤں نے گولان کی پہاڑیوں اور بالائی گلیلی میں اسرائیلی ٹھکانوں کو نشانہ بناتے ہوئے تقریباً100 کارروائیاں کیں۔

اردن کو مربوط کوششوں میں شامل کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ شاہ حسین نے ثابت قدمی سے اپنی سرحدوں کو خاموش رکھنے کی پالیسی کو برقرار رکھا ان جیسے شخص کی طرف سے ایک غیر حیران کن موقف![3]

امن کی طرف اچانک تبدیلی

اسرائیل کے ساتھ امن کے اقدامات کی جڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے سادات کی کوششیں بالکل غیر متوقع نہیں لگتی ہیں۔ شام میں حسینی الزائم جیسی ابتدائی کوششوں کا مقصد امن مذاکرات اور شام اور اسرائیل کے درمیان سرحدیں قائم کرنا تھا۔ تاہم، ڈیوڈ بین گوریون نے ٹائیبیریاس جھیل کے تمام پانیوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے

[1] احمد منصور، ص.97؛ رفاعی طہٰ، والعن اعتذکر، ص80

[2] رفاع طحہ، ص70

[3] صلاۃ خلف، ص202۔

عزائم کی وجہ سے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس سے پہلے، شاہ فاروق کے ماتحت مصر نے بھی امن کی کوششوں کی تلاش کی۔[1]

اس وقت اسرائیل کے ساتھ امن کی وکالت کرنا غداری کے مترادف تھا، پھر بھی اس طرح کے جذبات فضا میں پھیلنے لگے۔ اس تبدیلی کی ابتدائی انتباہات 1953 میں سامنے آئیں، جب سید قطب جیسی شخصیات نے مشرقی یروشلم میں زبردست تقریریں کیں۔ قطب نے کہا، "فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں عرب فوجوں کی ضرورت نہیں ہے،" جب کہ محمود الصوف نے مشہور اعلان کیا، "اسرائیل کے ساتھ امن کے لیے بڑھنے والا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔[2]

اس تناظر میں، سادات پہلے عرب رہنما نہیں تھے جنہوں نے کھل کر اسرائیل کے ساتھ امن کی کوشش کی۔ تاہم، وہ اس طرح کی کوششوں کو باقاعدہ بنانے میں "کامیاب" ہونے والے پہلے شخص بن گئے۔ یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ اسرائیل اور بعض عرب رہنماؤں کے درمیان خفیہ تعلقات سادات کے اقدام سے پہلے تھے۔ ان میں اردن کے شاہ عبداللہ، ان کے پوتے شاہ حسین، مراکش کے بادشاہ حسن[3] دوم اور ان کے طاقتور جنرل محمد اوفکر[4] کے ساتھ خفیہ تعلقات شامل تھے۔

جب وسیع تر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو سادات کا اسرائیل کے ساتھ "امن" کی طرف اچانک تبدیلی ایک غیر متوقع اور ڈرامائی رخصتی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ امن کے لیے مذاکرات کی پچھلی کوششیں مسلسل ناکام رہی تھیں، جس کی بڑی وجہ اسرائیل کے لچکدار موقف کی وجہ سے، 1967 کی جنگ کے دوران اس کی جارحانہ علاقائی توسیع کی وجہ سے مزید بڑھ گئی تھی۔ اس وقت، اسرائیل کو عرب دنیا میں بڑے

---

1 موشے ساسون، p.32 ff

2 ابراہیم غوشہ، ص48

3 صلاح خلف بتاتے ہیں کہ مراکش کے بادشاہ حسن دوم نے سب سے پہلے یاسر عرفات کو عالمی یہودی کانگریس کے سربراہ نہم گولڈ مین کے ساتھ خفیہ ملاقات کا مشورہ دیا۔ دیکھیں فلسطینی بالا حوییہ، ص۔ 309.

4 اوفکر اور اسرائیلیوں کے درمیان تعلقات خاندانی سطح پر پہنچ گئے۔ اپنی کتاب Stolen Lives: Twenty Years in a Desert Jail میں، ملیکہ اوفکر نے بتایا کہ موشے دایان کا بیٹا ان کے دوستوں میں سے ایک تھا اور اس کے والد اس دوستی سے خوش تھے۔ دیکھیں ملیکہ اوفکر، صفحہ 88، 284، 289، 314[عربی ایڈیشن]

پیمانے پر بدنام کیا گیا تھا، جسے فوجی طور پر سامنا کرنے کے لیے ایک مستقل دشمن کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ اکتوبر کی جنگ کے معمولی فوائد نے اس یقین کو تقویت بخشی کہ حقوق کی بحالی کے لیے طاقت کے استعمال کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں، سادات کا امن کی وکالت کرنے والا اعلان اور اسرائیل کا دورہ کرنے کے لیے اس کی ظاہری تیاری ایک گہرے صدمے کے طور پر سامنے آئی، جس نے ملکی اور علاقائی سامعین دونوں کو پریشان کیا۔ اس نے اپنے فیصلے کو یہ کہتے ہوئے معقول بنایا کہ مصر امریکہ کے ساتھ ایک اور تصادم کو برقرار نہیں رکھ سکتا، مشہور طور پر یہ تبصرہ کرتے ہوئے کہ امریکہ خطے میں 99 فیصد کارڈوں پر کنٹرول رکھتا ہے۔ اس راستے پر ثابت قدمی سے عمل کرتے ہوئے، سادات نے اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی وسیع مخالفت کو نظر انداز کیا اور اس حد تک چلے گئے کہ وہ اہم فوجی رہنماؤں کو برطرف کر دیا جنہوں نے اکتوبر کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا تاکہ امن کی طرف اپنی رفتار کو مستحکم کیا جا سکے۔

مذاکرات کا ایک سلسلہ 1978 میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے اور 1979 میں مصر اسرائیل امن معاہدے پر منتج ہوا، جس نے علاقائی حرکیات کو نمایاں طور پر تبدیل کیا اور فلسطینی کاز پر گہرا اثر ڈالا۔

اس معاہدے نے سینائی کو غیر فوجی بنا دیا، مصر کی فوجی موجودگی کو ہلکے ہتھیاروں اور معمولی قوت تک محدود کر دیا۔ سرحدوں کے ساتھ فوجیوں کی تعیناتی کے نقشے واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اسرائیل سینائی پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اس سے کہیں زیادہ صلاحیت رکھتا ہے جتنا کہ مصر اس کے دفاع کے لیے کرتا ہے۔ مؤثر طریقے سے، سینائی ایک بفر زون کے طور پر کام کرتا ہے، اسرائیل کی سٹریٹجک سیکورٹی کو بڑھاتا ہے

اس معاہدے نے سینائی کو غیر فوجی بنا دیا، مصر کی فوجی موجودگی کو ہلکے ہتھیاروں اور معمولی قوت تک محدود کر دیا۔ سرحدوں کے ساتھ فوجیوں کی تعیناتی کے نقشے واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اسرائیل سینائی پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اس سے کہیں زیادہ صلاحیت رکھتا ہے جتنا کہ مصر اس کے دفاع کے لیے کرتا ہے۔ مؤثر طریقے سے، سینائی ایک بفر زون کے طور پر کام کرتا ہے، اسرائیل کی سٹریٹجک سیکورٹی کو بڑھاتا ہے

اسرائیلیوں نے مصری حکام سے اجازت نامے یا اجازت کی ضرورت کے بغیر سینائی تک غیر محدود رسائی حاصل کی - یہ مراعات عام مصریوں تک نہیں ہیں، جنہیں اس علاقے تک رسائی میں محدودیت کا سامنا ہے۔ اس معاہدے نے سفارتی معمول پر لانے کا بھی آغاز کیا، بشمول سفیروں کے تبادلے اور اقتصادی، ثقافتی اور سیکورٹی تعاون کو فروغ دینا۔ یہ تعلقات بعد کی انتظامیہ کے دوران مزید گہرے ہوتے گئے، عبدالفتاح السیسی کے دور صدارت میں اہم سطح تک پہنچ گئے۔

1981 میں سادات کے قتل کے بعد، حسنی مبارک نے 30 سال تک امن کی پالیسی کو برقرار رکھا، باوجود اس کے کہ اسرائیل کی جانب سے معاہدے کی بار بار خلاف ورزیوں اور خطے میں جارحانہ اقدامات کیے گئے۔ مبارک کے دور میں اسرائیل کے ساتھ امن مصر کی خارجہ پالیسی کا مرکزی اصول بن گیا۔

سب سے اہم نتیجہ مصر کا فلسطینی جدوجہد سے دستبردار ہونا تھا۔ عرب قوم پرستی سے تنگ قوم پرستی کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہوئے، مصر نے فلسطین کو ایک "مقامی مسئلہ" کی طرف دھکیل دیا، اس کی ذمہ داری صرف اور صرف فلسطینیوں پر چھوڑ دی۔

عرب اسرائیل نارملائزیشن کو تین الگ الگ اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. پبلک نارملائزیشن: مصر کے اسرائیل کے ساتھ کھلے عام اعلان کردہ امن معاہدے کی مثال
2. خفیہ تعلقات: بعض عرب حکومتوں اور اسرائیل کے درمیان خفیہ تعاملات
3. امن کے لیے مشروط وکالت: عوام جامع امن کا مطالبہ کرتے ہیں جس کا انحصار 1967 کی سرحدوں سے اسرائیل کے انخلاء پر ہے۔

سادات کی طرف سے شروع کی گئی واضح طور پر معمول پر آنے کا راستہ احتیاط سے سامنے آیا اور 6 اکتوبر 1981 کو مصری فوج کے اسلام پسند ارکان کے ہاتھوں ان کے قتل سے اس کی گہرائی سے تشکیل ہوئی۔ اس واقعہ نے پورے خطے میں صدمے کی لہریں بھیج دیں، دوسرے لیڈروں کو اسرائیل کے ساتھ امن معاہدوں پر عمل کرنے کی حوصلہ شکنی کی اور تقریباً چار دہائیوں سے عام ہونے کو مؤثر طریقے سے روک دیا۔ نتیجتاً، مصر کی معمول پر لانے

کی کوششیں زیادہ تر سرکاری اور سیاسی شعبوں تک محدود رہیں، شاذ ونادر ہی عوامی جذبات یا نچلی سطح کی مصروفیت میں اضافہ ہوا۔

مصر اور اسرائیل کے درمیان فوجی، سیکورٹی اور اقتصادی تعاون میں بتدریج ترقی ہوئی،[1] اردن ایک اہم استثناء کے ساتھ۔ اردن نے سادات کی موت کے 13 سال بعد 1994 میں اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کیا۔ تاہم، یہاں تک کہ اردن کا معمول پر لانے کا عمل بھی محتاط تھا، بنیادی طور پر سیاسی اور سیکورٹی ڈومینز تک محدود۔ عوامی سطح پر، اردن نے فلسطینیوں کے حقوق کے لیے بھرپور حمایت برقرار رکھی اور اسرائیلی جارحیت کی کھل کر مخالفت کی، اس کا میڈیا اکثر ان موقف کی عکاسی کرتا ہے۔

عرب بہار کے زوال کے نتیجے میں معمول پر آنے کی ایک نئی لہر ابھری، جس کی قیادت 2020 کی دہائی کے اوائل میں متحدہ عرب امارات نے کی۔ بحرین، مراکش اور سوڈان نے جلد ہی اس کی پیروی کی۔ اس وقت سعودی عرب اور اسرائیل کے درمیان معمول پر لانے کے بارے میں بات چیت جاری ہے۔ سعودی عرب کے معاشی تسلط، جغرافیائی سیاسی اثر ورسوخ، اور حرمین شریفین کے متولی کے طور پر اس کے کردار کو دیکھتے ہوئے، اس طرح کی ترقی علاقائی حرکیات کو نمایاں طور پر نئی شکل دے سکتی ہے، جس سے ممکنہ طور پر مزید عرب اور اسلامی ممالک کے لیے اسرائیل کے ساتھ باضابطہ تعلقات قائم کرنے کی راہ ہموار ہو گی۔

خفیہ تعلقات کا راستہ اسرائیل اور اردن اور مراکش جیسے ممالک کے درمیان قائم اور جاری چینلز کے ساتھ عرب اسرائیل سفارت کاری کا ایک محتاط لیکن مستقل پہلو رہا ہے۔

اسرائیل کے انخلاء پر مبنی دیرپا امن کی وکالت کرنے والے عوامی اقدامات مصر کے اسرائیل کے ساتھ معمول پر آنے کے فوراً بعد سامنے آئے۔ 1981 میں، سعودی ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز نے ایک امن اقدام کی تجویز پیش کی جو کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے اور 1948 کے بعد کے علاقائی فوائد کو قبول کرنے کے لیے متنازعہ ہونے کے باوجود عرب سفارت کاری میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس اقدام کو 1981 اور 1982

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں موشے ساسن، صفحہ 114، 124، 159، 275-76

میں فیز، مراکش میں ہونے والے عرب سربراہی اجلاس میں پیش کیا گیا تھا، جس کی اکثریت سے منظوری حاصل ہوئی اور ایک سرکاری عرب تجویز بن گئی۔ اس کے باوجود اسرائیل نے اوورچر کو مسترد کر دیا۔ دو دہائیوں کے بعد، سعودی شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے 2003 میں بیروت میں عرب لیگ کے سربراہی اجلاس میں اسی طرح کے اقدام کو بحال کیا، جس کو دوبارہ عرب حمایت حاصل ہوئی، صرف ایک بار پھر اسرائیل نے اسے نظر انداز کر دیا۔

مصر کے انخلاء کے بعد فلسطینی کاز

جبکہ مصر عددی اعتبار سے 23 عرب ریاستوں میں سے ایک ہے، لیکن اس کا جغرافیائی سیاسی اور آبادیاتی وزن بے مثال ہے۔ عرب دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے اور عرب ممالک میں سب سے مضبوط فوج رکھنے والے مصر کی اسرائیل کے خلاف اجتماعی جدوجہد سے دستبرداری کسی ایک ریاست کے نقصان سے کہیں زیادہ بڑا دھچکا تھا۔ فلسطین اور اسرائیل دونوں کی سرحد سے متصل اس کا سٹریٹجک مقام اس کی اہم اہمیت کو مزید واضح کرتا ہے، کیونکہ تنازعہ سے مصر کی عدم موجودگی نے عرب فوجی اور سیاسی فائدہ کی اکثریت کو نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ خالصتا قوم پرست یا سیکولر نقطہ نظر سے، مذہبی یا پین عرب نظریات سے الگ، فلسطین مصر کے لیے قومی سلامتی کا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے، اس کی قربت اور اس کے عدم استحکام کے علاقائی مضمرات کو دیکھتے ہوئے۔

اسرائیل کے ساتھ امن قائم کرنے کے سادات کے یکطرفہ فیصلے نے پوری عرب دنیا، خاص طور پر فلسطینیوں میں صدمے کی لہر دوڑادی۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے پہلے ایسا اقدام ناقابل فہم تھا۔ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے نائب رہنما نے مشہور طور پر کہا، "کوئی عرب ریاست ہمارے بغیر کسی تصفیے پر راضی نہیں ہوگی، جتنا ہمارے خلاف ہو۔[1]" تاہم، بعد میں عکاسی کرتے ہوئے، انہوں نے تبصرہ کیا، "اکتوبر کی جنگ، فلسطینیوں اور

[1] صلاۃ خلف، ص 13

عرب دنیا کے لیے، محض ایک مختصر مہلت تھی۔ مقبوضہ علاقوں کی آزادی کو آگے بڑھانے کے بجائے، اس نے مشرق وسطیٰ میں امریکی اثر ورسوخ کو مضبوط کیا اور فلسطینی مزاحمت کو ختم کرنے کی کوششوں میں سہولت فراہم کی۔[1]

امن معاہدے کے گہرے علاقائی اثرات مرتب ہوئے، جس نے اسرائیل کی پوزیشن کو نمایاں طور پر مضبوط کیا اور زیادہ علاقائی چالوں کو قابل بنایا۔ معاہدے کے بعد ہونے والے اہم واقعات میں شامل ہیں:

- **یکم مئی 1980:** مسجد اقصیٰ کو اڑانے کی کوشش، یروشلم پر بڑھتی ہوئی کشیدگی کو اجاگر کرنا۔
- **30 جولائی 1980:** اسرائیل نے یروشلم کو اپنا "ابدی، غیر منقسم دارالحکومت" قرار دیا، اس حیثیت کو اپنے آئینی فریم ورک میں شامل کیا۔
- **جون 1981:** شرم الشیخ میں سادات اور اسرائیلی وزیر اعظم میناچم کے درمیان ہونے والی ملاقات کے چند دن بعد اسرائیل نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر فضائی حملہ کیا۔
- **1982 لبنان پر حملہ:** اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا، بیروت پہنچ کر براہ راست یا اتحادیوں کے ذریعے کئی قتل عام کیا۔ صابرہ اور شتیلہ قتل عام (ستمبر 16-18، 1982) کے نتیجے میں 1,000 سے 3,000 فلسطینی پناہ گزینوں کی موت ہوئی.

سعودی وزیر غازی الگوسائیبی نے ان پیش رفتوں پر غور کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھا، "لبنان کے بحران نے ثابت کر دیا کہ مصر کے بغیر عرب دنیا اسرائیل کے ساتھ عسکری طور پر شامل نہیں ہو سکتی۔ عرب اسرائیل تنازعہ میں مصر کو بے اثر کرنا ایک سبز روشنی کے طور پر کام کرتا ہے، جس سے اسرائیل کو خطے پر تسلط قائم کرنے کی اجازت ملتی ہے۔[2]

---

[1] Ibid., pp.211, 326

[2] غازی الگوسابی، الوزیر المرافق، ص202

اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ مصری حکومت اس طرح کے مظالم کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے میں ناکام رہی۔ مصر میں اسرائیلی سفیر کو مبینہ طور پر اس بات پر حیرت ہوئی کہ صابرہ اور شتیلا کے قتل عام کے بعد مصر کا واحد رد عمل اسرائیل سے اپنے سفیر کو واپس بلانا تھا۔ مزید بر آں، مصری حکام نے امریکہ کو یقین دلایا کہ یہ انخلاء ان کے ارادے میں اضافے کی حد تک ہے جو مصر سے اسرائیل کی کم سے کم توقعات سے بھی کم ہے۔

غزہ کا مسئلہ جس پر اسرائیل نے مصر سے قبضہ کر لیا تھا، بھی اسی موقف کی عکاسی کرتا ہے۔ مصری حکومت غزہ کی آزادی کے لیے خود کو ذمہ دار نہیں سمجھتی تھی، باوجود اس کے کہ اس علاقے کے نقصان میں اس کا براہ راست کردار تھا۔ اس کے بجائے، اس نے غزہ کو خصوصی طور پر فلسطینی معاملہ قرار دیا۔

اس نے فلسطین کو سیاسی طور پر یتیم کر دیا، اس کی وسیع عرب اور اسلامی شناخت سے منقطع ہو گیا، یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز برطانوی قبضے سے ہوا۔ مصطفیٰ کمال کی خلافت کے خاتمے نے فلسطین کے لیے ذمہ داری کے اسلامی ڈھانچے کو مزید ختم کر دیا، جس سے اس کی آزادی کے فریضے کو بکھری ہوئی عرب ریاستوں کے درمیان بکھیر دیا گیا، جن میں سے کسی نے بھی مکمل طور پر کردار ادا نہیں کیا۔ عرب قوم پرست حکومتوں نے بعد میں بیان بازی سے کارروائی کی جگہ لے لی، بالآخر فلسطین کے باقی ماندہ حصے کو صیہونی کنٹرول کے حوالے کرنے سے پہلے خالی نعرے لگائے۔ اس کے بعد، امن کے معاہدوں اور معمول کے معاہدوں کے دور نے اس ترک کو مزید مضبوط کر دیا، جس سے آزادی کے لیے کوئی ٹھوس کوشش نہ کی گئی، فلسطین کو قبضے میں رکھا گیا۔

صرف سطحی سطح پر تاریخی ریکارڈ کی جانچ کرنے والوں کے لیے یہ واقعات ایک المناک رفتار پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود عینی شاہدین کے اکاؤنٹس اور ڈی کلاسیفائیڈ دستاویزات میں گہرا غوطہ لگانے سے ایک اور بھیانک حقیقت سامنے آتی ہے۔ فلسطین کا زوال محض غفلت یا غیر فعال دھوکہ دہی کا نتیجہ نہیں تھا۔ فعال تعاون سے اس میں اضافہ ہوا، جہاں کچھ عرب لیڈروں نے صہیونیوں کے ساتھ مل کر نہ صرف فلسطین کے

خلاف سازش کی بلکہ بعض اوقات، سیاسی طاقت اور اختیار کو حاصل کرنے یا اسے برقرار رکھنے کے لیے اپنی ہی قوموں کے خلاف سازش کی۔

اسرائیلیوں نے بستیوں کی تعمیر میں تیزی لائی اور غزہ اور مغربی کنارے میں یہودیوں کی موجودگی کو بڑھایا، جس سے زمین، پانی اور وسائل کی تخصیص کی ایک مسلسل لہر شروع ہوئی۔ اس سے فلسطینیوں کے پاس اسرائیلی کنٹرول میں ملازمت حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا، جس سے قابض پر ان کا انحصار بڑھ گیا۔ مزید برآں، اسرائیل نے اپنی موجودگی کو معمول پر لانے، سماجی تانے بانے کو تبدیل کرنے، اور فلسطینی ثقافتی اور فکری دائروں میں دراندازی کرنے کے لیے متعدد سطحی پروگراموں کو نافذ کیا۔

ان بڑھتے ہوئے دباؤ کے جواب میں، فلسطینیوں نے تسلیم کیا کہ اپنے وطن کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے خود انحصاری کی ضرورت ہے۔ تاہم، یہ جدوجہد مشکل تھی - طاقت کے مکمل عدم توازن کی وجہ سے تقریباً ایک ناممکن جنگ۔ اسرائیلی فوج کا غلبہ، وسیع پیمانے پر بین الاقوامی حمایت سے تقویت یافتہ، اور وسیع پیمانے پر عربوں کی بے وفائی نے بے حسی اور ترکِ وطنی میں ظاہر ہونے والے چیلنجوں کو مزید بڑھا دیا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود فلسطینیوں نے اپنی مزاحمت کو کبھی ترک نہیں کیا۔ اس کے بجائے، انہوں نے امن معاہدوں اور معمول پر لانے کے دور میں انحراف کی اپنی سب سے مضبوط لہر شروع کی، جو اپنے مقصد کے لیے ان کی غیر متزلزل وابستگی کا اشارہ ہے۔

پوری تاریخ میں، غالب فاتحوں نے اکثر ان لوگوں کی ثقافتوں کو ختم یا جذب کیا ہے جنہیں انہوں نے محکوم بنایا تھا۔ مثالوں میں آسٹریلیا اور امریکہ میں مقامی آبادی کا خاتمہ یا انضمام اور اندلس اور مشرقی یورپ کے کچھ حصوں میں مسلمانوں کی جبری تبدیلی یا قتل عام شامل ہیں۔ جب ظالم زبردست طاقت کے مالک ہوتے ہیں اور صرف استحصال یا محکومی کی بجائے تباہی اور استعمار کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو وہ اکثر مزاحمت کو کچلنے اور فتح پانے والوں کی تقدیر بدلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

فلسطین کا بھی ایسا ہی انجام ہو سکتا تھا اگر یروشلم اور مسجد اقصیٰ کی موجودگی نہ ہوتی جو اسلامی عقیدے کا مرکز ہے، جس کا قرآن میں حوالہ دیا گیا ہے، اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے دل کی گہرائیوں سے قدر کی جاتی ہے۔ ان مقدس مقامات نے فلسطینی مزاحمت کو ایک گہرا روحانی لنگر فراہم کیا ہے، جو عزم کے ایک غیر متزلزل ذریعہ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ عقیدے سے اس تعلق نے ان حالات میں مزاحمت کو مضبوط کیا جو بصورت دیگر مکمل محکومی یا ثقافتی مٹانے کا باعث بن سکتے تھے۔

ابتدائی طور پر، فلسطینی مزاحمت اسلامی اور غیر اسلامی دونوں دھڑوں پر محیط تھی، بعد میں ایک مدت تک غلبہ حاصل کیا۔ پھر بھی، یروشلم کی روحانی اور مذہبی گہرائی نے بتدریج اسلامی تحریکوں کی طرف مزاحمت کی قیادت کو آگے بڑھایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، غیر اسلامی دھڑے کمزور ہوئے، زوال پذیر ہوئے، یا بعض صورتوں میں، قبضے کے ساتھ تعاون کیا۔ سیاسی لہروں کے اتار چڑھاؤ کے باوجود، مزاحمت کی اسلامی بنیاد ثابت قدم ہے، فلسطینی مزاحمت کے پائیدار جذبے کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ قبضے اور جبر کے خلاف ان کی جدوجہد کا سنگ بنیاد ہے، یہاں تک کہ جب دیگر تحریکیں ناکام ہو گئیں یا مقصد سے ہٹ گئیں۔

غیر اسلامی مزاحمتی تحریکیں

نکبہ کے بعد فلسطینی مزاحمت وقفے وقفے سے برقرار رہی، رضاکارانہ کوششوں سے اس وقت تک برقرار رہی جب تک کہ یہ 1956 کی جنگ کے بعد بڑی حد تک ختم نہ ہو گئی۔ قابل ذکر تعاون کرنے والوں میں اخوان المسلمین کے ارکان، جیسے کمال الشریف، غزہ اور سینائی کے رضاکاروں کے ساتھ شامل تھے۔

یاسر عرفات کی قیادت میں 1957 میں کویت میں الفتح کا قیام ایک اہم موڑ تھا۔ اگرچہ یہ تحریک ایک اسلامی رجحان کے ساتھ شروع ہوئی، جس نے اخوان المسلمین کے نوجوانوں پر بہت زیادہ اثر ڈالا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں متنوع نظریاتی دھڑوں کو شامل کرنے کے لیے توسیع ہوئی، بالآخر ایک سیکولر موقف اختیار کیا۔ فتح نے 1964 کے آخر میں اپنا پہلا فوجی آپریشن شروع کیا، جو کہ مزاحمت میں اس کی فعال مصروفیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

عرب حکومتوں سے الگ ایک آزاد فلسطینی مزاحمتی تحریک کے عروج کو سمجھنے کے لیے ان عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہے جنہوں نے اس کی تشکیل کو تحریک دی:

1. **عرب حکومتوں کے ساتھ مایوسی:** عرب حکومتوں کی بے عملی سے بڑھتی ہوئی مایوسی، خاص طور پر مصر جس کو 1956 میں اسرائیلی حملے کا سامنا کرنا پڑا لیکن فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے میں ناکامی نے خود انحصاری کے اقدام کی خواہش کو جنم دیا۔
2. **الجزائر کے انقلاب سے تحریک:** الجزائر کی فرانس سے آزادی کی کامیاب لڑائی نے فلسطینیوں کو ایک طاقتور مثال فراہم کی کہ ایک پرعزم، خود انحصار قوم کیا حاصل کر سکتی ہے۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ عرب فوجوں یا طویل عرصے سے وعدہ شدہ لیکن غیر حقیقی اتحاد کے بغیر آزادی ممکن تھی، یہ ثابت کرتی ہے کہ آزادی اتحاد سے پہلے ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] اس وقت فلسطینی تحریک کے نوجوانوں پر الجزائر کے انقلاب کے اثرات کے بارے میں، دیکھیں صلاح خلف، صفحہ 67؛ احمد جبریل، ذاکرت الثورۃ الفلستینیہ المعصرہ، صفحہ 36، 40، 53، 57۔ ہم اس مطالعے کے آخر میں پیش کیے گئے نتائج میں الجزائر اور فلسطین کے درمیان مماثلتوں پر بات کرنے کے لیے واپس آئیں گے۔

3. **مسلح جدوجہد پر یقین:** ایک احساس ابھر کر سامنے آیا کہ فلسطینیوں کو ان کے مقصد کے لیے متحد کرنے اور ان کی حالت زار پر بین الاقوامی توجہ دلانے کے لیے مسلح مزاحمت ہی واحد قابل عمل راستہ ہے۔
4. **بے عملی سے مایوسی:** فلسطینیوں نے عرب حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کے نامکمل بیانات سے آگے بڑھنے کی فوری ضرورت کو تسلیم کیا، جو نعروں اور تقاریر کو بامعنی عمل میں تبدیل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

اس سیاق و سباق نے ایک الگ فلسطینی مزاحمتی تحریک کے ابھرنے کی بنیاد رکھی، جس کی خصوصیت اس کے نظریاتی تنوع اور فلسطین پر دوبارہ دعویٰ کرنے کے عزم، اس کے ارتقاء اور مسلسل جدوجہد کی منزلیں طے کرتی ہے۔

یاسر عرفات، تحریک الفتح کے رہنما اور مصر میں مقیم فلسطینی طلباء کی ایک اہم شخصیت کے ساتھ داستان دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ عرفات اخوان المسلمون سے وابستہ تھے اور فلسطینی طلبہ یونین کی قیادت کرتے تھے جو کہ 1957 تک بنیادی طور پر اسلام پسندوں یا ان کے اتحادیوں کے زیر اثر تھی۔ ناصر کی حکومت میں اخوان المسلمون پر شدید کریک ڈاؤن کے بعد اسلامی قیادت کا یہ دور اچانک ختم ہو گیا۔

خلیل الوزیر، جسے بعد میں ابو جہاد کے نام سے جانا جاتا ہے، تین دہائیوں تک الفتح کا دوسرا کمانڈر بن گیا۔ غزہ میں اخوان المسلمون کا رکن، اس نے کمال الشریف کی قیادت میں مزاحمتی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تاہم، الوزیر کو ناصر حکومت کی طرف سے بار بار گرفتاریوں اور بالآخر جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا، جس نے غزہ کے اندر کام کرنے کی اس کی صلاحیت کو کم کر دیا۔ اس نے اسے پہلے قاہرہ، پھر سعودی عرب اور بالآخر کویت منتقل ہونے پر مجبور کیا، جہاں اس نے فتح کے قیام کی کوششوں میں شمولیت اختیار کی۔

الفتح کے بانی ارکان کی جانچ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے افراد کا تعلق اخوان المسلمون سے تھا۔ قابل ذکر شخصیات میں سعید المزین، غالب الوزیر، سلیم الزعنون، صلاح خلف، اسعد الصفتوی، محمد یوسف النجر، کمال عدوان، اور

رفیق النطشہ شامل ہیں۔ ابتدائی طور پر، الفتح نے اپنے اسلامی تعلقات کو برقرار رکھا، 1963 تک اخوان کے ارکان کو شامل کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دائرہ کار کو وسیع کیا، مختلف نظریاتی اور سیاسی پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد کا خیر مقدم کرتے ہوئے، ایک سیکولر قوم پرست تحریک میں اس کی تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔[1]

صفحہ 185

اگر یاسر عرفات اخوان المسلمین کے قریب تھے، الفتح کے دوسرے کمانڈر ان کی صفوں میں سے تھے، اور اس کے بہت سے بانی اور ارکان اسلام پسند تھے، تو فتح اخوان کے ساتھ مل کر اسلامی تحریک میں کیوں تبدیل نہیں ہوئی؟ مزید یہ کہ یہ ایک سیکولر قوم پرست تنظیم کیسے بنی، اور 1980 کی دہائی کے اواخر میں پہلی انتفادہ کے دوران اسلام پسند اپنے دوبارہ وجود میں آنے تک مزاحمت کی صف سے کیوں غائب تھے؟

اس کا جواب اسلامی تحریکوں کے لیے تباہ کن ضربوں میں مضمر ہے، خاص طور پر ان کے دو بڑے گڑھ مصر اور لیونٹ میں۔ مصر میں، اخوان المسلمین کو 1954 میں جمال عبد الناصر کی قیادت میں ایک شدید کریک ڈاؤن کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد 1965-66 میں ایک اور سخت مہم چلائی گئی، جس کا اختتام 1966 میں ممتاز رہنما سید قطب کو پھانسی دینے پر ہوا[2]، اسی طرح شام میں، اخوان المسلمون کو سخت سزا کا سامنا کرنا پڑا، جس میں رکنیت کے خلاف قانون سازی کی گئی۔ موت شام میں جبر کی لہریں تقریباً دو دہائیوں تک جاری رہیں، جو 1980 کی دہائی کے وسط میں عروج پر تھیں[3]۔ 3 مزید بر آں، اسرائیل کے مغربی کنارے اور غزہ پر قبضے کے بعد، بہت سی اہم اسلامی شخصیات کو مزاحمتی رہنما بننے سے روکنے کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔[4]

دوسری طرف، اردن نے جبر کے بجائے کنٹینمنٹ کا ایک مختلف انداز اپنایا۔ یہ اردن کی حکومت کے کمزور داخلی استحکام اور مصر، عراق اور شام میں پان عرب قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر کے زیر سایہ ہونے کے خوف سے پیدا

[1] احمد منصور، صفحہ 75-76؛ ابراہیم گوشیہ، صفحہ .68؛ محسن صالح، صفحہ .78۔

[2] احمد منصور، صفحہ 66،77

[3] عبداللہ عزام، ج 1، ص 850

[4] احمد منصور، صفحہ 71-72

ہوا ہے۔ اس طرح اردن ظلم و ستم سے بھاگنے والے اسلام پسندوں کی پناہ گاہ بن گیا۔ تاہم، ان کی نازک صورت حال نے ان کے پاس بغاوت کرنے یا باقاعدہ مزاحمتی تحریک کو منظم کرنے کا بہت کم موقع چھوڑا۔ اندرونی ٹوٹ پھوٹ اور ان کی قیادت کے بکھرنے نے اس ہنگامہ خیز دور میں ساختی مزاحمت میں شامل ہونے کی ان کی صلاحیت کو مزید روک دیا۔

زبردست چیلنجوں کی وجہ سے موجودہ کمزوری کے درمیان، اسلامی تحریکوں نے ایک ایسا راستہ تلاش کیا جو ان کی حالت اور ان کی مایوسی کی نوعیت کے مطابق ہو۔ انہوں نے یہ عقیدہ اپنایا کہ فلسطین کی آزادی صرف اس کے عوام کی کوششوں سے حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ صیہونیوں اور ان کے اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کمزور سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بجائے، انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ آزادی ایک اسلامی ریاست کے قیام کے ذریعے آئے گی جو اس اہم کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اس عقیدے نے مؤثر طریقے سے کوششوں کو صیہونیوں کے خلاف فعال مزاحمت سے ہٹ کر تعلیمی، علمی اور میڈیا پر مبنی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کی جس کا مقصد اسلامی ریاست کی بنیاد بنانا ہے۔ نتیجتاً اسلامی تحریک جاری مزاحمت سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ان اراکین کے خلاف بھی سخت موقف اپنایا جنہوں نے فعال مزاحمت میں حصہ لینے کا انتخاب کیا، انہیں نکال دیا اور لڑائی کے لیے مصروف عمل دوسرے گروپوں سے خود کو دور کیا۔ شکست کا پیمانہ اسلام پسندوں پر بہت زیادہ وزنی تھا، جس نے پیچھے ہٹنے اور براہ راست مشغولیت کے بجائے بقا پر توجہ مرکوز کرنے کے رجحان کو فروغ دیا۔

اس نقطہ نظر کو اندرونی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلامی تحریکوں کے بہت سے ارکان نے بائیں بازو، قوم پرست اور دیگر دھڑوں میں شمولیت اختیار کی۔ تحریک کے اندر کچھ دھڑوں نے اپنا راستہ درست کرنے کی کوشش کی،

بغاوتیں شروع کیں، یا الگ الگ گروہ تشکیل دیے، لیکن یہ کوششیں آخر کار ناکام ہوئیں۔ تاہم، ان ناکامیوں نے 1980 کی دہائی کے اوائل میں اسلامی مزاحمتی تحریک، یا حماس کے ابھرنے کی راہ ہموار کی۔[1]

اس بات پر زور دینے کے قابل ہے کہ اسلام پسندوں کی طرف سے اپنایا گیا نظریہ، فلسطین کی آزادی کے لیے ایک ریاست کے قیام کا تصور، ان کے لیے منفرد نہیں تھا۔ نکبہ کے بعد بننے والی بہت سی سیاسی تحریکیں، خاص طور پر عرب قوم پرست جماعتوں نے بھی اسی طرح کی بنیاد کو اپنایا۔ ان گروہوں نے دلیل دی کہ فلسطین کی آزادی صرف فلسطینیوں کی استطاعت سے باہر ہے، اس کی بجائے اسے ایک پین عرب کاز کے طور پر بنایا گیا۔ ان کے وژن نے فلسطین کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کے پیش خیمہ کے طور پر عرب دنیا کو متحد کرنے کو ترجیح دی،[2] ایک ایسا تناظر جو اس وقت بہت سے فلسطینیوں کے ساتھ گونجتا تھا[3]۔

اس مشترکہ بنیاد کے باوجود، اسلام پسند اور قوم پرست اپنی رفتار میں مختلف ہو گئے۔ اسلام پسندوں کو سخت جبر کے دور کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر مصر اور شام میں، جہاں ان کی تحریکوں کو منظم طریقے سے ختم کر دیا گیا۔ دریں اثنا، عرب قوم پرستوں نے عرب قوم پرستی کے عروج کے دوران انہی ممالک میں نمایاں اثر و رسوخ کا لطف اٹھایا۔ اگرچہ اسلام پسندوں کی پسپائی کو ان کی کمزور حالت اور مسلسل ظلم و ستم سے منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن قوم پرستوں کو خاطر خواہ پیش رفت حاصل کرنے میں ناکامی کے لیے زیادہ جانچ پڑتال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو اکثر بیان بازی کی حمایت تک اپنی شراکت کو محدود کرتے ہیں۔

بالآخر، آزادی کی جدوجہد شروع کرنے کی ذمہ داری نہ تو اسلام پسندوں کی تھی اور نہ ہی قوم پرستوں پر، بلکہ "محب وطن" پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے کہا کہ فلسطینی خود اس قابل ہیں یا کم از کم آزادی کی جنگ شروع کرنے

[1] ابراہیم غوشہ کی یادداشتیں، سرخ مینار، اور عدنان مسعودی کی یادداشتیں، ٹوکنفرنٹیشن کا حوالہ دیں۔ دونوں رہنماؤں نے اسلامی تحریک کے راستے کو درست کرنے کی کوشش کی، اسے مزاحمتی کوششوں میں شامل ہونے پر زور دیا، حالانکہ وہ ناکام رہے۔ بعد میں دونوں حماس کے کلیدی رہنما اور بانی بن گئے۔

[2] منیر شفیق، من جمر الاجمر، ص84ف

[3] صلاۃ خلف، ص47، 66، 100؛ احمد جبریل، صفحہ 53، 87

میں قیادت کر سکتے ہیں۔ اس نقطہ نظر نے فلسطینی عوام کی ایجنسی اور عزم پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے وسیع نظریاتی فریم ورک پر انحصار سے علیحدگی کی نشاندہی کی۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدوجہد کا بوجھ اٹھانے والے نہ تو اسلام پسند تھے اور نہ ہی قوم پرست بلکہ وہ "محب وطن" تھے، جن کا ماننا تھا کہ فلسطینی اگر پوری طرح سے اہل نہیں ہیں تو کم از کم آزادی کی کوششوں کو آزادانہ طور پر شروع کرنے کے پہلے قدم اٹھانے میں۔ اس مقام سے، فلسطینی قومی تشخص ابھرنا، مضبوط ہونا اور گہرا ہونا شروع ہوا، ایک ایسی ترقی جس سے فوائد اور چیلنجز دونوں سامنے آئے۔

الفتح نے اس تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا، جس نے فلسطینی کاز کو عرب حکومتوں کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک مشکل سیاسی ماحول میں، جتنا ممکن ہو، آزادانہ طور پر کام کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔ فتح نے اپنی فیصلہ سازی میں خود مختاری کو برقرار رکھنے اور زیادہ طاقتور عرب ریاستوں کے اثر و رسوخ کو نیویگیٹ کرنے کے درمیان محتاط توازن قائم کرنے کی بھی کوشش کی، ہر ایک مسئلہ فلسطین پر کنٹرول کے لیے کوشاں ہے۔ دریں اثنا، عرب اور علاقائی سیاست نے اپنے مقاصد کے لیے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔ بعض اوقات انہوں نے عرب اتحاد کی آڑ میں فلسطینی کاز کا ساتھ دیا، جب کہ بعض اوقات انہوں نے ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ فلسطینی خود ان کی جدوجہد کے حقدار اور خود مختار محافظ ہیں۔

منظم فلسطینی مزاحمت کا آغاز اس وقت ہوا جب فتح نے دسمبر 1964 میں اپنا عسکری ونگ الآصفہ (The Storm) قائم کیا، جس نے دسمبر 1964 میں آپریشن شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، الفتح کا سیکولر اور قوم پرست کردار اتنا واضح ہو گیا کہ اس کے ابتدائی اسلامی اثرات تقریباً مکمل طور پر مٹنے لگے۔

اس ابتدائی دور میں فتح تنہا نہیں تھی۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے طلباء میں شروع ہونے والی عرب نیشنلسٹ موومنٹ نے ابتدا میں نصیریت کے ساتھ منسلک قوم پرست موقف اپنایا۔ جارج حبش اس کی نمایاں شخصیات میں سے ایک تھا۔ یہ تحریک بعد میں مارکسی نظریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور 1967 تک دوسرے چھوٹے گروپوں کے ساتھ متحد ہو کر پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین((PFLP تشکیل دی۔

اس صورتحال نے جمال عبدالناصر کی طرف سے تشویش اور شکوک کو جنم دیا، جس نے پہلے ہی آل فلسطین حکومت کو ختم کر دیا تھا اور اس کے رہنما امین الحسینی اور اس کی انتظامیہ کو اس وقت تک سخت پابندیوں میں رکھا تھا جب تک کہ وہ مرجھانہ جائے۔ ان پیش رفتوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے، ناصر نے 1959 کی عرب لیگ کی ایک غیر فعال قرارداد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ایک فلسطینی سیاسی وجود کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً، فلسطین لبریشن آرگنائزیشن 1964 (PLO) میں قائم ہوئی، جس کے سربراہ احمد شکیری تھے، جس کی حمایت ناصر نے کی۔ فلسطینی قومی کونسل 28 مئی 1964 کو یروشلم میں بلائی گئی، جس میں فلسطینی عوام کے 400 سے زیادہ نمائندے جمع ہوئے۔ کونسل نے شکیری کو پی ایل او کا سربراہ منتخب کیا، پورے فلسطین کو آزاد کرانے کے اپنے عزم کا اعادہ کیا، اور فلسطینی لبریشن آرمی کے قیام کا عزم کیا۔

جب کہ فلسطینیوں نے اس پیش رفت کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا، ابھرتی ہوئی مزاحمتی تحریکوں نے شکوک وشبہات کو جنم دیا۔ فتح اور بائیں بازو کے دھڑوں جیسے گروہ، جو پہلے ہی مزاحمت کی راہوں پر گامزن تھے، پی ایل او میں شامل ہونے میں ہچکچاتے تھے، اسے عرب ریاستوں کی طرف سے آزادی کی طرف حقیقی کوششوں کے بغیر فلسطینی مقصد پر قابو پانے کی ایک اور کوشش کے طور پر دیکھتے تھے۔[1]. اس کے ساتھ ہی، فتح ابھی تک ایک اہم مزاحمتی تحریک کے طور پر نمایاں نہیں ہوئی تھی اور اس طرح ناصری حکومت یا دیگر عرب سیاسی اداکاروں کی طرف سے خاص توجہ حاصل نہیں کی گئی تھی۔

1967 کی جنگ کی تباہ کن شکست، جسے اکثر دوسرا نکبہ کہا جاتا ہے، کے ملے جلے اثرات مرتب ہوئے۔ ایک طرف، اس نے فلسطینی مزاحمت کو ہمسایہ فرنٹ لائن ریاستوں میں آپریشنل اڈے قائم کرنے کے قابل بنایا جہاں ریاستی عملداری کمزور تھی (یعنی لبنان اور اردن)[2]۔ دوسری طرف مصر اور شام جیسی مضبوط حکومتوں والی

[1] صلاۃ خلف، ص78ف۔ احمد جبریل، صفحہ 83، 91-92

[2] صلاح خلف، ص96

ریاستوں میں مزاحمتی سرگرمیوں کو دبا دیا گیا[1]۔ بہت سے بااثر عرب ممالک الفتح کے عسکری ونگ الآصفہ کو شک اور دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی مزاحمتی کوششوں کی حمایت کرنے سے گریزاں تھے[2]۔

1967 سے 1970 تک کے تین سال فلسطینی مزاحمت کے لیے سنہری دور تھے، خاص طور پر اردن میں۔ 1967 کی جنگ کے دوران مغربی کنارے کو کھونے کے صدمے کے بعد، اردن کے شاہ حسین کو فلسطینی کارکنوں اور جنگجوؤں کو رہا کرنے پر مجبور کیا گیا، اور انہیں دریائے اردن کے کنارے آپریشن کے اڈے قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔

1967 سے 1970 تک کے تین سال فلسطینی مزاحمت کے لیے سنہری دور تھے،[3] خاص طور پر اردن میں۔ 1967 کی جنگ کے دوران مغربی کنارے کو کھونے کے صدمے کے بعد، اردن کے شاہ حسین کو فلسطینی کارکنوں اور جنگجوؤں کو رہا کرنے پر مجبور کیا گیا، اور انہیں دریائے اردن کے کنارے آپریشن کے اڈے قائم کرنے کی اجازت دی گئی[4]۔

یہ دور 21 مارچ 1968 کو کرامہ کی جنگ کے ساتھ اپنے عروج پر پہنچا۔ اس اہم مقابلے میں، فلسطینی مزاحمتی قوتوں نے اردنی فوج کے ساتھ مل کر، کامیابی کے ساتھ اسرائیلی دراندازی کو پسپا کیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں 30 سے زیادہ اسرائیلی ہلاک اور 100 سے زیادہ زخمی ہوئے، جس سے حملہ آوروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے عربوں کے لیے ایک اہم حوصلے کو بڑھاوا دیا، جس نے 1967 کی جنگ کے بعد اسرائیلی ناقابل تسخیر ہونے کے افسانے کو ختم کر دیا۔[5]

---

[1] یہ مشاہدہ بہت اہم ہے: عصری دور میں مضبوط حکومتوں نے اپنی طاقت کو اپنی قوموں یا لوگوں کے فائدے کی طرف شاذونادر ہی ہدایت کی ہے۔ اس کے بجائے، ان کی بڑھتی ہوئی طاقت اکثر ان کی آبادی کے بڑھتے ہوئے جبر اور بیرونی مخالفوں کے لیے زیادہ رضامندی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے برعکس، کمزور حکومتیں قوم کے مفادات کی حمایت کرتی ہیں، نادانستہ طور پر دشمن کے مقاصد کو چیلنج کرتی ہیں۔

[2] صلاۃ خلف، ص97۔

[3] احمد جبریل، ص214؛ محسن صالح، ص89۔

[4] صلاۃ خلف، ص102

[5] جنگِ کرامہ کے بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھیں صلاۃ خلف، ص102

کرامہ میں فتح نے بڑے پیمانے پر جوش و خروش کو جنم دیا، دسیوں ہزار رضاکاروں نے فتح میں شمولیت اختیار کی، جو فلسطینی جدوجہد میں ایک غالب قوت کے طور پر ابھری۔ اس عرصے کے دوران، نوجوان اسلامی کارکنوں نے اپنے رہنماؤں پر مزاحمتی کوششوں میں شامل ہونے کے لیے دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی وجہ سے اردن میں "شیخوں کے کیمپ" بنائے گئے، جس نے اسلامی نوجوانوں اور مذہبی شخصیات کو اکٹھا کیا۔ تاہم، یہ کیمپ بالآخر سیکولر الفتح تحریک کی قیادت میں چلتے رہے۔[1]

ان سالوں کے دوران مزاحمتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، آپریشن 1967 میں 12 ماہانہ سے بڑھ کر 1968 میں 52 ماہانہ، 1969 میں 199 ماہانہ، اور 1970 کے ابتدائی مہینوں میں 279 ماہانہ تک پہنچ گئے۔ پرجوش مزاحمت کے اس دور نے مستقبل میں فلسطینی آزادی کی کوششوں کی بنیاد کو مضبوط کیا۔[2]

نکبہ اور کرامہ کی جنگ کے بعد فتح کی حیثیت کو بلند کیا، فلسطینی اور عرب سیاست میں اس کے کردار کو نئی شکل دی۔ اس عرصے کے دوران، الفتح نے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن PLO میں شمولیت اختیار کی اور تیزی سے اس کا غالب دھڑا بن گیا، جس نے 1968 کے موسم گرما تک مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ فروری 1969 میں، یاسر عرفات نے PLO کی صدارت سنبھالی[3]۔ یہ فلسطینیوں کے لیے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ PLO کا رہنما کسی عرب رہنما کی بیرونی توثیق سے نہیں بلکہ زمین پر مزاحمتی سرگرمیوں سے حاصل ہونے والی ساکھ کے ذریعے سامنے آیا تھا۔

تاہم، عرفات کی قیادت پیچیدہ چیلنجوں کے ساتھ آئی۔ پی ایل او نے مختلف فلسطینی دھڑوں کو شامل کیا، ہر ایک مختلف علاقائی طاقتوں کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتا ہے۔ یہ دھڑے اکثر اپنے اپنے ایجنڈے پر عمل پیرا رہتے تھے، جس سے عرفات کے لیے ایک متفقہ حکمت عملی کو نافذ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک ہی وقت میں، وہ نہ تو

---

[1] ابراہیم گوشہ ص108

[2] صلاۃ خلف، ص106۔

[3] صلاۃ خلف، ص112ف

اختلاف کرنے والے دھڑوں سے علیحد گی اختیار کر سکتا تھا اور نہ ہی انہیں مکمل طور پر نکال سکتا تھا، یہاں تک کہ جب انہوں نے PLO کی عمومی پالیسیوں کی خلاف ورزی کی ہو۔

ان فوائد اور ذمہ داریوں کے امتزاج نے فتح کو ایک اور بحران کی طرف دھکیل دیا۔ یہ تحریک، جو تیزی سے ابھری تھی اور اردنی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی تھی، حد سے زیادہ پر اعتماد ہو گئی۔ بہت سے ارکان خطرناک حد تک مغرور ہو گئے، اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ وہ زمین پر ایک طاقتور طاقت ہیں اور یہاں تک کہ بادشاہ کو ختم کرنے، بادشاہت کو ختم کرنے اور ایک جمہوریہ قائم کرنے پر غور کیا[1]۔ انہوں نے نعرہ "تمام طاقت مزاحمت کے لیے" پھیلایا اور طیاروں کو ہائی جیک کرنے اور انہیں عمان کے ہوائی اڈے پر اتارنے، اس کا نام بدل کر "ہوائی اڈے کا انقلاب" کرنے جیسے اقدامات کیے۔ ان اقدامات نے بادشاہ کی خود مختاری اور اختیار کو نمایاں طور پر مجروح کیا۔[2]

مزید بر آں، فتح کے اندر سیکولر، بائیں بازو کے نظریات نے کچھ ارکان کو کھلے عام مذہب اور خدا کا مذاق اڑانے پر مجبور کیا۔ یہ ملحدانہ، انقلابی ذہنیت اردن کے فوجیوں، مقامی اشرافیہ، اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ، اردن میں اور خود فلسطینیوں کے درمیان متعدد تنازعات کا باعث بنی۔[3] مزید بر آں، فلسطینی دھڑوں کے اندر گہری تقسیم نے اندرونی تخریب کاری، جوڑ توڑ اور مسابقتی ایجنڈوں کے ساتھ نئے دھڑوں کے ابھرنے کے مواقع پیدا کیے ہیں۔

دوسری طرف، 1967 میں ایک اہم دھچکا سہنے کے باوجود، اردن کی حکومت نہ تو امریکی اثر ورسوخ سے آزاد ہوئی اور نہ ہی انقلابی مزاحمتی ریاست میں تبدیل ہوئی۔ اپنے آغاز سے، یہ بنیادی طور پر غیر ملکی طاقتوں پر پہلے برطانوی اور بعد میں امریکیوں پر انحصار کرتا تھا۔ اس طرح اسرائیل کے ساتھ براہ راست جنگ میں شامل ہونا کبھی بھی سنجیدہ غور و فکر نہیں تھا۔ مزید بر آں، اپنی بادشاہت کو برقرار رکھنے کی جبلت سے متاثر، حکومت بڑھتی

---

[1] عبداللہ عزام، ج1، ص840؛ احمد منصور، pp.86-87 ff; احمد جبریل، صفحہ 205-06

2 حسین بن طلال، میرا کام بادشاہ ہے، ص212 ایف ایف، 234، 239، 240؛ احمد جبریل، صفحہ 21، 238

[3] عبداللہ عزام، جلد1، صفحہ 849، 852 اور جلد4، صفحہ 51؛ احمد جبریل، صفحہ 219

ہوئی فوجی خود مختاری کو برداشت نہیں کر سکتی تھی جس نے اس کی اتھارٹی کو تیزی سے چیلنج کیا، اس کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا، اور اس کی خود مختاری کو کم کیا۔

حکومت کی پوزیشن کو مضبوط امریکی اور برطانوی حمایت سے مزید تقویت ملی،[1] جس کا اسرائیل کو نشانہ بنانے والی تحریکوں کے حق میں ڈگمگانے کا امکان نہیں تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کی تخلیق اور شاہ عبداللہ اوّل کی میراث کے تسلسل کے طور پر، اردنی نظام نے مکارانہ چالوں، جوڑ توڑ کی حکمت عملیوں، اور انٹیلی جنس کی حکمت عملیوں کے بھاری استعمال پر انحصار کیا۔ اس نقطہ نظر میں مخبروں کو بھرتی کرنا یا جارحانہ، موقع پرست افراد کو اشتعال انگیزی بڑھانے، عدم اعتماد کو فروغ دینا، اور تعلقات کو غیر مستحکم کرنا، فیصلہ کن کریک ڈاؤن کے لیے ضروری حالات پیدا کرنا شامل تھا۔

ایک بیرونی عنصر ان اندرونی تناؤ کو مزید بڑھاتا ہے۔ مصری صدر جمال عبدالناصر کی طرف سے امریکی وزیر خارجہ ولیم راجرز کے جنگ بندی کے اقدام کو قبول کرنے سے، جس نے مصر اسرائیل جنگ کو روک دیا، ایک نیا متحرک متعارف کرایا۔ الفتح اور دیگر فلسطینی دھڑوں کی طرف سے مسترد کیے جانے والے اس معاہدے نے فلسطینی مزاحمت کو روکنے کے لیے ناصر اور شاہ حسین کے مقاصد کو ہم آہنگ کیا۔ کشیدہ تعلقات کے ایک دور کے بعد ان کی مفاہمت، اسکندریہ میں بادشاہ کے رسمی استقبال کی علامت تھی۔ اس نے سختی سے مشورہ دیا کہ ان کی بات چیت میں ممکنہ طور پر فلسطینی دھڑوں کی طرف سے درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے مربوط منصوبے شامل ہیں۔[2]

ان تمام وجوہات کی بناء پر، واقعات تیزی سے بڑھتے چلے گئے جو 1970 میں "بلیک ستمبر" کے نام سے مشہور ہوا، جس میں اردنی فوج اور الفتح کے درمیان شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ان لڑائیوں نے شہروں اور گھروں کو تباہ کر دیا، جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی اور صدمے ہوئے۔ شہریوں پر ہونے والی دہشت گردی اتنی شدید تھی کہ

[1] حسین بن طلال، ص 207۔

[2] صلاح خلف، صفحہ 133 ایف ایف، صفحہ 150، مائی جاب از کنگ میں شاہ حسین کی داستان کا موازنہ کریں، صفحہ 234-35، 238

بہت سے بچوں کو دیرپا نفسیاتی اور ذہنی صحت کے اثرات کا سامنا کرنا پڑا[1]۔ شاہ حسین، مبینہ طور پر "کسی بھی قیمت پر اپنا تخت بچانے کے لیے تیار ہیں، چاہے اس کا مطلب اپنے دارالحکومت کو بمباری میں دفن کرنا ہی کیوں نہ ہو[2]،" زبردست طاقت کا استعمال کیا۔ اردن کے ٹینکوں کے ذریعے جراش کے جنگلات میں مزاحمتی جنگجوؤں کو کچلنے کے بعد یہ مہم اپنے عروج پر پہنچ گئی[3]۔ بہت سے تلخ تصادم کے بعد، یہ تنازع الفتح اور اس کے جنگجوؤں کو اردن سے نکالے جانے پر یا، زیادہ واضح طور پر، سیکڑوں کے مارے جانے اور ہزاروں کو قید کیے جانے کے بعد ان میں سے کیا بچا تھا۔ اس طرح، وہ ختم ہوا جسے "فلسطینی تحریک کے فخر کا دور" قرار دیا گیا تھا۔[4]

اس شکست کی وجہ سے فلسطینی مزاحمت کو اس کی کارروائیوں کی سب سے اہم بنیاد پڑی۔ اردن نے اسرائیل کے ساتھ مشغولیت کے لیے سب سے طویل متصل محاذ، اس کی بڑی فلسطینی آبادی کی وجہ سے نمایاں عوامی حمایت، اور نسبتاً کمزور نظام حکومت کی پیشکش کی۔ ان نقصانات کو بڑھانا حکومت کی کمزوری تھی، جس نے حال ہی میں مغربی کنارے کے نقصان کا سامنا کیا تھا، اور اس کا نوجوان بادشاہ، جس کی عمر صرف 35 سال ہے، اب بھی ایک غیر یقینی بادشاہت کی حکمرانی کی پیچیدگیوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔[5]

کیا فلسطینی مزاحمت کو صرف اور صرف اپنی عسکری کمتری کی وجہ سے شکست ہوئی تھی، اردنی فوج کے خلاف کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی؟ یا کیا اس کی شکست کی جڑیں گہرے مسائل میں پیوست تھیں، جیسے اندرونی ٹوٹ پھوٹ، خلفشار، اور سلامتی کی خلاف ورزیوں بشمول غداری اور اردنی حکومت یا دیگر کے ساتھ انفرادی معاہدے؟ ان واقعات کے ارد گرد کی داستانیں وسیع پیمانے پر مختلف نقطہ نظر پیش کرتی ہیں۔

---

[1] عبداللہ عزام، ج1، ص840

[2] صلاۃ خلف، ص7۔

[3] عبداللہ عزام، ج1، ص840

[4] صلاۃ خلف، ص127۔

[5] الفتح کے ایک بانی رکن کی طرف سے لکھے جانے کے باوجود ان واقعات کا ایک متوازن بیان ابو عیاد (صلاح خلف) کی اپنی یادداشت فلسطین کے بغیر شناخت کے صفحہ 127 سے شروع ہونے والی داستان ہے۔ شاہ حسین بھی اپنی یادداشتوں میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں My Job is King، صفحہ 233 اور اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مزید برآں، احمد جبریل اپنی یادداشتوں کی کتاب Memory of the Revolution میں، صفحہ 219 سے شروع ہونے والے واقعات کا اپنا ورژن پیش کرتے ہیں

ایک اور اہم سوال عرب حکومتوں کے کردار کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے جنہوں نے بظاہر شاہ حسین کی مخالفت کرتے ہوئے مزاحمت کی حمایت کی۔ یہ حکومتیں، جن کی پشت پناہی مزاحمت کے سٹریٹیجک حسابات میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی، غیر متوقع طور پر غیر فعال یا حتیٰ کہ پیچیدہ پوزیشنیں بھی اپنالیں۔ نصیر اور قذافی جیسے لیڈر تنازع شروع ہونے سے پہلے خاموش رہے یا ٹھیک ٹھیک اشتعال انگیزی میں مصروف رہے، جب کہ شامی فوج نے مداخلت کرنے سے مکمل پرہیز کیا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا؟ یا یہ شاہ حسین کے ساتھ دانستہ طور پر ملی بھگت کا کام تھا، جس کے مخالف کو انہوں نے طویل عرصے سے بدنام کیا تھا، اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے جس کی انہوں نے عوامی حمایت کی تھی؟ یہاں ایک بار پھر، مختلف تشریحات ہیں، جن میں سے ہر ایک کی تائید بہت ساری تفصیلات اور متضاد اکاؤنٹس سے ہوتی ہے۔

نتیجہ دردناک طور پر واضح تھا: اپنے عروج پر بھی، فلسطینی مزاحمت میں غیر مستحکم حکومت کی فوج کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ ان کے انتہائی مایوس کن وقت میں، مزاحمت کے اہم اتحادی بیکار کھڑے تھے، وہ مدد فراہم کرنے میں ناکام رہے جس کی شدید ضرورت تھی۔ اس حقیقت نے مزاحمتی رہنماؤں کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کی حکمت عملیوں اور نقطہ نظر کو گہرا متاثر کیا۔ پھر بھی، شکست کے بعد سیکھے گئے سبق شاذ و نادر ہی غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ وہ اکثر ناکامی کے غم اور حوصلے کے گرنے سے داغدار ہوتے ہیں۔

بلیک ستمبر کے واقعات کے گہرے اور دور رس نتائج تھے، جن میں سب سے اہم فلسطینی مزاحمتی تحریک کے اندر کمزوری کا آغاز تھا۔ پہلی بار، تحریک نے کمزور عرب حکومت پر قابو پانے میں اپنی ناکامی کا سامنا کیا، مغربی حمایت سے تقویت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے لیس بھاری ہتھیاروں سے لیس صہیونی ریاست کو چیلنج کرنا چھوڑ دیں۔ اس شکست نے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کی، کیونکہ مزاحمتی نظریہ کمزوری کے عناصر اور جدوجہد کے متبادل طریقوں کے لیے کھلے پن کی عکاسی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک جدوجہد میں حصہ لینا تھا، ان واقعات سے سنجیدہ سبق حاصل کیا، مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں پر اپنا انحصار محدود کیا اور عرب حکومتوں کے ساتھ تصادم سے گریز کیا، چاہے ان کے اقدامات یا صریح غداری کیوں نہ ہو۔

اس سنگین آغاز کے باوجود، 1970 کی دہائی میں فلسطینی مزاحمت کے لیے کچھ قابل ذکر سیاسی کامیابیاں دیکھنے میں آئیں۔ اکتوبر 1974 میں، مراکش میں منعقدہ عرب سربراہی اجلاس کے دوران، عرب ریاستوں نے سرکاری طور پر فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کو فلسطینی عوام کی واحد جائز نمائندہ کے طور پر تسلیم کیا۔ اگرچہ یہ فیصلہ تکنیکی طور پر ایک سال پہلے کیا گیا تھا، لیکن شاہ حسین کے اعتراضات کی وجہ سے اسے پوشیدہ رکھا گیا تھا، جس نے امریکی حمایت سے مغربی کنارے کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہشات کو پالیا تھا۔ اس کے بجائے، امریکی پالیسی نے فلسطینی مزاحمتی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے عزائم کا فائدہ اٹھایا۔[1]

یہ تسلیم اکثر PLO کے ساتھ عربوں کی یکجہتی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ تاہم، صلاح خلف (ابو عیاد)، الفتح، پی ایل او اور اس کے انٹیلی جنس اپریٹس کے ایک ممتاز رہنما نے ایک زیادہ پیچیدہ داستان کا انکشاف کیا۔ ابو عیاد کے مطابق قتل کی دھمکی کے تحت عرب رہنماؤں پر اس فیصلے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مراکش میں شاہ حسین کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے تھے، دیگر شخصیات کے علاوہ، اگرچہ تمام ممکنہ اہداف کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی، جس سے وسیع خطرے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اس بڑھتے ہوئے خطرے نے بالآخر لیڈروں کو مجبور کیا کہ وہ اس فیصلے کی منظوری دیں اور اس کا اعلان کریں، جس سے فلسطینی مزاحمت کی رفتار کو نئی شکل دی گئی۔[2]

یہ فیصلہ فلسطینیوں کے لیے خاص طور پر شاہ حسین سے اپنی آزادی پر زور دینے میں ایک اہم کامیابی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اپنے دادا عبداللہ کی طرح، حسین نے طویل عرصے سے فلسطین پر اپنا سایہ ڈالا تھا، جو اس کے مقصد کی نمائندگی پر غلبہ اور اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس نے بھی اپنا بھروسہ مکمل طور پر انگریزوں اور امریکیوں پر رکھا، اور نہ اس سے ڈرے اور نہ ہی اس کی دھوکہ دہی پر بھروسہ کیا گیا۔[3]

---

[1] صلاۃ خلف، صفحہ 226-27

[2] Ibid., p.227 ff

[3] صلاۃ خلف، ص216، 226؛ راشد الخالدی، صفحہ 88-89

ساتھ ہی اس فیصلے نے عرب ریاستوں کو فلسطینیوں کے ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں دے کر جن کے پاس کم سے کم طاقت اور وسائل تھے، فلسطینی کاز کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے کی اجازت دی۔ ان فلسطینیوں کو عرب بادشاہوں اور صدور کی طرف سے ملنے والی امداد پر انحصار چھوڑ دیا گیا اور اکثر روک دیا گیا۔

اگلے مہینے نومبر 1974 میں یاسر عرفات کو نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے لیے مدعو کیا گیا۔ یہ بین الاقوامی سطح پر فلسطینی کاز کے لیے ایک اہم لمحہ ہے، جس نے اسے پناہ گزینوں پر مرکوز انسانی مسئلے سے عالمی برادری کے سامنے پیش کیے جانے والے زیر قبضہ لوگوں کے معاملے کی طرف بڑھایا۔

یہ سنگ میل صرف فلسطینی کوششوں یا عربوں کی حمایت کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ، بڑے حصے میں، اس وقت کے عالمی سیاسی منظر نامے کی ایک ضمنی پیداوار تھی، جس کی تعریف سوویت یونین کی زیر قیادت مشرقی بلاک، اور امریکی زیر قیادت مغربی بلاک کے درمیان سرد جنگ کی دشمنی نے کی تھی۔ اس دو قطبی مقابلے نے چھوٹے، کمزور اداکاروں کے لیے خود کو ثابت کرنے اور عالمی مسائل پر اثر انداز ہونے کے لیے مواقع پیدا کیے ہیں۔ اس دوران فلسطینیوں کے حق میں متعدد بین الاقوامی قراردادیں منظور کی گئیں۔ ان میں قابل ذکر 1975 کی قرارداد تھی جس میں صیہونیت کو نسلی امتیاز کے ساتھ مساوی کیا گیا تھا اور فلسطینی عوام کے حق خود ارادیت کی توثیق اور تمام ضروری طریقوں سے ان کے حقوق کی بازیابی تھی۔

تاہم، ان قراردادوں کا عملی اثر محدود تھا۔ اسرائیل کے لیے امریکہ کی غیر متزلزل حمایت، اور عرب ریاستوں کی فلسطینی کاز کی حقیقی حمایت کرنے کی کم ہوتی ہوئی خواہش کے ساتھ، ان کامیابیوں کو بڑی حد تک علامتی بنا دیا گیا۔

فوجی اور آپریشنل محاذ پر، فلسطینیوں نے اردن کے ناقابل تلافی محاذ کو کھونے کے باوجود کامیابی سے اپنی سرگرمیاں لبنان کی طرف منتقل کر دیں۔ جب کہ لبنان نے اردن کے 360 کلومیٹر کے مقابلے میں صرف 79 کلومیٹر تک محدود سرحد تک رسائی کی پیشکش کی تھی، یہ واحد آپشن تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس پر ایک مضبوط مرکزی حکومت کا کنٹرول نہیں تھا، جس سے زیادہ آپریشنل لچک پیدا ہوتی ہے۔

لبنان کے حالات اردن کے حالات سے مماثلت رکھتے ہیں، پھر بھی اہم اختلافات نے انہیں الگ کر دیا۔ دونوں ممالک نے فلسطینی پناہ گزینوں کی بڑی آبادی کی میزبانی کی، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ یہ پناہ گزین ایسے کیمپوں میں رہتے تھے جو شدید غربت اور پسماندگی کی وجہ سے گنجان آباد علاقوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ انہیں اجنبیت کے گہرے احساس کا سامنا کرنا پڑا، جو انہیں دوسرے یا تیسرے درجے کے درجے تک پہنچانے والے قوانین اور ضوابط کی وجہ سے برقرار ہے۔ جیسا کہ اردن میں ہے، فلسطینی مزاحمتی تحریکوں نے پناہ گزینوں میں سے جنگجوؤں کو بھرتی کیا اور انہیں گوریلا کارروائیوں کے لیے ہتھیاروں سے لیس کیا۔ مزید برآں، 1967 کے بعد کے نقبہ کے دور نے دیکھا کہ علاقائی حکومتوں نے مزاحمت پر اپنی گرفت میں نرمی کی، جس سے فلسطینی سرگرمیوں کا احیاء ممکن ہوا۔ اس بحالی نے 1968 میں حوصلے بلند کرنے والی کرامہ کی جنگ کے بعد مزید زور پکڑا، جس نے جنگجوؤں میں امید کو ہوا دی۔ تاہم، یہ نیا پایا جانے والا اعتماد اکثر طاقت کے زبردست نمائش کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ریاستی افواج کے ساتھ بار بار اور غیر ضروری تصادم ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، لبنان کی اندرونی حرکیات اردن کے نسبتاً متحد ریاستی آلات سے کافی مختلف تھیں۔ لبنان فرقہ وارانہ اور سیاسی خطوط پر گہرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا- سنیوں اور شیعہ، مسلمانوں اور عیسائیوں، اور عرب قوم پرستوں اور مغربی جھکاؤ والے دھڑوں کے درمیان تقسیم۔ ان اختلافات نے لبنانی حکومت کی ہم آہنگی اور فیصلہ سازی کی صلاحیت کو ختم کر دیا۔ جہاں اس نے ریاست کو کمزور کیا، اس نے بیک وقت ان گروہوں کے لیے مواقع پیدا کیے جو تنازعات کو بھڑکانے اور بڑھانے کے لیے ان ٹوٹ پھوٹ کا فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھے۔

فلسطینی جنگجوؤں اور لبنانی فوج کے درمیان پہلی اہم جھڑپیں 1969 کے آخر میں ہوئیں۔ مصری صدر جمال عبدالناصر نے 1969 کے قاہرہ معاہدے کی ثالثی کرتے ہوئے مداخلت کی۔ اس معاہدے نے فلسطینی مزاحمتی تحریکوں کو جنوبی لبنان میں کام کرنے کی آزادی دی۔ اس نئے آپریشنل اڈے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، مزاحمت نے 6 مارچ 1975 کو بدنام زمانہ ساوائے ہوٹل آپریشن سمیت کئی جرات مندانہ کارروائیاں شروع کیں۔ اس مشن میں، فلسطینی جنگجو سمندر کے راستے تل ابیب میں گھس گئے، سیوائے ہوٹل پر قبضہ کر لیا، اور یرغمال بنا لیے،

بدلے میں فلسطینی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آنے والی لڑائی شدید طور پر یک طرفہ تھی، کیونکہ آٹھ مزاحمتی جنگجو اسرائیلی اسپیشل فورسز کے خلاف برسرپیکار تھے۔ تصادم کا اختتام جنگجوؤں کے گولہ بارود کی کمی کے ساتھ ہوا، جس کے نتیجے میں ان میں سے سات کی شہادت ہوئی، جبکہ کافی جانی نقصان ہوا- تقریباً100 اسرائیلی مارے گئے۔

الفتح کی کارروائیوں کے مقابلے میں، پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین (پی ایف ایل پی)، ڈیموکریٹک فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین ((DFLPاور دیگر چھوٹے یا آزاد دھڑوں کے ساتھ، اپنی مخصوص حکمت عملیوں کی وجہ سے اہمیت حاصل کی۔ ان میں فلسطینی قیدیوں کے یرغمالیوں کے تبادلے کے لیے ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنا شامل تھا۔ حساس مقامات کو نشانہ بنانا جیسے کہ 1972 کے لوڈ ہوائی اڈے پر حملہ؛ بیرون ملک یرغمال بنانا، جیسا کہ 1972 میں میونخ آپریشن؛ قیدیوں کے تبادلے کے لیے یرغمالیوں کو پکڑنے کے لیے بستیوں پر حملہ کرنا، جیسا کہ 1974 میں کریات شمونہ (خالصہ) آپریشن؛ اور یہاں تک کہ اسرائیلی فوجی اسکولوں پر حملہ کرنا، جیسا کہ 1974 میں مالوت (ترشیحہ) آپریشن میں دیکھا گیا.

جوابی کارروائی میں، اسرائیل نے فلسطینیوں کے اڈوں پر فضائی حملے کیے، بمباری کی، اور لبنان میں بنیادی ڈھانچے کی تباہی کے ساتھ ساتھ فلسطینی رہنماؤں کے ہائی پروفائل قتل ہوئے۔ انہوں نے 1972 میں غسان کنفانی اور وائل زوئٹر سمیت سویلین سیاسی شخصیات اور فوجی کمانڈروں کے ساتھ ساتھ محمود الحمشاری، حسین ابو الخیر، محمد یوسف النجر، کمال عدوان اور 1973 میں کمال ناصر کو نشانہ بنایا۔

لبنان سے گوریلا کارروائیوں کا آغاز، لبنانی سرزمین پر بڑے قتل عام کرنے کی اسرائیل کی صلاحیت کے ساتھ، کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن ((PLOکے ارکان، جس میں الفتح اور دیگر دھڑے شامل تھے، نے ان واقعات کو لبنانی فوج کی ممکنہ ملی بھگت یا اس میں ملوث ہونے سے تعبیر کیا۔ اس تاثر نے غصے کو ہوا دی اور فوج سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا مطالبہ کیا۔ دریں اثنا، لبنانی حکومت اور فوج نے پناہ گزینوں کے کیمپوں، تنظیموں اور جنگجوؤں کو اپنے کنٹرول سے باہر خطرناک طاقت کے مراکز قرار دیا۔ یہ ادارے نہ صرف

بیرونی تنازعات کا باعث بنے بلکہ اندرونی عدم استحکام کا باعث بھی بنے، جس کی وجہ سے کیمپوں کے مضبوط ضابطے کی ضرورت پڑی۔

فلسطینیوں نے، برسوں کی ذلت کے بعد طاقت کے ایک نئے احساس اور اس کی نشہ آور اپیل کا تجربہ کیا حالانکہ وہ ابھی تک اس سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے کہ کنٹرول کی کسی بھی کوشش کی مزاحمت کی۔ لبنان کے دھڑوں میں سے، مارونائٹ عیسائی فلسطینیوں کے خلاف اپنی دشمنی اور بے تابی کے لیے کھڑے تھے[1]۔ اس دشمنی نے مارونائٹس اور اسرائیلیوں کے درمیان بڑھتے ہوئے اتحاد کو سہولت فراہم کی، جس نے انہیں ہتھیاروں، مہارتوں اور تربیت کے مسلسل بہاؤ کی فراہمی کی۔

ہنگامہ آرائی کے درمیان ایک تیسرا عنصر ابھرا: فلسطینی دھڑوں کا بٹ جانا، چاہے وہ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کی چھتری میں کام کر رہے ہوں یا آزادانہ طور پر۔ ان میں سے کچھ دھڑے اپنے فنانسرز کے مفادات کے لیے کرائے کے فوجی بن گئے۔ یہ متحرک حکومتیں جیسے عراق یا شام میں، دوسروں کے درمیان، اپنے منسلک دھڑوں کو ہدایت دینے کے لیے یا مخصوص گروہوں یا افراد کو لبنانی شخصیات یا تنظیموں کو نشانہ بنانے کے لیے قتل یا بم دھماکے کرنے کے لیے رشوت دینے کے لیے قابل عمل ہیں۔ ان اقدامات نے اختلاف کے شعلوں کو مزید بھڑکایا، فلسطینیوں اور وسیع تر مزاحمتی تحریک کے خلاف دشمنی کو مزید گہرا کیا۔

یہ غیر مستحکم صورت حال بالآخر 1975 میں لبنان کی خانہ جنگی کے آغاز پر منتج ہوئی۔ ابتدائی چنگاری مارونائٹ عیسائی افواج کی طرف سے کی گئی ایک قتل عام تھی، جس نے فلسطینیوں کو لے جانے والی ایک بس پر گھات لگا کر حملہ کیا، اندھا دھند فائرنگ کی اور اس میں سوار تمام افراد بشمول خواتین اور بچوں کو ہلاک کر دیا۔

1 کوئی بھی شخص جس نے لیونٹ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ فطری طور پر اس خطے کے عیسائیوں کی طرف سے صلیبی جنگوں اور منگول حملوں کے دوران اور بعد میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار کے ادوار کے دوران کی جانے والی غداریوں اور غداریوں کے پیمانے کو پہچان لے گا۔ تاہم، عصری سیکولر نظریات کا عروج، ان کے تئیں بہت سے مسلمانوں کا شکست خوردہ رویہ، اور ثقافتی، میڈیا اور تعلیمی اداروں پر ان نظریات کا غلبہ جدید تاریخ کو دوبارہ لکھنے کا باعث بنا ہے جو اکثر اس طرح کی غداری کی کارروائیوں کو چھپاتا ہے اور چمکتا ہے۔ بعض افراد نے، اپنی غفلت کی بھاری قیمت ادا کرتے ہوئے، ان واقعات کو دستاویزی شکل دی ہے، خواہ انہوں نے ندامت کے ساتھ ان کا اعتراف کیا ہو، نہ تسلیم کیا اور نہ ہی توبہ کی۔ مثال کے طور پر، صلاۃ خلف، صفحہ 263-264 دیکھیں۔

لبنان میں فلسطینی، چاہے کیمپوں میں بے گھر پناہ گزین ہوں یا عسکریت پسند جنگجو، تنازعہ میں ایک مرکزی اور متنازعہ مسئلہ بن گئے، جو مسابقتی دھڑوں کی کراس فائر میں پھنس گئے۔ فلسطینی جنگجو اس کے بدلتے ہوئے اتحاد میں فعال حصہ لینے والے کے طور پر جنگ میں شامل ہوئے، جب کہ وہ اس کی تباہی کا بھی خمیازہ بھگت رہے تھے۔

یہ غیر مستحکم صورت حال بالآخر 1975 میں لبنان کی خانہ جنگی کے آغاز پر منتج ہوئی۔ ابتدائی چنگاری مارونائٹ عیسائی افواج کی طرف سے کی گئی ایک قتل عام تھی، جس نے فلسطینیوں کو لے جانے والی ایک بس پر گھات لگا کر حملہ کیا، اندھادھند فائرنگ کی اور اس میں سوار تمام افراد بشمول خواتین اور بچوں کو ہلاک کر دیا۔

لبنان میں فلسطینی، چاہے کیمپوں میں بے گھر پناہ گزین ہوں یا عسکریت پسند جنگجو، تنازعہ میں ایک مرکزی اور متنازعہ مسئلہ بن گئے، جو مسابقتی دھڑوں کی کراس فائر میں پھنس گئے۔ فلسطینی جنگجو اس کے بدلتے ہوئے اتحاد میں فعال حصہ لینے والے کے طور پر جنگ میں شامل ہوئے، جبکہ اس کی تباہی کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔

خانہ جنگی نے بڑے پیمانے پر جاسوسی، اسلحے کی اسمگلنگ، اور مختلف علاقوں میں تباہ کن بم دھماکوں کا دروازہ کھول دیا۔ عیسائی ملیشیاؤں نے فلسطینی کیمپوں پر اپنے حملے تیز کر دیے، محاصرے کیے اور بڑے پیمانے پر قتل عام کیا۔ اس کے جواب میں، PLO براہ راست جنگ میں مصروف، اپنی پوزیشن کے دفاع، فلسطینی برادریوں کی حفاظت، اور لبنان میں اپنے اتحادی مسلم دھڑوں کی حمایت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ پیچیدہ تفصیلات، بدلتے ہوئے اتحاد، اور لبنانی خانہ جنگی کے الٹ جانے کی جگہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ فلسطینی مزاحمت نے خود کو عرب قوم پرستی اور بائیں بازو کے نظریے کے جھنڈے تلے ڈروز کے ساتھ جوڑ دیا—حالانکہ اسلام نے بہت کم کردار ادا کیا—مارونائٹ عیسائیوں کے خلاف، جنہیں صیہونیوں، امریکیوں اور بعض عرب حکومتوں کی حمایت حاصل تھی۔ تنازعہ اس وقت تک کم ہوا اور بہتا رہا جب تک کہ عیسائی فوجیں کمزور ہونا شروع ہو گئیں، جس سے شامی فوج کو جنوری 1976 میں امریکی منظوری اور اسرائیلی رضامندی سے مداخلت کرنے پر مجبور کیا گیا۔

امن کی بحالی کے بہانے شامی فوج نے فلسطینی کیمپوں کا محاصرہ کرنے والی عیسائی افواج کو کور فراہم کیا۔ آخر کار، انہوں نے محصور فلسطینیوں کو دھوکہ دیا، جس کے نتیجے میں 12 اگست 1976 کو تل الزاطر کا قتل عام ہوا، جس میں تقریباً 3000 فلسطینیوں کو ذبح کر دیا گیا۔ جنگ تیزی سے وحشیانہ ہوتی چلی گئی، عیسائیوں اور شامی فوج نے خوفناک اقساط کے سلسلے میں فلسطینیوں اور لبنانیوں کا خون بہایا۔

سعودی عرب کی ثالثی میں ریاض معاہدے کے ساتھ تنازع ایک سنگین موڑ پر پہنچ گیا۔ اس معاہدے نے لبنان میں استحکام کے لیے عرب افواج کی تعیناتی کی اجازت دی۔ تاہم، شریک حکومتوں نے فوجی بھیجنے سے گریز کیا، مؤثر طریقے سے کنٹرول شامی فوج کو دے دیا۔ اس طرح، لبنان میں شام کی موجودگی کو قانونی حیثیت دی گئی، معاہدے کی شرائط کے تحت عربوں کی منظوری حاصل کی گئی۔

اسرائیلی محاذ پر، اسرائیل نے سعد حداد کو کامیابی سے بھرتی کیا، ایک لبنانی میرونائٹ افسر، جس کی افواج نے جنوبی سرحد کے ساتھ ایک حفاظتی پٹی قائم کی، جو اسرائیلی مفادات کے لیے ایک حفاظتی بفر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اسرائیل کا بنیادی مقصد لبنان میں فلسطینی جنگجوؤں کا مکمل خاتمہ تھا، جنہوں نے جنوب میں مضبوط گڑھ برقرار رکھا۔ ادھر فلسطینی گوریلا جنگجوؤں نے اسرائیل کے خلاف اپنی کارروائیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ اس کے جواب میں، اسرائیلی فوج نے مارچ 1978 میں جنوبی لبنان پر حملہ شروع کیا۔ جب کہ یہ حملہ گوریلا کی موجودگی کو ختم کرنے میں ناکام رہا، اس نے حفاظتی پٹی کو مضبوط کیا اور حداد کی قیادت میں پراکسی ملیشیا کو مضبوط کیا۔

تین سال بعد، فلسطینیوں کی کارروائیاں جاری رہنے اور شہریوں کے خلاف سخت اسرائیلی انتقامی کارروائیوں اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مصر کی جانب سے تنازعہ سے دستبرداری کے بعد، اسرائیل نے جنوبی لبنان پر مکمل حملہ شروع کیا۔ اپنی تقریباً پوری فعال ڈیوٹی فوجی قوت (کل 180,000 میں سے 120,000-150,000 فوجیوں) کو متحرک کرتے ہوئے، اسرائیلی فوج صرف پانچ دنوں میں (4-9 جون، 1982) بیروت پہنچ گئی۔ اسرائیلی فوج اور فلسطینی اور لبنانی مزاحمتی فورسز کے درمیان شدید لڑائی ہوئی۔ محافظوں کی پرعزم

مزاحمت نے بیروت میں اسرائیل کی پیش قدمی کو دو ماہ تک روک دیا۔ بالآخر، بین الاقوامی ثالثوں نے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت فلسطینی مزاحمت کو لبنان کو خالی کرنے کی ضرورت تھی۔

تاہم، جنگجوؤں کے انخلاء کے بعد، اسرائیل اور اس کے مارونائٹ عیسائی اتحادیوں نے فلسطینی تاریخ کا سب سے وحشیانہ قتل عام کیا: صابرہ اور شتیلا کا قتل عام (16 ستمبر 18، 1982) تقریباً 3500 فلسطینیوں کو جن میں خواتین، بوڑھے اور بچے شامل تھے، کو منظم طریقے سے قتل کیا گیا۔

لبنان سے جبری بے دخلی نے فلسطینی مزاحمت کو ایک تباہ کن دھچکا پہنچایا اور اس کے راستے میں ایک اہم موڑ کا نشان لگایا۔ اس نے مسلح جدوجہد کے تمام راستوں کو مؤثر طریقے سے بند کر دیا، کیونکہ پڑوسی ریاستیں ناقابل رسائی ہو چکی تھیں۔ تقریباً 12,000 گوریلا جنگجوؤں کے تیونس، سوڈان اور یمن جیسے دور دراز مقامات پر منتشر ہونے سے ان کی آپریشنل صلاحیتوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ پی ایل او کی قیادت تیونس منتقل ہو گئی، لیکن اسرائیل کی انٹیلی جنس سروسز نے اہم فلسطینی شخصیات کو نشانہ بنانا جاری رکھا۔ ان میں الفتح کے نائب رہنما ابو جہاد بھی تھے جنہیں 16 اپریل 1988 کو تیونس میں قتل کر دیا گیا تھا۔

ان کارروائیوں میں فلسطینی جنگجوؤں کی لچک، ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالآخر طاقت کے گہرے عدم توازن کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کے خلاف کام کیا۔ وہ ایک بڑھتی ہوئی فوجی ریاست کے خلاف الگ تھلگ کھڑے تھے، جو پڑوسی عرب حکومتوں، خاص طور پر سرحدی ریاستوں کی بے حسی اور بے عملی سے گھرے ہوئے تھے۔ کچھ، جیسے مصر، نے اسرائیل کے ساتھ رسمی امن معاہدے کیے تھے، جب کہ دیگر، جیسے اردن اور شام، نے ڈی فیکٹو امن انتظامات کو برقرار رکھا تھا۔ جو لوگ سرکاری طور پر اسرائیل کے ساتھ منسلک نہیں ہیں وہ اکثر خفیہ سیکورٹی اور انٹیلی جنس تعاون میں مصروف رہتے ہیں، جیسا کہ لبنان، مراکش اور دیگر کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اس چیلنج میں اضافہ اسرائیل کو مغربی ممالک کی جانب سے نہ صرف مالی امداد، ہتھیاروں اور سیاسی پشت پناہی کے ذریعے بلکہ آپریشنل مدد کے ذریعے بھی حاصل ہونے والی غیر متزلزل حمایت تھی۔ سفارت خانے اور

سیف ہاؤسز اکثر اشرافیہ کے اسرائیلی کارندوں کے لیے پناہ گاہوں اور لانچ پوائنٹس کے طور پر کام کرتے ہیں۔ دریں اثنا، عالمی یہودی آباد کاروں نے اسرائیل کے مقصد کو مسلسل اور کثیر جہتی حمایت فراہم کی۔

ان مشکلات کو بڑھاتے ہوئے، بعض بیرونی کارروائیوں جیسے ہوائی جہاز کے اغوا اور ہوائی اڈے پر حملوں نے عرب اور مغربی ممالک دونوں کو الگ کر دیا، جس کی وجہ سے فلسطینی تنظیموں کی وسیع پیمانے پر مخالفت ہوئی۔ اس کے نتیجے میں کافی کشمکش پیدا ہوئی، سیاسی اور فوجی رہنماؤں کو منظم طریقے سے نشانہ بنایا گیا اور قتل کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔ اس ماحول میں، سیاسی حل، مذاکرات اور امن کے مطالبات نے فلسطینی قیادت کے اندر زور پکڑا، جس میں نمایاں، مضبوط خواہش رکھنے والی شخصیات کے کھو جانے سے مزید آسانیاں پیدا ہوئیں۔

ایک وسیع نظریاتی سطح پر، پائیدار فوجی مزاحمت کی جڑیں سیکولر نظریات میں تھیں، جس نے سیاسی اہداف میں ترجمہ کیا جن کا اظہار PLO نے اپنے بیانات اور مقاصد میں کیا۔ اس کا مقصد ایک متحد فلسطین کو یہودی یا اسلامی ریاست کے طور پر نہیں بلکہ ایک سیکولر ریاست کے طور پر قائم کرنا تھا جہاں تمام شہریوں کو مساوی حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہوں گی۔ یہ نقطہ نظر پناہ گزینوں کی واپسی اور آبادکاری کی سرگرمیوں کو روکنے پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے، جس سے فلسطینیوں اور عربوں کی آبادی کی اکثریت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔[1]

PLO کی سیکولرازم نے ایک وجہ اور ایک مجوزہ حل کے طور پر کام کیا۔ یہ ایک وجہ تھی کہ 1950، 1960 اور 1970 کی دہائیوں کے دوران سیکولرازم کے عالمی غلبے نے ایک وسیع فکری تحریک کو جنم دیا جس کی وجہ سے بہت سے نوجوان مذہب سے دور ہو گئے، یہاں تک کہ اس کی مخالفت کرنے تک۔ اس نظریاتی لہر سے آگے، لبرل اور کمیونسٹ دونوں شکلوں میں ظاہر ہونے والی سیکولرازم نے اسلامی تحریکوں کے خلاف وحشیانہ قتل عام کے ایک سلسلے کے ذریعے اپنے آپ کو مضبوط کیا، جس سے حل کے لیے اسلام کی طرف رجوع کرنے کے امکانات کو مؤثر طریقے سے بند کر دیا گیا۔ اس نے سیکولرازم کو عرب حکومتوں اور بین الاقوامی طاقتوں دونوں کے ساتھ تصادم سے بچنے کے لیے ایک عملی ذریعہ کے طور پر چھوڑ دیا۔

---

[1] صلاح خلاف، 64.pp، 113، 220-21، 314

اس طرح، ایک متحد سیکولر ریاست کا مطالبہ کئی عناصر کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوا: فلسطینی مزاحمتی دھڑوں کی سیکولر بنیاد، قوم پرست اور پان عرب صیہونی وجود کو مسترد کرنا اور یہودی ریاست کے لیے اس کی وابستگی، اور عالمی سیکولر تسلط لبرل اور کمیونسٹ دونوں طرح جو اس دور پر حاوی تھا۔ اس عالمی فریم ورک نے ایک واحد قومی ریاست کے تصور کو فروغ دیا جس میں تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ فلسطینیوں کے لیے، اس خیال نے بڑی مشرقی اور مغربی طاقتوں کے سیکولر جھکاؤ کو اپیل کرنے کے لیے ایک اسٹریٹجک راستہ فراہم کیا جو انہی اصولوں پر چل رہے تھے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کے بین الاقوامی نظام کی بنیاد رکھتے تھے۔

اگر یہ بڑی طاقتیں حقیقی طور پر سیکولرازم پر کاربند ہوتیں تو وہ صہیونیوں کے خلاف فلسطینیوں کے ساتھ کھڑی ہوتی، جن کا نظریہ اور ریاست اس مذہبی امتیاز اور نسل پرستی کی علامت ہے جسے سیکولرازم مسترد کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تاہم، اسرائیلی منصوبہ محض ایک سیکولر نو آبادیاتی ادارہ نہیں تھا۔ یہ ایک صلیبی جیسا منصوبہ بھی تھا، جس کی جڑیں مذہبی نظریے میں گہری ہیں، جو مغربی تہذیب کا ایک پائیدار پہلو ہے۔

ایک واحد سیکولر ریاست کی قبولیت جو عربوں اور یہودیوں کو مساوی طور پر متحد کرے گی، 1960 کی دہائی کے آخر میں ابھرنے والی PLO کی پہلی بڑی رعایت تھی۔ یہ تبدیلی یہودی آباد کاروں کے اپنے اصل آبائی علاقوں میں واپسی کے مطالبے سے پسپائی کی نمائندگی کرتی ہے[1]۔ اکتوبر کی جنگ اور اس کے چونکا دینے والے نتائج کے بعد، PLO کو "جرات مندانہ فیصلے" کرنے پر مجبور کیا گیا جس نے "سب یا کچھ بھی نہیں" کے نقطہ نظر کو ختم کر دیا[2]۔ اس کے نتیجے میں 1974 میں 12ویں نیشنل کانگریس میں ایک اور رعایت ہوئی، جہاں یہ تسلیم کیا گیا کہ سیاسی عمل فلسطین کو آزاد کرانے کا ایک جائز ذریعہ ہے، اس طرح ایک زمانے کے اٹل یقین کی جگہ لے لی کہ

[1] محسن صالح، ص94۔

[2] صلاۃ خلف، صفحہ 211،216ایف

مسلح جدوجہد آزادی کا واحد راستہ ہے۔ اس تبدیلی نے عبوری اور مرحلہ وار حل کا دروازہ کھولا، جس سے کسی بھی آزاد کردہ سرزمین پر فلسطینی ریاست کے قیام کی اجازت دی گئی۔[1]

ایک اور رعایت اس وقت ہوئی جب PLO نے، دلیل کے طور پر دباؤ کے تحت، سعودی ولی عہد (اس وقت کے شہزادہ فہد) کے امن اقدام کو قبول کیا، جس میں تسلیم کرنے کے بدلے میں اسرائیل کے 1967 کی سرحدوں سے انخلاء کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ تجویز 1982 میں مراکش میں ہونے والی عرب سربراہی کانفرنس میں منظور کی گئی تھی، جس میں 1948 کے اسرائیلی قبضے کو مؤثر طریقے سے تسلیم کیا گیا تھا[2]۔

اس طرح، پی ایل او کی فوجی ناکامیوں کو اہم سیاسی پسپائیوں سے منعکس کیا گیا۔ 1980 کی دہائی نے پی ایل او کے زوال کے دور کو نشان زد کیا، کیونکہ ایک واحد سیکولر ریاست کا مطالبہ جس میں عرب اور یہودی برابری کے ساتھ ساتھ رہیں گے، غیر موثر ثابت ہوئے۔ تاہم، نصف صدی میں سب سے بڑی عوامی بغاوت کے پھٹنے کے ساتھ جلد ہی ایک ڈرامائی تبدیلی واقع ہوگی: پہلی فلسطینی انتفادہ۔

[1] محسن صالح، ص94۔

[2] دیکھیں غازی غوشیہ صفحہ 179 ایف

1987 کا پہلا انتفادہ اور اسلامی مزاحمت کا عروج

1970 کی دہائی کے آخر اور 1980 کی دہائی کے اوائل تک، اسلامی تحریک اور فلسطین کے اندر داخلی اور خارجی حرکیات کا امتزاج اسلامی مزاحمت کے ظہور کے لیے زرخیز میدان بنا۔ ان پیشرفتوں کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

نارملائزیشن اور عرب ترک کرنا

مصری حکومت کے اسرائیل کے ساتھ امن اور معمول پر آنے سے یروشلم اور فلسطین کی آزادی کے لیے عرب حکومتوں پر انحصار کرنے کی فضولیت کا پردہ فاش ہو گیا۔ یہ واضح ہو گیا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے ہر شخص کو صرف اپنی کوششوں پر انحصار کرنے کی ضرورت ہو گی، جیسا کہ کہاوت ہے: "کوئی بھی آپ کے اپنے ناخن کی طرح آپ کی پیٹھ نہیں نوچ سکتا ہے۔"

دیگر عرب حکومتوں نے اس علیحدگی کو غیر فعالی یا پیچیدگی کی مختلف ڈگریوں میں ظاہر کیا۔ شام کی طرح کچھ نے اسرائیل کا براہ راست سامنا کرنے سے گریز کیا۔ دیگر، جیسے کہ اردن اور مراکش نے خفیہ تعلقات کو برقرار رکھا۔ خلیجی ریاستوں نے متضاد اور اکثر متضاد اقتصادی اور سیاسی مدد کی پیشکش کی۔ دریں اثنا، عراق اور لیبیا جیسی حکومتوں نے اپنے سیاسی ایجنڈوں کے لیے فلسطینی دھڑوں کا استحصال کیا، فلسطینی جدوجہد کے اندر تقسیم کو بڑھا دیا۔

اسلامی بیداری

1970 کی دہائی کے اوائل تک، بائیں بازو کی تحریک کے زوال نے اسلامی بیداری کے ابھرنے اور کئی ممالک میں پھیلنے کی راہ ہموار کی۔ بنیادی وجوہات سے قطع نظر، اس تناظر میں جو چیز اہم ہے وہ اس تحریک کی نمایاں ترقی اور تیزی سے پھیلنا ہے، خاص طور پر مصر اور خلیجی ریاستوں میں۔

مصر، جو کہ ایک چوتھائی عرب آبادی کا گھر ہے، نے اس بحالی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ عرب ممالک میں سب سے زیادہ خواندگی کی شرح کے ساتھ، مصر نے گریجویٹوں کا ایک مستقل سلسلہ تیار کیا جنہوں نے اپنے اثر و رسوخ کو بڑھاتے ہوئے، تعلیم، عدلیہ، اور مختلف پیشوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی، خلیجی ریاستوں نے تیل کی بے مثال تیزی اور مالی خوشحالی کا تجربہ کیا، جس نے اسلامی بیداری کی حمایت کے لیے خاطر خواہ وسائل فراہم کیے تھے۔ فنڈنگ میں اس اضافے نے اسلامی لٹریچر کے پھیلاؤ، مذہبی اداروں کے قیام اور اسلامی احیاء کو فروغ دینے والی بہت سی سرگرمیوں کو ہوا دی۔

1970 کی دہائی تین یادگار واقعات کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی جنہوں نے اسلامی بیداری کو نمایاں طور پر تقویت بخشی: ایرانی انقلاب، سعودی عرب میں جوہیمان العتیبی کا واقعہ، اور افغانستان پر سوویت حملہ۔ تینوں واقعات 1979 کے اہم سال میں رونما ہوئے۔ مزید برآں، ایک چوتھا واقعہ، نیکمتن اربکان کی قیادت میں ترکی میں اسلام پسندوں کے ممکنہ عروج کو، 1980 میں ایک وحشیانہ فوجی بغاوت کے ذریعے ناکام بنا دیا گیا، جس نے تحریک کے لیے ایک اور ممکنہ سنگ میل کو مختصر کر دیا۔

ایرانی انقلاب، ایک شیعہ اسلامی بغاوت نے، خطے میں امریکہ کے سب سے اہم اتحادیوں میں سے ایک، شاہ کو گرانے کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ جدید تاریخ میں پہلی بار، مذہبی علماء نے اقتدار پر چڑھائی کی، اپنی حکمرانی کو مضبوطی سے مضبوط کیا، اور ان کا تختہ الٹنے کی تمام کوششوں کو کامیابی کے ساتھ ناکام بنا دیا۔ زلزلے کی اس تبدیلی نے پورے خطے میں صدمے کی لہریں بھیج دیں۔ امریکیوں کے لیے، یہ ان کے اثر و رسوخ کے ڈرامائی کٹاؤ کی نمائندگی کرتا ہے، جب کہ اسلام پسندوں کے لیے، یہ ایک نئے دور کے طلوع ہونے کی علامت ہے - ایک ایجنسی کو دوبارہ حاصل کرنے اور کئی دہائیوں کے قبضے اور محکومی سے آزاد ہونا۔

اپنے آغاز میں، ایرانی انقلاب نے ایک پیائشی حکمت عملی اپنائی، سنی مسلمانوں کے ساتھ تصادم سے احتیاط سے گریز کیا اور فرقہ وارانہ اختلافات سے پرہیز کیا، جو سیکولر دور میں بڑی حد تک غیر فعال رہی تھیں۔ انقلاب نے

فیصلہ کن طور پر اسرائیل کے ساتھ تعلقات منقطع کر دیے، فلسطین اور اس کے نمائندوں کو کھلی حمایت کے ساتھ گلے لگایا۔[1]

فلسطینی کاز پر انقلاب کا سب سے گہرا اثر اسلامی تحریک کے اندر اٹھنے والے سوالات میں ہے: ہم مزاحمت کیوں نہیں کر رہے؟ ہم کیوں نہیں اٹھ رہے؟ اس نے ناممکنات کے وہم کو توڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی تبدیلی کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ بیداری بیان بازی کے دائرے میں نہیں رکی۔ اس نے عمل کو متحرک کیا، اسلامی مزاحمت کے پہیوں کو حرکت میں لایا۔[2]

جہیمان واقعہ ایک چھوٹے پیمانے پر بغاوت تھی جس کی قیادت ایک سعودی گروپ نے 15 ہجری صدی کے اوائل میں مکہ کی عظیم الشان مسجد میں کی تھی، جس میں مہدی کے ظہور کا اعلان کیا گیا تھا۔ اگرچہ سعودی سیکورٹی فورسز نے فرانسیسی اور غیر ملکی کارکنوں کی مدد سے بغاوت کو تیزی سے کچل دیا لیکن اس کے اثرات دور رس تھے۔ یہ واقعہ مسلمانوں کے ساتھ گہرا گونج اٹھا، جن میں بہت سے لوگ بھی شامل تھے جو مسجد میں موجود تھے، جس نے شکست اور ذلت کے دور سے آزاد ہونے کی وسیع تر تڑپ کو ظاہر کیا۔ یہ جذبہ تحریک کے لیے نمایاں ہمدردی کا باعث بنا، کچھ اس کی صفوں میں بھی شامل ہو گئے۔

اس بغاوت نے جزیرہ نما عرب کے لوگوں میں سعودی پالیسیوں سے بڑھتے ہوئے عدم اطمینان کو بھی جنم دیا، جو اس وقت سیکولرائزیشن کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور اخلاقی زوال کے واضح آثار ظاہر کرتے تھے۔ بہت سے لوگ ناخوش تھے اور حکومت کو چیلنج کرنے کے موقع کے منتظر تھے۔ نتیجتاً، جہائمہ کا واقعہ ایک واٹرشیڈ لمحہ بن گیا جس نے سعودی حکومت کو اپنے عوامی انداز کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ اس نے ظاہری طور پر اسلامی اور سلفی چہرہ اپنایا، اس نے سیکولرائزیشن، ویسٹرنائزیشن اور غیر ملکی انحصار کے اپنے بنیادی راستے کو جاری رکھا۔

[1] اس بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھیں فہمی الحویدی، ایران من الدخیل (ایران اندر سے)

[2] فلسطینی مزاحمت کے رہنما فتحی شقاقی پر ایرانی انقلاب کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ان کی مکمل تصانیف (العمل الکاملہ) صفحہ 190 آگے، 218 آگے، اور 258 آگے دیکھیں۔

یہ حکمت عملی مملکت کے بانی، عبد العزیز آل سعود کے نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہے، جس نے اپنی پالیسیوں اور ریاست کی تعمیر کی کوششوں کو غیر ملکی طاقتوں کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے مذہبیت کا ایک پوشاک برقرار رکھا۔

یہ دوغلا پن تقریباً چار دہائیوں تک برقرار رہا، جس کا اختتام شاہ سلمان اور ان کے بیٹے محمد بن سلمان کے دور میں ہوا۔ ان کی قیادت میں، سعودی عرب نے روایتی اصولوں کو ختم کرنے کے لیے بے مثال اقدامات کیے، جس سے اخلاقی گراوٹ اور سماجی لبرلائزیشن کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دریں اثنا، افغانستان پر سوویت یونین کے قبضے نے پوری اسلامی دنیا میں جہاد کی ایک لہر کو جنم دیا، خاص طور پر جب افغانوں نے غیر معمولی لچک اور غیر متوقع برداشت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے امریکیوں کو چوکس کر دیا، اور مسلمانوں کو لڑائی میں شامل ہونے کی تحریک میں سہولت فراہم کرتے ہوئے اور خفیہ طور پر عرب ممالک بالخصوص مصر، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے ذریعے ہتھیاروں اور ساز و سامان کی فراہمی کے ذریعے جہاد کی حمایت کرنے پر آمادہ کیا۔

اس پیش رفت نے فلسطین میں جہاد کے سوال کو پھر سے ابھارا اور یہاں تک کہ کچھ لوگوں کے لیے پاکستان اور افغانستان میں تربیتی کیمپ قائم کرنے کے مواقع پیدا کیے، جو فلسطین میں جہاد کے لیے بھرتی کیے گئے نوجوان تیار کر رہے تھے۔ منطق مجبور تھی: اگر افغان اپنی کم تعداد، غربت اور کمزوری کے باوجود مضبوط سوویت مشین کے خلاف ڈٹ سکتے ہیں تو فلسطینی اسرائیل کے خلاف ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

یہ تین اہم واقعات، 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں اسلامی بیداری کی رفتار کے ساتھ مل کر، فلسطینی کاز اور یروشلم کی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن موڑ پیدا کیا۔

سیکولر مزاحمتی تحریکوں کا زوال

1980 کی دہائی کے وسط تک، یہ واضح ہو گیا تھا کہ سیکولر مزاحمتی تحریکیں یا تو زوال پذیر ہیں یا تباہی کے دہانے پر ہیں۔ یہ زوال اس وقت ختم ہوا جب 1982 کے اسرائیلی حملے کے بعد فتح تحریک کو لبنان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ تحریک کے ارکان یمن، لیبیا اور الجزائر جیسے ممالک میں بکھر گئے، جب کہ فتح کی قیادت فلسطین سے دور ایک ملک تیونس منتقل ہو گئی اور مزاحمت کے لیے ایک قابل عمل بنیاد کے طور پر کام کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے فلسطین سے مزاحمت کی مؤثر بے دخلی کی نشاندہی کی، اور اگلے برسوں میں، اس کی ہمسایہ ریاستوں سے: 1970 میں اردن اور 1982 میں لبنان۔

1965 سے 1985 تک کی دو دہائیوں کے دوران ان تحریکوں کے نتائج پر نظر ڈالیں تو ان کی کامیابیاں اپنے اختیار کے علاقے میں کافی وسائل، فنڈنگ، تربیتی کیمپوں، اور کبھی کبھار عرب اور بین الاقوامی حمایت کے باوجود بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔[1]

مزید بر آں، ان تحریکوں کے اندر مالی گھپلوں، اخلاقی ناکامیوں اور اندرونی کشمکش نے مایوسی کا ماحول پیدا کیا جس کی وجہ سے بہت سوں کا ان پر سے اعتماد ختم ہو گیا اور ان کی حمایت واپس لے لی گئی۔ اس بڑھتی ہوئی مایوسی نے لوگوں کے لیے اس امید کو ترک کرنا آسان بنا دیا کہ یہ تحریکیں اپنے مقاصد حاصل کر سکتی ہیں۔

مزید بر آں، ان تحریکوں نے خود کو بائیں بازو کی جدوجہد میں الجھایا ہوا پایا جس کی وجہ سے وہ اردن اور لبنان کی حکمران حکومتوں کے ساتھ براہ راست تصادم میں آ گئے، کیونکہ انہوں نے مسلح مضبوط قلعے قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے انہیں بہت سے لوگوں سے متصادم کر دیا، جن میں وہ لوگ جو فلسطین کے ہمدرد ہیں، اور خود حکومتوں کے ساتھ۔ اگرچہ یہ حکومتیں نہ تو حقیقی طور پر قوم پرست تھیں اور نہ ہی واقعی عربیت اور فلسطین کے

[1] الفتح، پاپولر فرنٹ، ڈیموکریٹک فرنٹ اور دیگر جیسی تحریکوں کے لیے دستیاب مالی اور سیاسی وسائل نسبتاً اہم تھے، خاص طور پر اس کے مقابلے میں جو بعد کے سالوں میں اسلامی تحریکوں کے لیے دستیاب ہوں گے، ایسے وسائل جن کا بعد کے لوگوں کو ایک حصہ بھی نہیں ملے گا۔ بہر حال، اس حمایت کے پیمانے کے باوجود، یہ وسائل ایک ایسی مزاحمتی تحریک بنانے کے لیے ناکافی تھے جو ایک ایسی فوجی ریاست کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو، جسے مسلسل سیاسی، اقتصادی اور فوجی حمایت حاصل ہو۔

لیے پر عزم تھیں، لیکن ان تحریکوں کے تصادم اور متکبرانہ انداز نے حکومتوں کو ان کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے ایک آسان بہانہ فراہم کیا، اکثر مقامی دھڑوں کی مدد سے جو تحریکوں سے مایوس ہو گئے تھے۔

مزید برآں، بائیں بازو، سیکولر اور قوم پرست نظریات سے جڑی ان تحریکوں کی فکری بنیادوں کو پہلے ہی کافی دھچکا لگا تھا، جس سے ان کی اپیل میں کمی آئی، خاص طور پر جب 1950 اور 1960 کی دہائیوں کے مقابلے میں۔ عرب قوم پرستی کے منصوبے کو 1967 کی شکست کے ساتھ زبردست دھچکا لگا، اور بائیں بازو اور کمیونسٹ نظریات کا اثر 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں کم ہوتا چلا گیا کیونکہ اسلامی بیداری نے خاص طور پر مصر اور جزیرہ نما عرب میں زور پکڑا۔ اس نظریاتی تبدیلی نے لوگوں اور ان تحریکوں کے درمیان دراڑ کو وسیع کر دیا، جن میں سے اکثر اپنی سیکولرازم، الحاد، اور ناچ گانے، شراب نوشی اور تشدد جیسے غیر اخلاقی رویوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے انتہائی حد تک بڑھ گئے تھے۔

آخر کار، فلسطین لبریشن آرگنائزیشن ((PLO نے سیاسی رعایتوں کا سلسلہ شروع کیا، جس کا آغاز ایک واحد فلسطینی ریاست کے مطالبے اور یہودیوں کی ان کی سرزمین پر واپسی سے ہوا۔ اس کے بعد ایک سیکولر ریاست کو تسلیم کیا گیا جہاں فلسطینیوں اور یہودیوں کو مساوی حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہوں گی، پھر زمین کے ایک حصے پر دو ریاستی حل کی توثیق، اور آخر میں اس یقین سے ہٹنا کہ مسلح جدوجہد ہی اسے کئی آپشنز میں سے ایک کے طور پر تسلیم کرنے کا واحد حل ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو اس وقت تک پی ایل او کے حامی رہے تھے، یہ واضح ہو گیا تھا کہ تنظیم اور اس کی تحریکیں تھک چکی ہیں، کمزور ہو چکی ہیں اور قوتِ حیات ختم ہو چکی ہیں۔[1]

سیکولر مزاحمتی تحریکوں کا تجربہ اسلامی تحریک کے اندر ندامت اور ملامت کا باعث بنا۔ غالب جذبات یہ ہے کہ اگر الفتح کے بانی ارکان اخوان المسلمین سے ہوتے اور اگر وہ اس گروپ کو صرف مزاحمت کی خواہش سے نہ

[1] الفتح اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کے اندر موجود مظاہر کے بارے میں بصیرت کے لیے، صلاح خلف کا فلسطینی بغیر شناخت کے، صفحہ۔ 215 اور اس کے بعد۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی یادداشتوں کے بعد کے حصے میں یہ ثابت قدم رہنما لکھتے ہیں، "فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کا ایک دوسرے کو سمجھنا مقصود تھا، لیکن اس سے پہلے انہیں پہلے حقائق کو تسلیم کرنا ہو گا، ایک دوسرے کو تسلیم کرنا ہو گا اور ایک ہی سرزمین پر بقائے باہمی کی ضرورت کو تسلیم کرنا ہو گا۔" (ص 312)

چھوڑتے تو ان کا وژن زیادہ نتیجہ خیز ہوتا۔ اگر اخوان اپنے اہداف کے ساتھ مکمل طور پر مصروف رہتے تو نتائج زیادہ کامیاب ہوسکتے تھے۔ اس تحریک نے شاید اس سیکولر اور اخلاقی زوال سے بچایا ہوگا جو اس میں گھس آیا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تکلیف دہ ناکامیوں سے بھی بچا تھا۔ فتح کا زوال اور مزاحمت کے اندر سیکولرازم کا عروج ان لوگوں کے لیے مسلسل مایوسی اور مایوسی کا باعث تھا جو حالات کو اسلامی اقدار کی عینک سے دیکھتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر درست تھی کیونکہ الفتح کی بہت سی اہم شخصیات اس سے قبل اسلامی تحریک کا حصہ رہ چکی ہیں، جو اس وقت کی فوری ضرورت کو سمجھنے میں ناکام رہی، اپنے راستے کو غلط سمجھا اور ایک سنہری موقع کو ضائع کر دیا۔

سیکولر مزاحمتی تحریکوں کا تجربہ اسلامی تحریک کے اندر ندامت اور ملامت کا باعث بنا۔ غالب جذبات یہ ہے کہ اگر الفتح کے بانی ارکان اخوان المسلمین سے ہوتے اور اگر وہ اس گروپ کو صرف مزاحمت کی خواہش سے نہ چھوڑتے تو ان کا وژن زیادہ نتیجہ خیز ہوتا۔ اگر اخوان اپنے اہداف کے ساتھ مکمل طور پر مصروف رہتے تو نتائج زیادہ کامیاب ہوسکتے تھے۔ اس تحریک نے شاید اس سیکولر اور اخلاقی زوال سے بچایا ہوگا جو اس میں گھس آیا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تکلیف دہ ناکامیوں سے بھی بچا تھا۔ فتح کا زوال اور مزاحمت کے اندر سیکولرازم کا عروج ان لوگوں کے لیے مسلسل مایوسی اور مایوسی کا باعث تھا جو حالات کو اسلامی اقدار کی عینک سے دیکھتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر درست تھی کیونکہ الفتح کی بہت سی اہم شخصیات اس سے قبل اسلامی تحریک کا حصہ رہ چکی ہیں، جو اس وقت کی فوری ضرورت کو سمجھنے میں ناکام رہی، اپنے راستے کو غلط سمجھا اور ایک سنہری موقع کو ضائع کر دیا۔

عربوں کو معمول پر لانے، اسلامی بیداری اور سیکولر مزاحمتی تحریکوں کے زوال کے ان متضاد عوامل نے اسلامی مزاحمتی تحریک حماس کے ابھرنے کے لیے ایک زرخیز میدان بنایا۔

پہلی اسلامی تنظیمیں ڈاکٹر فتح الشقاقی کی قیادت میں قائم کی گئیں، جن کا خیال تھا کہ اسلام پسند اب مزاحمت میں شامل ہونے کے قابل ہیں اور ایسا نہ کرنا ان کے لیے غیر ذمہ دارانہ اور ناقابل قبول ہے۔ وہ موجودہ تقسیم سے سخت پریشان تھا، جسے اس نے اس جملے میں پکڑا، "اسلام کے بغیر قوم پرست، اور فلسطین کے بغیر اسلام پسند۔[1]"

---

[1] فتح الشقاقی، ج 1، ص 347۔

1980 میں، انہوں نے اسلامی جہاد موومنٹ قائم کی، یہ محسوس کرنے کے بعد کہ وہ اپنے پرانے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں، اخوان سے الگ ہو گئے۔ تحریک کے مسلح ونگ نے 1981 کے موسم گرما میں شکل اختیار کرنا شروع کی، اس کا پہلا آپریشن 1986 میں ہوا، جسے باب المغرب آپریشن کہا جاتا ہے، اس دوران انہوں نے تقریباً اسی اسرائیلی فوجیوں کو نشانہ بنایا۔ اس نے بعد میں ہونے والی کارروائیوں کی ایک سیریز کا آغاز کیا۔[1]

اخوان المسلمون سے فتح الشقاقی کی علیحدگی آخری اہم تقسیم میں سے ایک تھی۔ گروپ کے اندر یا اس کے قریب پیدا ہوا اس حساب سے کہ وہ اس تحریک کا حصہ تھا جو بالآخر اسے مزاحمت کی طرف لے جائے گی۔ آج تک، فلسطین، خاص طور پر غزہ میں، جو اسلامی تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے، میں حماس کی تشکیل اور اخوان المسلمون سے اس کے تعلق کے بارے میں محدود اور بکھری معلومات موجود ہیں۔ تاہم، دستیاب تفصیلات بتاتی ہیں کہ حماس نے خاموش بغاوت یا فلسطین میں اخوان کی موجودگی پر ہموار قبضے کی نمائندگی کی۔ شیخ احمد یاسین کی طرف سے متعارف کرایا جانے والا نقطہ نظر خطے میں اخوان کے قائم کردہ طریقوں سے متصادم ہے، جن طریقوں کو وہ طویل عرصے سے قبول کرتے اور ان پر عمل پیرا تھے۔

نتیجے کے طور پر، حماس کے کچھ بانی رہنماؤں نے مہارت اور تدبیر کے ساتھ اس خاموش قبضے کا انتظام کیا، اخوان کے بینر کو برقرار رکھتے ہوئے خاموشی سے ایسے رہنماؤں کو نظر انداز کیا جنہوں نے مزید عسکریت پسندانہ موقف کی طرف تبدیلی کی مزاحمت کی۔ ان رہنماؤں میں سے کچھ نے خلوص اور بے لوثی کے ساتھ کام کیا، بغیر کسی بڑی رکاوٹ کے اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونے کا انتخاب کیا جس کی وجہ سے کھلی پھوٹ پڑ سکتی تھی،[2] اس طرح فلسطین میں وسیع تر اسلامی تحریک کی خدمت کی۔

[1] الشقاقی نے خود تحریک کی بنیاد اور نظریہ کے بارے میں لکھا۔ دیکھیں مکمل کام، جلد 1، صفحہ 346 اور اس سے آگے۔
[2] شیخ عبد الفتاح دُکھان ایسی قیادت کی ایک مثال ہیں۔

عام طور پر، قائدین کے مستعفی ہونے کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، کیونکہ قیادت کے تنازعات اکثر اسلامی تحریکوں کے اندر پھوٹ اور تقسیم کا مرکز ہوتے ہیں۔ بے غرضی کے اس طرح کے کاموں کے لیے عام طور پر اعلیٰ درجے کی ذاتی سالمیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگرچہ شیخ احمد یاسین نے بعد میں اخوان المسلمون کے روایتی موقف سے علیحدگی کی علامت ظاہر کی، لیکن وہ فتح کے ابتدائی دنوں میں شامل نہیں ہوئے اور اس کے بنیادی نقطہ نظر کو یکسر مسترد کر دیا۔ انہوں نے دلیل دی کہ اس طریقہ کار سے کوئی بامعنی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ان کے خیال میں کمزور عرب ریاستوں کی طرف سے مسلح مزاحمت کا آغاز اسرائیل کو صرف اس قابل بنائے گا کہ وہ دوسرے علاقوں میں مزید توسیع کر سکے اور ان حکومتوں کو مزاحمتی کوششوں پر غلبہ حاصل کر سکے۔ اس کے بجائے، اس نے اس بات کی وکالت کی کہ مزاحمت کا آغاز صرف مقبوضہ علاقوں کے اندر سے ہونا چاہیے، اور اگر یہ فوری طور پر ممکن نہیں تھا، تو اس نے اس مقصد کے لیے منظم طریقے سے کام کرنے کی تجویز پیش کی[1]۔

اگرچہ اسلام پسندوں کی مزاحمت سے پرہیز کا دور انمول مواقع کو ضائع کرنے کا باعث بنا، لیکن یہ مکمل طور پر غیر نتیجہ خیز نہیں تھا۔ اسلام کی متحرک فطرت اور اس نے اپنے پیروکاروں میں جو توانائی پیدا کی، اسے خیراتی، تعلیمی اور مشنری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ طلبہ کی متحرک سرگرمی میں شامل کیا گیا۔ 1970 اور 1980 کی دہائیوں کے وسیع تر اسلامی احیاء کے دوران، اسلام پسندوں نے نمایاں طور پر توسیع کی، متعدد سماجی اور ادارہ جاتی فریم ورک قائم کیے،[2] جن میں فلسطین اور فلسطینی تارکین وطن دونوں میں تعلیمی، خیراتی، اور مشنری تنظیمیں شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، فلسطینی طلبہ یونینیں تیزی سے اسلامی اثر و رسوخ میں آتی گئیں، اور فلسطینی معاشرے نے ایک اعلیٰ اسلامی قیادت پیدا کرنا شروع کی جس کا نقطہ نظر الفتح اور پی ایل او کے سیکولر رجحان سے بالکل متصادم تھا۔

[1] احمد منصور، ص76 ایف، ص88۔ اس کے علاوہ، احمد جبریل، صفحہ 100-02 دیکھیں

[2] احمد منصور، ص84 ایف۔

نتیجتاً، جب بالآخر اسلامی مزاحمتی تحریک ابھری تو اس نے وسیع اور گہری جڑوں والے سوشل نیٹ ورکس کی حمایت سے ایسا کیا۔[1] اس مضبوط بنیاد نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اس کا اچانک اضافہ مضبوط اور دور رس دونوں تھا۔

حماس کی ترقی کے ابتدائی مراحل 1980 میں شروع ہوئے، جب منتخب نوجوان ارکان کو فوجی تربیت کے لیے بیرون ملک بھیجا گیا۔ 1981 تک، تحریک نے انٹیلی جنس جمع کرنے، صہیونیوں کے ساتھ کام کرنے والے فلسطینی ساتھیوں کا سراغ لگانے، اور ایجنٹوں کے طور پر بھرتی ہونے والوں کی شناخت کے لیے ایک حفاظتی اپریٹس قائم کیا تھا۔ اس اپریٹس نے مؤثر طریقے سے کچھ ساتھیوں کا پردہ فاش کیا اور عوامی انکشاف کے بغیر احتیاط سے انہیں جوابدہ ٹھہرایا۔[2]

اس کے بعد، حماس نے ایک فوجی ونگ کی بنیاد رکھی جس کا کام نوجوان جنگجوؤں کو بھرتی کرنا اور ہتھیار حاصل کرنا دونوں خطرناک کوششوں کے لیے مقبوضہ ماحول میں، خاص طور پر سخت حفاظتی اقدامات پر مبنی حکومت کے تحت۔ یہ چیلنجز محدود مہارت کی وجہ سے بڑھ گئے تھے، جن کے لیے آزمائش اور غلطی کے نقطہ نظر پر انحصار کی ضرورت تھی۔

خطرات کے باوجود، پیش رفت جان بوجھ کر اور خفیہ تھی۔ ملٹری ونگ نے کئی ایسے آپریشن کیے جن کی وجہ سے اسرائیلی فوجی مارے گئے یا پکڑے گئے۔ تاہم، کچھ فوجی سیلز کے سامنے آنے کے نتیجے میں گرفتاریاں ہوئیں، جن میں 1984 میں شیخ احمد یاسین کی حراست بھی شامل تھی۔[3]

کچھ ذرائع بتاتے ہیں کہ 1980 کی دہائی کے پہلے نصف میں مزاحمتی سرگرمیوں میں خاص طور پر فلسطین کے اندر پریشان کن کمی دیکھی گئی[4]۔ اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات فلسطینی معاشرے کے بڑے طبقات اور یہودی

---

3 Ibid., 125.[1]

Ibid., p.127 ff [2]

Ibid., p.119 ff[3]

[4] میں نے ذاتی طور پر یہ بات حماس تحریک کے بعض رہنماؤں سے مختلف عوامی جلسوں کے دوران سنی ہے اور ساتھ ہی اس دور کے عینی شاہدین سے بھی۔ اس کے حوالے دیگر ذرائع سے بھی مل سکتے ہیں۔ دیکھیں، مثال کے طور پر، عبدالوہاب المسیری، میرا فکری سفر، صفحہ 524-25

آبادی کے درمیان بڑھتے ہوئے معمول پر آنا اور موافقت پیدا کرنا تھا۔ بعض صورتوں میں، دونوں فریقوں کے درمیان بات چیت فطری رشتوں سے مشابہت اختیار کرنے لگی۔ بہت سے فلسطینی اسرائیلی علاقوں میں کام کرتے تھے، اکثر اپنے آبائی شہروں سے ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ دور گزارتے تھے، 1948 کے بعد سے زیر قبضہ علاقوں میں اپنے کام کی جگہوں پر رہتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ، طویل نمائش، بڑھتی ہوئی واقفیت، اور فوری خطرات میں کمی نے یہودیوں کی موجودگی کو فلسطینی معاشرے میں داخل ہونے کی اجازت دی، ابتدا میں تجارت کے ذریعے اور بعد میں سماجی تعاملات تک پھیل گئی۔ یہ متحرک، بدلے میں، فلسطینی معاشرے کے بعض شعبوں میں سماجی بیگانگی اور مزاحمتی سرگرمیوں کو مسترد کرنے کا باعث بنا۔

یہ صورت حال حیران کن نہیں ہے، کیونکہ یہ دباؤ کے تحت سماجی رویے کی فطری حرکیات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس وقت کے سنگین حالات کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے، جس دوران اسرائیل نے عرب حکومتوں کے تعاون سے مزاحمتی تحریکوں کو شدید ضربیں لگائیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر 1970 میں اردن اور 1982 میں لبنان میں ہونے والے واقعات تھے، اس کے ساتھ ساتھ قتل و غارت کی ایک طویل مہم تھی جس میں یورپ، لبنان، تیونس اور دیگر مقامات پر اہم مزاحمتی رہنماؤں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان اقدامات نے ایک وسیع تاثر پیدا کیا کہ مزاحمت نہ صرف بیکار ہے بلکہ خطرناک طور پر نتیجہ خیز بھی ہے، خاص طور پر جب کئی عرب ریاستوں نے امن معاہدوں پر عمل کرنا شروع کیا اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانا شروع کیا۔

اس بڑھتے ہوئے معمول پر آنے اور فلسطینی معاشرے کے اندر یہودیوں کی موجودگی کی بڑھتی ہوئی قبولیت نے اسرائیل کو بے مثال اقدامات کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس نے بعض افراد کے ساتھ تعاون کرنا شروع کیا اور فلسطینی معاشرے کی روزمرہ کی حکمرانی کو سنبھالنے کے لیے دیہاتوں میں چھوٹے انتظامی اداروں کی تشکیل کی۔ یہ اقدام بیرون ملک فلسطین لبریشن آرگنائزیشن ((PLO کی قیادت کو ختم کرنے اور اسے بے اثر کرنے میں اسرائیل کی کامیابی کے بعد ہوا۔

اس تناظر میں، شیخ احمد یاسین اور ان کے ساتھیوں نے فلسطینی معاشرے میں خاص طور پر نوجوانوں میں پھیلنے والے معمول اور موافقت کا مقابلہ کرنے کو ترجیح دی۔ ان کی مشنری اور متحرک کوششیں اس تفہیم کو تقویت دینے کے لیے وقف تھیں کہ یہ افراد قابض ہیں، کہ وہ ایک جاری نو آبادیاتی منصوبے کی نمائندگی کرتے ہیں، اور کسی بھی حالت میں ان کے ساتھ بقائے باہمی بالکل ناقابل قبول تھا۔

اسلامی تحریک کے عروج کو بے شمار رکاوٹوں اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، جن میں سے سب سے اہم دو گنا تھے:

پہلا: بائیں بازو کے نظریات کے غلبے کے ساتھ ساتھ اسلامی طریقوں اور سرگرمیوں سے معاشرتی دوری۔ قسام بریگیڈز کے بانی رہنماؤں میں سے ایک نے نوٹ کیا کہ ان کے گاؤں سلفیت کو کبھی کمیونزم اور الحاد کے وسیع اثر کی وجہ سے "چھوٹا ماسکو" کہا جاتا تھا۔ اس کی عکاسی حجاب کی عدم موجودگی، مساجد میں نوجوانوں کی کم ہوتی ہوئی موجودگی، اسلام پسندوں کے خلاف دشمنی، اور اسی طرح کے حالات سے ہوتی ہے جو اسلامی اقدار سے بالکل دور ہو جاتے ہیں۔[1]

دوسرا: تحریک فتح کی مخالفت، جو اسلامی قیادت کے عروج کو اس کے غلبہ کے لیے براہ راست خطرہ سمجھتی تھی۔ یہ مخالفت قتل و غارت، اسلامی رہنماؤں کے گھروں کو نشانہ بنانے والے بم دھماکوں، طلباء کی جھڑپوں، اور یہاں تک کہ اسرائیلی جیلوں کے اندر دشمنی تک بڑھ گئی، جہاں حماس کے قیدیوں کو الفتح کے حامیوں کی طرف سے اکسایا گیا ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ شیخ احمد یاسین نے نہایت مہارت کے ساتھ اس غیر مستحکم صورت حال کو آگے بڑھایا، اندرونی تنازعات سے بچنے اور تحریک کو بے عزت یا بے دفاع کرنے کی اجازت دینے سے انکار کے درمیان توازن قائم کیا۔ اس کی حکمت عملی کامیاب رہی، جس نے اسلامی تحریک کو اندرونی طور پر ٹوٹے بغیر یا اپنے قد و قامت کو کھونے کے بغیر ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا۔[2]

---

[1] ظاہر جبرین، حکمت الدم: من شر عین القسام، (خون کی کہانی: القسام کی شریانوں سے)، صفحہ 25 ایف۔

[2] احمد منصور، ص 104 ایف۔، ص 156۔ ابراہیم گوشہ، صفحہ 167-68۔

تحریک کے عسکری ونگ کو 1984 میں اس کے خلل کے بعد دوبارہ تشکیل دیا گیا تھا۔ ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب پاپولر فرنٹ فار لبریشن آف فلسطین نے لبنان جنگ کے دوران تین اسرائیلی فوجیوں کو پکڑا اور ان کا تبادلہ 1200 فلسطینی قیدیوں کے بدلے کیا، جن میں شیخ یاسین بھی شامل تھے، جنہوں نے صرف گیارہ ماہ کی سزا کاٹ کر شیخ یاسین کی رہائی کی کوشش کی۔ 1986 میں۔ تاہم، حماس نے دسمبر 1987 میں پہلی انتفادہ کے پھٹنے تک اپنے وجود کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا۔

ایک صہیونی ٹرک ڈرائیور نے جان بوجھ کر فلسطینی کارکنوں کے ایک گروپ پر چڑھ دوڑا جس سے فلسطینی معاشرے میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ ہتھیاروں کی کمی کے باعث غیر مسلح کمیونٹی صرف پتھر پھینک کر جواب دے سکتی تھی۔ غصے کا یہ پھوٹنا "پتھروں کا انتفادہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں اس کی قیادت غزہ کی اسلامی یونیورسٹی کے طلبہ کرتے تھے۔ اسلامی تحریک، جو برسوں سے ایسے لمحے کی تیاری کر رہی تھی، نے مداخلت کا فیصلہ کیا، صورت حال کو بڑھاتے ہوئے اور انتفاضہ کو یونیورسٹی سے، جسے اسرائیلیوں نے بند کر رکھا تھا، سڑکوں، چوکوں اور مساجد میں منتقل کر دیا۔[1]

انتفاضہ تیزی سے پورے فلسطین میں پھیل گیا، اور وہ لوگ جو دبے ہوئے، کمزور اور خستہ حال دکھائی دے رہے تھے، گویا اسرائیل نے مزاحمت کے بیج کو بجھا دیا تھا اور اس کے قائدین ایک بار پھر قبضے کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس اچانک بغاوت نے اسرائیلی اور فلسطینی قیادت دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔[2] انقلابی اقدامات معاشرے کے تمام طبقات میں ابھرے، جس نے وسیع پیمانے پر مزاحمت کو بڑھایا، بشمول ہڑتالیں، ٹیکس سے انکار، اور اسرائیلی سول اتھارٹی کا بائیکاٹ۔ پہلی بار ایسا لگتا ہے کہ اندرونی فلسطینی کمیونٹی، جو طویل عرصے سے محکوم اور معمول پر تھی، نے بیرون ملک سے چلنے والی مزاحمتی تحریکوں کے زوال کے بعد اس اقدام پر قبضہ کر لیا ہے۔

---

1 Ibid., p.169 ff.[1]

[2] فتح الشقاقی، ج1، ص358ف۔

تاہم، اس انتفاضہ نے اسرائیلیوں اور ان کے اتحادیوں کے لیے ایک نیا اور خطرناک عنصر بھی متعارف کرایا: اسلامی تنظیموں کا عروج۔ ان گروہوں نے جدوجہد کو ایک نیا تناظر پیش کیا۔ جب کہ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن نے کبھی ایک واحد ریاست کے نظریے کی پیروی کی تھی جہاں یہودی اور عرب ایک ساتھ رہتے تھے، اسلامی تنظیموں نے پورے فلسطین کو دریا سے سمندر تک آزاد کرنے کے خیال کو زندہ کیا۔ اس وژن کو ایک مقدس مقصد کے طور پر پیش کیا گیا، جس کی جڑیں مذہبی اصولوں میں گہری ہیں، جس سے کسی بھی سمجھوتہ یا رعایت کو نہ صرف مشکل بلکہ ناقابل تصور بنایا گیا، جو تنظیموں کے زیادہ عملی، سیکولر نقطہ نظر سے بالکل متصادم تھا جو ممکن سمجھا جاتا تھا۔

قبضے نے ہڈیوں کو توڑنے کے وحشیانہ عمل سے شروع کرتے ہوئے متعدد تعزیری اقدامات کا استعمال کیا۔ فلسطینی نوجوانوں کو پکڑ لیا گیا، اور ان کے بازو یا ہاتھ جان بوجھ کر ٹوٹ گئے۔ ان کارروائیوں میں گرفتاریاں، قید، ٹارچر، آنسو گیس کے دستی بموں کی تعیناتی، اور بالآخر فائرنگ کے نتیجے میں ہلاکتیں شامل ہیں۔ انتفاضہ کے چھ سالوں کے دوران، تعداد میں 1500 سے زیادہ شہید، تقریباً 130,000 زخمی، اور تقریباً 120,000 حراست میں لیے گئے۔ وسیع پیمانے پر مظاہروں کے علاوہ، دیگر اہم کارروائیاں ہوئیں، جیسے کہ اسرائیلی فوجیوں کا اغوا، ساتھیوں کو نشانہ بنانا، اور بستیوں اور یہودی مقامات پر کئی مسلح حملے۔ ان پیش رفتوں نے اسرائیلیوں کو حیران کر دیا، خاص طور پر حماس سمیت کسی بھی گروپ نے ان کارروائیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی، جس سے واقعات کے ارد گرد الجھن میں اضافہ ہوا۔[1]

اسلامی مزاحمتی تحریک (حماس) کے باضابطہ اعلان کے بعد اسرائیل نے اپنے ارکان اور مشتبہ رہنماؤں کی گرفتاری کے لیے ایک جارحانہ مہم شروع کی۔ اس کے ابتدائی مراحل میں غزہ اور مغربی کنارے میں متعدد رہنماؤں کو دوسروں کے ساتھ حراست میں لیا گیا۔ اس کے باوجود، میدانی سرگرمیاں، بشمول انتفاضہ کا انعقاد اور بیانات جاری کرنا، بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔

[1] احمد منصور، ص 159 الف۔

اس عرصے کے دوران، اردنی حکومت نے 31 جولائی 1988 کو مغربی کنارے سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ایک اہم اور متنازعہ فیصلہ کیا، اور اس علاقے کی تقدیر فلسطینیوں کے حوالے کر دی[1]۔ اس نے مؤثر طریقے سے اسرائیل کو زیادہ کنٹرول سونپ دیا اور قبضے کے تحت حکومت پر فلسطینیوں کے اندرونی تنازعات کو بڑھا دیا۔ اس اقدام نے خاص طور پر نازک موڑ کے دوران قبضے کی گرفت کو مزید مضبوط کیا۔

کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ شاہ حسین کا فیصلہ دو متضاد دباؤ سے بچنے کی ضرورت سے پیدا ہوا ہے جس سے وہ اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ سب سے پہلے اردن کی عرب آبادی سے آیا، جس میں ایک اہم فلسطینی آبادی شامل تھی جس نے مختلف انقلابات کے دوران اردن میں پناہ لی تھی۔ اس گروپ نے انتفاضہ کی مضبوط حمایت اور قبضے کے خلاف مزاحمت میں زیادہ فیصلہ کن کردار پر زور دیا، خاص طور پر جب سے اس وقت اردن کے آئین کے تحت، مغربی کنارے کو اب بھی اردن کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔

دوسرا دباؤ اسرائیل کی طرف سے آیا، جس نے اردنی حکومت سے سیاسی، سیکورٹی اور حتیٰ کہ فوجی تعاون بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح کے مطالبات نے بادشاہت کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا، کیونکہ شاہ حسین، صہیونی مفادات کے ساتھ اپنی صف بندی کے باوجود، اپنے لوگوں کے درمیان قانونی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے کٹر پین-عرب بیان بازی کا ایک پہلو برقرار رکھا۔

تاہم، واقعات کی ترتیب ایک زیادہ کپٹی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے. علیحدگی کے فیصلے نے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کے مغربی کنارے کی آبادی کی نمائندگی کو اس کے حوالے کر کے اس کے سیاسی موقف کو مؤثر طریقے سے زندہ کر دیا۔ پی ایل او نے فوری طور پر اس موقع سے فائدہ اٹھایا، تین ماہ بعد اپنی 19 ویں قومی کونسل کا اجلاس بلایا۔ اس ملاقات نے الفتح اور پی ایل او کے موقف میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کی، جو ان کی

[1] مغربی کنارہ، اردن کے آئین کے مطابق، ہاشمی سلطنت کا حصہ تھا۔ شاہ حسین نے خود 1960 کی دہائی میں اعلان کیا تھا کہ "دونوں کناروں کا اتحاد ایک ایسا اتحاد ہے جسے خدا نے عطا کیا ہے، جسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے، اور عظیم تر اتحاد کے لیے ایک اہم مرکز ہے۔" 14 جون 1966 کو شہر اجلون میں شاہ حسین کی تقریر کا متن، احمد الشقیری، مکمل کام، 5/379 میں ملاحظہ کریں۔

سابقہ پوزیشنوں سے غداری کا اشارہ دیتا ہے اور ایسے اقدامات کا مرحلہ طے کرتا ہے جو بالآخر فلسطینی انتفاضہ کو نقصان پہنچائے۔

کانفرنس کے دوران، PLO نے فلسطین کے لیے 1947 کے اقوام متحدہ کی تقسیم کے منصوبے کو قبول کیا اور تنازع کے سیاسی حل کی وکالت کی۔ اس اقدام نے اسرائیل کو تسلیم کرنے اور 1948 میں قبضے کی اراضی کے دعووں کو ترک کرنے پر آمادگی کا اشارہ دیا۔ کانفرنس کو صرف مراعات کے سلسلے کے طور پر پیش کرنے سے بچنے کے لیے، PLO نے فلسطین کی نام نہاد آزادی کا اعلان بھی کیا۔ اگرچہ اس میں آزادی کے حصول کے لیے عملی صلاحیت کا فقدان تھا، لیکن اس اعلامیے نے بہت سی ریاستوں اور حکومتوں کو "فلسطین" کو تسلیم کرنے کا موقع فراہم کیا یا زیادہ درست طور پر، قیادت اب اسے سیاسی سمجھوتہ اور ہتھیار ڈالنے کی طرف لے جا رہی ہے۔ دریں اثنا، مغربی اقوام نے فلسطین اور پی ایل او دونوں سے تسلیم کو روکنا جاری رکھا۔[1]

فلسطینی کاز کو دو بار، دو الگ الگ مراحل پر، دو متضاد بینرز کے نیچے دھوکہ دیا گیا۔ سب سے پہلے اسے عربیت اور قوم پرستی کی آڑ میں کمزور کیا گیا جس نے فلسطینی عوام کو آزاد قیادت اور نمائندگی کے حق سے محروم کر دیا۔ اس وقت، دعویٰ یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی فوجوں کا کام ہے، نہ کہ گوریلا گروہوں کا، اس طرح فلسطینیوں کو مسلح مزاحمت اور گوریلا جنگ میں شامل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ بعد میں جب عرب حکومتوں نے سارا فلسطین صہیونیوں کے حوالے کر دیا تو اس بار قوم پرستی کے جھنڈے تلے دوسری غداری ہوئی۔ یہ دلیل دی گئی تھی کہ یہ فلسطینی ہی تھے جو اپنے مقصد کی حمایت کرنے اور اپنی سرزمین کی آزادی کا دفاع کرنے کے لیے بہترین تھے۔ تاہم، یہ منتقلی صرف اس وقت شروع کی گئی جب فلسطین لبریشن آرگنائزیشن ((PLO کی قیادت کمزور ہو چکی تھی، کمزور ہو گئی تھی، اور اسے تسلیم کرنے اور مایوسی کے ساتھ مذاکرات کی راہ کی طرف ہدایت دی گئی تھی۔[2]

---

[1] عبداللہ عزام، ج1، ص853؛ محسن صالح، صفحہ 109-10

[2] 18 اگست 1988 کو جاری کردہ حماس کے بیان نمبر 28 کا حوالہ دیں جس میں علیحدگی کے فیصلے اور اس کے اثرات اور نتائج کی تنبیہ کی گئی ہے۔

ان سیاسی ہتھکنڈوں کے باوجود انتفاضہ زمین پر شدید جل گیا۔ بغاوت کے دوران مسلح مزاحمت نے اپنی صلاحیتوں کو مضبوط اور نکھارنا شروع کیا۔ حماس کے عسکری ونگ نے 1989 میں دو اسرائیلی فوجیوں کے اغوا کے ساتھ کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اگرچہ اس ابتدائی کوشش کو دبا دیا گیا تھا، لیکن یہ گروپ دوبارہ منظم ہوا اور 1990 میں "عزالدین القسام بریگیڈز" کے طور پر دوبارہ ابھرا۔ نئی تنظیم نے تیزی سے زور پکڑا، اور 1993 تک، اس نے تقریباً 140 آپریشن کیے جن میں 80 اسرائیلی ہلاک اور 200 سے زیادہ زخمی ہوئے۔[1]

جو چیز واقعی غیر معمولی طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کامیابی کا زیادہ تر حصہ آزمائش اور غلطی کے عمل کے ذریعے سامنے آیا، ناکامیوں اور قربانیوں سے سیکھنے کے بعد۔ مزاحمت نے اپنے آغاز سے لے کر ان کامیابیوں تک جس رفتار سے ایک جابرانہ ماحول میں اور بغیر کسی پیشگی تجربے کے آگے بڑھی ہے وہ اس کی لچک اور عزم کا واضح ثبوت ہے۔[2]

بغاوت، جسے اکثر "پتھروں کا انتفادہ" کہا جاتا ہے، بڑے پیمانے پر "مساجد کا انتفادہ" کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ عہدہ مساجد میں اس کی جڑیں، جمعہ کی نماز کے بعد ہفتہ وار اس کی رفتار کی تعمیر،[3] اور قیادت کے واضح طور پر اسلامی رجحان سے پیدا ہوا ہے۔ اس تحریک کو اسلامی نعروں، اسلامی مبلغین کے پھیلاؤ، اور اسلامی دھڑوں کے ظہور سے نشان زد کیا گیا، جو اس کے الگ الگ اسلامی تشخص کو اجاگر کرتا ہے۔ اس نے بائیں بازو اور قوم پرست تحریکوں کے ارکان کی شرکت کو روکا نہیں، جن کی شمولیت نے بغاوت کے وسیع تر اسلامی کردار کو کمزور نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اسرائیل نے ایک بڑا کریک ڈاؤن شروع کیا، مغربی کنارے اور غزہ سے 400 سے زائد اسلامی رہنماؤں کو گرفتار کر کے لبنان جلاوطن کر دیا۔ تاہم، ان جلاوطن رہنماؤں نے جنوبی لبنان کے ایک دور افتادہ اور سخت مقام مرج الزہور پر دھرنا دے کر اخراج کی مخالفت کی۔ منجمد، ناگوار حالات میں ایک عارضی کیمپ لگا کر، انہوں نے اپنی آزمائش کو ایک ایسے موقع میں بدل دیا جس سے اہم کامیابیاں حاصل ہوئیں:

---

[1] محسن صالح، صفحہ 106-07۔

[2] مثال کے طور پر دیکھیں، ظاہر جبرین، ص 36ف

[3] احمد منصور، صفحہ 174-75

1. **پی ایل او کی قیادت سے واضح فرق:** اسلامی رہنماؤں کی یہ نئی لہر پی ایل او کی شخصیات سے بالکل متصادم تھی، جو بیرونی ممالک کی سیاست میں شامل ہو چکے تھے اور اکثر ذاتی مفادات فلسطین سے دور رہتے تھے۔

2. **فلسطین کے ساتھ گہری وابستگی:** جلاوطن رہنماؤں نے اپنے وطن کے ساتھ اپنی غیر متزلزل لگاؤ کا مظاہرہ کیا، سنگین حالات میں سرحد پر قائم رہے اور واپسی کے خواہاں تھے، یہاں تک کہ بڑے ذاتی خطرے میں بھی۔ ان کی مخالفت لچک کا ایک طاقتور اور متاثر کن عمل تھا۔

3. **اتحاد کا ایک انوکھا موقع:** ایک جگہ پر ان رہنماؤں کے اجتماع نے اسٹریٹجک ہم آہنگی کے لیے ایک نادر اور انمول موقع پیدا کیا، جس سے وہ اپنے منصوبوں کو مضبوط بنانے اور اپنی تنظیمی کوششوں کو مضبوط کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں، یہ فلسطین کے اندر رکاوٹوں کے تحت ایک ناممکن کارنامہ ہے۔

4. **میڈیا کی توجہ میں اضافہ:** دھرنا عرب اور بین الاقوامی میڈیا کے لیے ایک مرکزی نقطہ بن گیا، جس نے مزاحمت کی اس بے مثال شکل پر روشنی ڈالی۔ اس نے ان اسلامی رہنماؤں کے الگ کردار کو اجاگر کیا، انہیں PLO کے نقطہ نظر سے الگ کیا۔

5. **حماس کے اثر و رسوخ میں تیزی سے اضافہ:** یہ واقعات حماس کی مقبولیت میں ڈرامائی اضافے کا باعث بنے، اس کی قیادت کی علامتی اور عملی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس سے نہ صرف ان کا موقف مضبوط ہوا بلکہ ان کی وسیع تر اپیل اور اثر کو بھی تقویت ملی۔[1]

انتفاضہ کے سب سے اہم نتائج میں سے ایک فلسطینی مزاحمت کے میدان جنگ اور قیادت کا فلسطین کے اندر ہی منتقل ہونا تھا۔ اس سے پہلے، مزاحمت بیرون ملک پہلے اردن، پھر لبنان میں مقیم تھی۔ مزاحمت کے اس اندرونی ہونے نے قبضے کے لیے خطرہ کو مزید تیز کر دیا، کیونکہ مقامی جنگجو علاقے سے اچھی طرح واقف تھے اور تنازعہ کو ہدایت دینے اور اس کی آپریشنل ضروریات کو پورا کرنے کے لیے منفرد مقام رکھتے تھے۔ جیسا

[1] مرج الظہور کے واقعہ کے بارے میں دیکھیں عدنان مسعودی، الا المو جہ، ص 111 الف۔

کہ کہاوت ہے کہ وطن کے اندر ایک سپاہی کی قیمت اس کے باہر سو سے زیادہ ہے اور اندر کی ایک رائفل کی سرحدوں سے باہر سو سے زیادہ قیمت ہے۔[1]

مزاحمت اپنی فطری فلسطینی سماجی بنیاد کے اندر پروان چڑھی، سیاسی سمجھوتوں اور حساب کتابوں سے بے لگام رہی جو اکثر بیرونی حکومتوں پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ بیرون ملک سے کام کرنے والی تنظیموں کے برعکس، اس کے تحفظ کے لیے کوئی ذاتی مفادات نہیں تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مزاحمت سیال تھی اور اسے سرکاری اداروں یا ڈھانچے میں تبدیل کرنا باقی تھا جنہیں آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا یا اسے ختم کیا جا سکتا تھا۔ اس کی پوشیدہ فطرت نے اسے ایک معاون، غم زدہ آبادی کے اندر بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت دی، جس نے ایک ایسی متحرک تخلیق کی جس نے دبانے کی کسی بھی کوشش کے لیے بے پناہ چیلنجز کا سامنا کیا۔

اوسلو معاہدہ اور فلسطینی اتھارٹی کی تشکیل :

جدید تاریخ میں، غیر ملکی قابضین، جب کسی انقلاب کو دبانے سے قاصر ہوتے ہیں، تو اکثر متبادل، زیادہ گھٹیا حکمت عملیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح کے ایک حربے میں ماتحت قیادت کو فروغ دینا یا اس کے قابل بنانا شامل ہے یا جس کو کمزوری یا بدعنوانی کی وجہ سے تحریک کے نمائندے کے طور پر سنبھالنا ہے۔ ایک بار ایسا ہونے کے بعد، انقلاب کا مقصد مجروح ہو جاتا ہے، اس کی وحدت بکھر جاتی ہے، اور اس کی رفتار منتشر ہو جاتی ہے، جس سے وہ معمولی سے دباؤ میں بھی گرنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے۔[2]

اس وقت فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے چیئرمین یاسر عرفات اپنے کیریئر کے نچلے ترین موڑ پر تھے۔ اس کی قیادت تباہ کن ناکامیوں کے ایک سلسلے کا مترادف بن چکی تھی یہاں تک کہ اگر کوئی اس کے اعمال کو انتہائی خیراتی تعبیر سے دیکھے اور اپنے ارد گرد موجود بے شمار شکوک و شبہات کو نظر انداز کرے۔

---

[1] ظاہر جبرین، ص121۔

[2] یہ نمونہ مصر میں برطانوی حکومت کے خلاف 1919 کے انقلاب کے بعد واضح ہوا۔ برطانیہ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ انقلاب کی قیادت ان کے ایک قابل اعتماد اتحادی سعد زغلول کے ہاتھ میں آجائے۔ ان کی رہنمائی میں، ایک زمانے کے طاقتور انقلاب کو طویل مذاکرات میں تبدیل کیا گیا جو کہ بامعنی نتائج حاصل کیے بغیر تیس سال تک جاری رہا، جس سے برطانوی قبضے کو مصر پر اپنی گرفت برقرار رکھنے کا موقع ملا۔ بیسویں صدی میں آزادی کی ان گنت تحریکوں میں یہ منظر نامہ اپنے آپ کو دہرایا گیا۔ بار بار لوگوں نے خاص طور پر اسلام پسندوں نے قربانیوں کا خمیازہ اٹھایا اور آخری قیمت ادا کی، صرف ان کی جدوجہد کے ثمرات کو قابضین کے ساتھیوں اور وفاداروں نے چھین لیا۔

اسے 1970 میں اردن سے نکال دیا گیا تھا اور بعد میں 1982 میں لبنان سے زبردستی نکال دیا گیا تھا، دونوں بار شکست ہوئی اور ذلیل ہوا۔ پی ایل او اور الفتح کے اندر اہم طاقتوروں اور ممتاز کیڈرز کے قتل نے ان کی پوزیشن کو مزید کمزور کر دیا جبکہ اس کی تنظیم کی طرف سے کی جانے والی کارروائیوں کی تعداد اور اثرات میں کمی آئی۔

اسی دوران عرب ریاستوں نے فلسطینی کاز کو ترک کرنا شروع کر دیا۔ مصر نے 1979 میں اپنے امن معاہدے کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا، اس کے بعد شہزادہ فہد کی 1982 کی پہل، جس کی توثیق مراکش کے شہر فیز میں ہونے والی عرب سربراہی کانفرنس نے کی۔ حتیٰ کہ عرب حکومتوں نے بھی جو معمول پر لانے اور امن معاہدوں کی مخالفت کرتے تھے، کوئی معنی خیز حمایت فراہم نہیں کی۔ انہوں نے فنڈنگ روک دی اور عرفات سے دوری اختیار کی۔ لبنان میں اپنے دور میں اسد حکومت نے اس سے منہ موڑ لیا اور قذافی نے بھی اس کی پیروی کی۔ ان حکومتوں نے اسے اپنے ماتحت کرنے کی کوشش کی، فلسطینی کاز کو اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے سودے بازی سے تھوڑا زیادہ سمجھا۔

عرفات کی حالت اس وقت مزید خراب ہو گئی جب اس نے کویت پر صدام حسین کے حملے کی حمایت کرنے کی عبرتناک غلطی کی۔ اس فیصلے نے کویت اور خلیجی ریاستوں کو غصہ دلایا، جو PLO کے بنیادی مالی معاونین میں سے تھے۔ صدام کی شکست اور خلیج میں امریکی قیادت میں مداخلت کے بعد، عرفات نے خود کو عرب دنیا اور فلسطینیوں کے درمیان الگ تھلگ اور گہرا کمزور پایا۔ اس کی حالت بالکل مایوسی اور بدحالی کی ہو گئی تھی۔

میری بہترین معلومات کے مطابق، یہ ابھی تک واضح نہیں ہے کہ یاسر عرفات کو فلسطینی انتفادہ کو کمزور کرنے کے لیے سب سے پہلے کس نے اس کا رہنما بنا کر اسے استعمال کرنے کا خیال پیش کیا۔ اس نے فلسطینی جدوجہد کی تاریخ میں ایک غیر معمولی تبدیلی کی نشاندہی کی، کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب قابضین نے فلسطینی عوام کے لیے سیاسی قیادت کے قیام کی اجازت دی تھی جو برطانوی قبضے کے آغاز کے بعد سے سختی سے ممنوع تھی۔

قیادت کی پچھلی کوششیں میونسپل امور اور عوامی خدمات کی نگرانی کے لیے معمولی شخصیات کو بلند کرنے تک محدود تھیں، کبھی بھی سیاسی طور پر لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتی تھیں۔

وسیع پیمانے پر اسلامی انتفادہ نے یہ ظاہر کیا کہ قیادت سے محروم آبادی اب بھی ایک اہم اور مستقل خطرہ بن سکتی ہے۔ اس کی روانی اور وکندریقرت فطرت نے مسلسل چیلنجز پیدا کیے، کیونکہ ایک گروہ کو ختم کرنے سے ہی دوسرے گروہ کا ظہور ہوا۔ اس متحرک نے اس احساس کو جنم دیا کہ ایک تعمیل اور تابع فلسطینی قیادت کا قیام قابضین کے مفادات کو براہ راست کنٹرول سے بہتر طور پر پورا کر سکتا ہے[1]۔ یہ دیکھ کر کہ پڑوسی ریاستوں نے اپنے شہریوں کو روکتے ہوئے اسرائیل کو کس طرح مؤثر طریقے سے تحفظ فراہم کیا، اس یقین کو پختہ کیا کہ اسی طرح کی فلسطینی اتھارٹی ایک طویل مدتی حل پیش کر سکتی ہے۔

اسرائیل کے قیام کے بعد سے عرب حکومتوں پر حکومت کرنے والا طویل انتظام ان کی طاقت کو برقرار رکھنے والی بین الاقوامی حمایت کے بدلے اس کی سلامتی کو یقینی بنانے میں ان کا واضح کردار تھا۔ اس بے ساختہ سودے نے خواہشمند رہنماؤں کے درمیان مقابلہ کو فروغ دیا، ہر ایک اپنی حکمرانی کے لیے امریکی توثیق حاصل کرنے کے لیے اسرائیلی منظوری کے لیے کوشاں تھا۔

اس اہم لمحے میں، یاسر عرفات ایک فلسطینی رہنما کے طور پر ابھرے جو یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس کے لیے، یہ ایک لائف لائن تھی، ناکامیوں اور غلطیوں کی ایک طویل تاریخ کے بعد مطابقت کو دوبارہ حاصل کرنے کا ایک موقع۔ اس کے بغیر، اس نے دھندلا پن میں دھندلا ہونے کا خطرہ مول لیا، صرف ایک اور فلسطینی شخصیت بن گیا جسے تاریخ نے فراموش کر دیا اور واقعات نے اسے پیچھے چھوڑ دیا۔

اپنے پورے کیریئر کے دوران، عرفات نے ایک کثیر جہتی، پرجوش اور پھسلن والی شخصیت کا مظاہرہ کیا، اس قدر کہ بعد میں سی آئی اے کے ایک سابق ڈائریکٹر نے انہیں "سب سے زیادہ پیچیدہ شخص کے طور پر بیان

[1] مغربی کنارے میں قسام بریگیڈز کے بانیوں میں سے ایک اور اس وقت حماس کے رہنما زہر جبرین اپنی یادداشتوں میں یاد کرتے ہیں کہ ایک اسرائیلی تفتیش کار نے انہیں بتایا کہ مزاحمت کی طرف سے کی جانے والی فوجی کارروائیاں فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت دینے کی وجہ تھیں۔ سوال کرنے والے نے مزید کہا، "اگر آپ نہ ہوتے تو ہم انہیں کچھ بھی نہ دیتے، اگر ہم یہ نہ کرتے تو ہمارے پاس دوسرا البنان ہوتا۔" دیکھئے ظہور جبرین، خون کی کہانی، ص۔ 55

کیا جس کے ساتھ میں نے بغیر کسی سوال کے نمٹا ہے۔[1]" اس نے ایک غاصبانہ رجحان کا مظاہرہ کیا، خاص طور پر جب فلسطینی تحریک کے اندر ہتھیاروں اور مالیات دونوں کو کنٹرول کرنے کی بات آتی تھی۔ اس کی زندگی کے متعدد غیر واضح اور پر اسرار پہلو ابھی تک تلاش نہیں کیے گئے ہیں، اور یہ جگہ ان کو مکمل طور پر حل کرنے کے لیے بہت مختصر ہے۔ تاہم، یہاں اہم نکتہ یہ ہے کہ عرفات اپنے کیریئر کے اس نازک موڑ پر ضروری رعایتیں دینے کے لیے صحیح شخصیت بن گئے تھے[2]۔

بین الاقوامی سطح پر بھی اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ سوویت یونین ٹوٹ گیا، اور امریکہ خطے کی واحد سپر پاور بن کر ابھرا۔ صدام حسین کے کویت پر ناکام حملے اور خلیج کو کنٹرول کرنے کی کوشش کے بعد امریکہ نے عراق کی طاقت کو ختم کر کے اپنا تسلط مزید مضبوط کیا۔ ان عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں کئی اہم نتائج بر آمد ہوئے، جن میں سے سب سے اہم، ہماری بحث کے تناظر میں، یہ ہے:

1. عرب حکومتوں کا ٹوٹنا، جو ایک بار پھر کمزور اور کمزور دکھائی دیا۔ یہ حکومتیں یا تو بیرونی خطرات کے خلاف اپنا دفاع کرنے سے قاصر تھیں، جس کی وجہ سے وہ امریکیوں کے بازوؤں میں گھسنے لگیں، یا جب امریکی ان کی دہلیز پر پہنچے تو وہ بے اختیار ہو گئے۔

2. ایک زمانے میں سوویت اثر و رسوخ کے زیر اثر ممالک، جیسے شام، عراق، لیبیا، اور دیگر سے مضبوط پشت پناہی کا انخلا۔ اگرچہ اس نے انہیں فوری طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کیا، لیکن اس نے انہیں اسرائیل کا سامنا کرنے یا فلسطینیوں کو خاطر خواہ مدد کی پیشکش کرنے کے لیے بہت کمزور کر دیا۔

[1] جارج ٹینٹ: طوفان کے مرکز میں: سی آئی اے میں میرے سال، صفحہ 110 [عربی ایڈیشن]

[2] قابل ذکر ہے کہ عرفات الفتح کے اندر واحد ممتاز شخصیت تھے جنہیں قتل نہیں کیا گیا۔ اس کے حریفوں کو یا تو قتل کے ذریعے ختم کر دیا گیا یا جب وہ اس کی قیادت کے لیے خطرہ بن گئے تو انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اگرچہ ان کے خلاف کچھ تنقید ذاتی دشمنیوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے، جیسا کہ بائیں بازو اور اسلام پسندوں کی یادداشتوں میں جھلکتی ہے، لیکن اس پر ان کی سالمیت کے لیے مشہور آزاد اسکالرز نے بھی آواز اٹھائی تھی۔ مثال کے طور پر، ایک ممتاز عیسائی قوم پرست مورخ، انیس صیغ نے ان پر مالی اور انتظامی بدعنوانی کے ساتھ ساتھ بے ایمانی کا الزام لگایا۔ اسی طرح ایک آزاد ماہر لسانیات، دانشور اور ناول نگار ڈاکٹر ولید صیغ نے اپنی یادداشتوں میں عرفات اور اسرائیل کے درمیان دیرینہ رابطے کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیں انیس صیغ، انیس صیغ پر، ص۔ 289 اور اس سے آگے، اور ولید سیف، گواہ اور گواہ، صفحہ

3. صدام حسین کے کویت پر حملے اور اس کے نتیجے میں بین الاقوامی افواج کے ذریعے بے دخلی کے دوران لاکھوں فلسطینیوں کی دوسری بے گھری، خاص طور پر کویت (ایک خلیجی ریاست جس میں فلسطینی آبادی کی خاصی آبادی ہے) اور عراق میں مقیم ہیں۔ اس نے ان کے مصائب میں اضافہ کیا، انتہائی ضروری فنڈنگ روک دی، اور اہم فلسطینی وسائل کو تباہ کر دیا، خلیجی ریاستوں کے ساتھ تعلقات مزید کشیدہ ہوئے، جو صدام کے ساتھ عرفات کی صف بندی کو ناقابل معافی غلطی کے طور پر دیکھتے تھے۔

4. تباہ شدہ سوویت یونین سے بڑے پیمانے پر یہودی تارکین وطن کی آمد، اس کے خاتمے کے دس سالوں کے اندر دس لاکھ سے زیادہ اسرائیل پہنچ گئے۔ ان میں سائنس اور فوج کے بہت سے ماہر پیشہ ور افراد بھی شامل تھے، جو اسرائیل کی صلاحیت کو بڑھا رہے تھے۔

5. آخر میں، اس نے ایک سنگین حقیقت کا مرحلہ طے کیا: فلسطینی کاز تیزی سے پسماندہ ہوتا گیا، جب کہ اسرائیلی اثر و رسوخ مضبوط اور غالب ہوتا گیا۔[1]

یاسر عرفات نے صدام حسین کے ساتھ صف بندی کرتے ہوئے خود کو ہارے ہوئے پہلو پر پایا، جس سے باہر نکلنے کی ان کی اشد ضرورت بڑھ گئی۔ دریں اثنا، امریکی فتح اور سوویت یونین کے انہدام نے امریکیوں اور اسرائیلیوں کو ایک نئی تجویز پر غور کرنے پر آمادہ کیا: ایک کمزور، محکوم فلسطینی اتھارٹی کی تشکیل جو فلسطینیوں کو درپیش مستقل مسائل کے آسان حل کے طور پر کام کر سکے۔

ان پیشرفتوں کے درمیان، عرفات نے ایک اور خطرناک رعایت دی، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ 1988 میں، اس نے ایک سیکولر ریاست کے طویل عرصے سے رکھے گئے ہدف کو ترک کر دیا نہ یہودی اور نہ ہی اسلامی اور دو ریاستی حل کو قبول کیا: یہودی ریاست کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست۔ یہ فلسطینی ریاست 1967 سے پہلے کی سرحدوں کی بنیاد پر مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں قائم کی جانی تھی۔ اس نے تاریخی

[1] فتح الشقاقی، ج1، ص339ف۔ محسن صالح، صفحہ 111-12

فلسطین کے حوالے سے پہلی بڑی رعایت کی نشاندہی کی اور صہیونی یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کی جانب ابتدائی قدم کی نمائندگی کی۔

بین الاقوامی طاقتوں نے ان سیکولر اصولوں کے ساتھ غداری کا انکشاف کیا جن کی وہ کبھی حمایت کرتے تھے، یہودی ریاست کی حمایت کرتے ہوئے سیکولر فلسطینی تحریک کو ترک کرتے ہوئے جس نے ایک واحد، سیکولر ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے سیکولر ریاست کی وکالت کرنے والوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے ساتھ ایک یہودی ریاست کے وجود کو قبول کریں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، اگر اسرائیل محض ایک سیکولر نوآبادیاتی منصوبہ ہوتا تو اس کا مقصد ایک سیکولر ریاست کا قیام ہوتا۔ تاہم، اسرائیل اندرونی طور پر ایک صلیبی نظریے سے جڑا ہوا ہے، جو مغرب سے الگ نہیں، اور اس کی تہذیب کے سنگ بنیادوں میں سے ایک ہے۔[1]

اس طرح صورتحال واضح ہو گئی: عرفات، وہ فلسطینی رہنما جو عسکری طور پر شکست خوردہ اور سیاسی طور پر دھوکہ کھا چکے تھے، جنہوں نے اپنے سابقہ اصولوں کو ترک کر کے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی طرف ایک بڑا اقدم اٹھایا تھا، اب وہ ٹروجن ہارس بننے کے لیے تیار تھا جو فلسطینی انتفاضہ کو دھوکہ دے گا۔

رابطے اور مذاکرات کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا، جس کے دوران اسرائیلیوں نے کئی اہم مقاصد کی تلاش کی: مکمل یقین دہانی کہ فلسطینی اتھارٹی ماتحت رہے گی، اسرائیل کے لیے کوئی خطرہ نہیں بنے گی، اور مزاحمتی تحریکوں کو دبانے کے لیے فلسطینیوں کا مؤثر طریقے سے انتظام کرے گی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اتھارٹی انتفادہ کو مذاکرات کی طرف لے جائے اور اس کی رفتار کو کم کرے۔ اس کے بدلے میں، عرفات کا مقصد زیادہ سے زیادہ حقیقی طاقت حاصل کرنا تھا، جو فلسطین یا وسیع تر عرب خطے کے اندر اپنے لیے ایک حقیقی سیاسی کردار تیار کرتا تھا۔ اس نے اسرائیل کو تسلیم کرنے اور تین چوتھائی سے زیادہ فلسطینی سرزمین پر اس کے

[1] 2006 میں، رچرڈ کوچ اور کرس اسمتھ نے دی سوسائیڈ آف دی ویسٹ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں وہ دلیل دیتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی بنیاد سات اہم ستونوں پر ہے، جن میں سے ایک عیسائیت ہے۔ کتاب ان بنیادی ستونوں کے بتدریج کٹاؤ کے بارے میں ایک انتباہ جاری کرتی ہے، جنہوں نے طویل عرصے سے مغربی ثقافت اور معاشرے کی حمایت کی ہے۔

وجود کے حق میں کیے گئے شرمندگی اور سمجھوتوں سے خود کو چھڑانے کے لیے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے لوگوں کی مزاحمت کو دباتے ہوئے اسرائیل کے سیکورٹی نافذ کرنے والے کے کردار سے بھی خود کو دور کرنا چاہتا تھا۔

یہ پیش رفت خفیہ اور عوامی ملاقاتوں کے ایک سلسلے کے ذریعے سامنے آئی، جس کا اختتام 1993 کے اوسلو معاہدے پر ہوا۔

طاقت کے توازن، اس میں شامل شخصیات کی نوعیت اور دونوں اطراف کے بیرونی حمایتیوں پر غور کیا جائے تو نتیجہ افسوسناک طور پر واضح ہوتا ہے: نتیجہ ایک فلسطینی اتھارٹی کی تشکیل تھا جس نے اسرائیل کے وجود کے حق کو تسلیم کیا، مزاحمت سے لڑ کر اس کی سلامتی کو برقرار رکھنے کا عہد کیا، اور 1967 سے پہلے قبضے میں لی گئی تمام اراضی کو ترک کر دیا، صرف فلسطینیوں کے ساتھ واپسی کا وعدہ کیا۔ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے تقریباً پانچ علاقوں سے مرحلہ وار، بتدریج انخلا[1]۔ یروشلم کی حیثیت، پناہ گزینوں کی واپسی، فلسطینی ریاست کی سرحدوں، پانی کے حقوق، اور 1967 میں مقبوضہ زمین پر یہودی بستیوں کی قسمت سمیت مستقبل کے مذاکرات کے لیے اہم معاملات کو موخر کر دیا گیا۔

مزید برآں، ان معاہدوں میں فلسطینی قیدیوں کے معاملے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا، جس کے نتیجے میں خود قیدیوں کے لیے اور الفتح کے اراکین کی جانب سے برقرار رکھی گئی اقدار کے لیے دیرپا نتائج برآمد ہوئے۔[2]

اس طرح، اسرائیل نے عرفات کو صرف محدود اختیار دیا، جس سے وہ انتظامی اور حفاظتی ذمہ داریاں سنبھال سکیں جس کی وجہ سے وہ فلسطینی معاشرے کو کنٹرول کر سکے اور اس کی مزاحمت کو دبا سکے۔ بدلے میں، عرفات کو مستقبل کے لیے مذاکرات جاری رکھنے کے صرف مبہم وعدے ملے۔ یہ فلسطینی کاز کی تاریخ

---

[1] مغربی کنارے کو ایریاز A، B اور C میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایریا C، جو سب سے بڑا حصہ (مغربی کنارے کا 60٪) بنتا ہے، مکمل اسرائیلی خود مختاری اور سیکیورٹی کنٹرول میں ہے۔ علاقہ B مشترکہ کنٹرول میں ہے، اسرائیل غالب اتھارٹی کو برقرار رکھتا ہے، جب کہ علاقہ A مکمل طور پر فلسطینی اتھارٹی کے زیر کنٹرول ہے۔

[2] مثال کے طور پر ظہیر جبرین ص 167 ایف

میں اب تک کی سب سے بڑی رعایت تھی، جسے ایک "فلسطینی رہنما" نے طاقتور انتفاضہ کو ناکام بنانے کے لیے حاصل کیا تھا۔

دریں اثنا، اسرائیل نے اپنی قبضے کی پالیسیوں کو برقرار رکھا، زمین پر اپنے قدم جمائے، بستیوں کو بڑھایا، اور یروشلم کی یہودیت کو آگے بڑھایا۔ ان میں سے کسی بھی اہم مسئلے پر کوئی حتمی حل نہیں پہنچا، اس لیے اسرائیل کی کوئی پابند ذمہ داری نہیں تھی۔ فلسطینی اتھارٹی اور اوسلو معاہدے نے مؤثر طریقے سے قبضے کے لیے قانونی تحفظ فراہم کیا، اسے ایک ناجائز اور غیر قانونی موجودگی سے بدل دیا جس سے اب دونوں فریقوں کے درمیان کسی بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔ دوسرے لفظوں میں، اسرائیل نے اس معاہدے کے ذریعے مؤثر طریقے سے ایک لاگت سے پاک قبضہ حاصل کیا۔

بالفور اعلامیہ کو اکثر "ایک وعدہ کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جس کے پاس کسی کا حق نہیں تھا جس کا کوئی دعویٰ نہیں تھا" اور یہ عرفات اور اوسلو معاہدے کے معاملے میں سچ ثابت ہوتا ہے۔ عرفات نے جو کچھ اس کے پاس نہیں تھا ان کو دے دیا جن کا اس پر کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ فلسطین کبھی بھی اس کا دینے والا نہیں تھا، نہ ہی اسلامی قانون کے ذریعے، جو اسے تمام مسلمانوں کے لیے وقف (وقف) کے طور پر نامزد کرتا ہے، اور نہ ہی سیکولر جمہوری اصولوں کے مطابق، کیونکہ عرفات فلسطینی عوام کے منتخب رہنما نہیں تھے۔ پی ایل او کے سربراہ کے طور پر ان کی پہچان سرکاری عرب حکومتوں سے ہوئی، جن میں سے کوئی بھی اسلامی وفاداری یا منصفانہ جمہوری انتخابات کے ذریعے اقتدار میں نہیں آیا۔ اس طرح، ناجائز حکومتوں نے ایک ناجائز تنظیم کو تسلیم کیا، جس نے پھر ایک ناجائز معاہدے پر دستخط کیے، اس مصیبت زدہ عرب خطے میں ایک اور ناجائز اتھارٹی قائم کی۔

یہ تنقید اصولوں سے بالاتر ہے، اوسلو معاہدے کے تباہ کن نتائج کی عکاسی کرتی ہے۔ اس معاہدے سے فلسطینی عوام یا ان کے مقصد کے لیے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوا۔ بنیادی مسائل جیسے کہ فلسطینی ریاست کا حجم اور خود مختاری، یروشلم کی حیثیت، پناہ گزینوں کی واپسی، بستیوں اور پانی کے حقوق سب کو موخر کر دیا گیا۔

دریں اثنا، تمام علاقوں پر اسرائیل کا سیکورٹی اور فوجی کنٹرول برقرار رہا، اسرائیل کو فلسطینی اتھارٹی کی طرف سے نافذ کردہ قانون سازی کو ویٹو کا حق دیا گیا، اور مغربی کنارے اور غزہ سے "مقبوضہ" کی اصطلاح ہٹا دی گئی۔

یہ پیش رفت فلسطینی اتھارٹی کی طرف سے ترتیب دیے گئے ایک گہرے خطرناک نتائج کا باعث بنی: فلسطینیوں کے درمیان ایک گہری اور تفرقہ انگیز تفرقہ۔ کچھ لوگوں نے مذاکرات، امن، معمول پر لانے اور بقائے باہمی پر مبنی راستے کی وکالت شروع کر دی، جو بھی رعایتیں حاصل کی جا سکتی ہیں اس کے لیے تصفیہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تاہم، دوسروں نے مضبوطی سے اسے کوئی حل نہ سمجھ کر مسترد کر دیا، اس کی بجائے اسے دھوکہ اور ایک نئے سرے سے خیانت کے طور پر دیکھا۔

یہ تقسیم محض نظریاتی اختلافات سے بہت آگے نکل گئی۔ عرفات اور فلسطینی اتھارٹی اہم مالی وسائل، منافع بخش عہدوں کے وعدے اور سماجی ترقی کے مواقع سے تقویت یافتہ ایک گروہ بن گئے۔ اس نے ناگزیر طور پر بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، خاص طور پر ایک ایسے معاشرے میں جو کئی دہائیوں کی مشکلات سے دوچار اور کمزور ہو چکا ہے، جہاں بے شمار لوگوں نے پناہ گزینوں کے کیمپوں میں سخت حالات زندگی کا سامنا کیا۔ عرفات اور ان کی اتھارٹی نے کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی جسے قبول یا مسترد کیا جا سکے، جیسا کہ کسی سیاسی جماعت سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے بجائے، انہوں نے ایک ایسے نظام کے بیج بوئے جس نے فعال طور پر فلسطینی معاشرے کی تشکیل نو کی، نظریاتی اور گروہی وابستگیوں کی بنیاد پر حمایت یا اخراج کو بڑھایا۔

نتیجتاً، مزاحمت، جہاد، اور انتفاضہ کے حامیوں نے خود کو مجرموں اور غیر قانونیوں کے طور پر پہچانا—اس بار نہ صرف صہیونی قبضے کے بلکہ "قومی" اتھارٹی کے قوانین کے تحت۔ مزاحمتی جنگجوؤں پر بوجھ تیزی سے بڑھتا گیا، جس نے انہیں دوسری عرب ریاستوں میں ان کے ہم منصبوں کی طرح خوفناک صورتحال میں ڈال دیا، نام نہاد قومی حکام کے جبر کو برداشت کیا۔

فلسطینی قومی اتھارٹی اسرائیلیوں کے ساتھ نمٹنے کے لیے ایک مرکزی نقطہ بن گئی، ایک کمزور اور مجبور ادارے کے طور پر تیار ہو گئی جو عملی طور پر ہر چیز کے لیے اسرائیل پر مکمل انحصار کرتی ہے۔ اسرائیلی فوجی چوکیوں کے ذریعے اس کے عہدیداروں کی نقل و حرکت سے لے کر مالیاتی منتقلی اور سامان اور لوگوں کے داخلے اور باہر نکلنے کے لیے روزانہ کوآرڈینیشن تک، اس کا انحصار نام نہاد "سیکیورٹی کوآرڈینیشن اور تعاون" پر منتج ہوا، جو سراسر تعاون کے مترادف تھا۔ اس متحرک نے اسرائیل کو اپنے اثر و رسوخ کو گہرا کرنے کا ایک انمول موقع فراہم کیا، جس نے اتھارٹی کے اندر متعدد عہدیداروں کو شریک کیا۔ یہ اہلکار اسرائیل کے اصل ماتحت بن گئے، اپنے مفادات کو عرفات یا خود اتھارٹی کے ساتھ وفاداری سے زیادہ وفاداری کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔

اس اتھارٹی کے دوسرے کمانڈر، اوسلو معاہدے کے معمار محمود عباس اپنے اراکین کے لیے ایک شاندار مثال کے طور پر کام کرتے ہیں، جو کہ اتھارٹی کے کردار کو ایک "شاندار ایجاد" کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اسرائیل کے مفادات کو پورا کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اپنے پورے کیریئر میں عباس نے مسئلہ فلسطین میں اسرائیل کے سب سے قیمتی اثاثوں میں سے ایک کے طور پر مسلسل کام کیا۔ وہ بالآخر عرفات کے خلاف ہو گیا، اور عرفات کے قتل کے بعد، اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے اقتدار پر فائز ہو گیا، عرفات کے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہونے سے بھی زیادہ تسلیم کر لیا گیا۔ عباس کی قیادت میں فلسطینی کاز اور اس کے عوام کو ایسی مشکلات اور آفات کا سامنا کرنا پڑا جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اگر وہ اس کی قیادت میں نہ ہوتے۔[1]

اس دھوکہ دہی کا دائرہ حفاظتی آلات کے رہنماؤں تک پہنچا، جو کچھ خطرناک ترین ساتھی بن گئے۔ مغربی کنارے میں پریوینٹیو سیکیورٹی فورس کے سربراہ جبریل رجب اور ان کے ہم منصب محمد دحلان، غزہ میں پریوینٹیو سیکیورٹی کے سربراہ نے اپنے نائبین کے ساتھ اسرائیل کو انٹیلی جنس اور سیکیورٹی امداد فراہم کی جو اس سے کہیں زیادہ تھی جو اسرائیل اپنی کوششوں سے حاصل کر سکتا تھا۔ ان ایجنسیوں کے زیر انتظام حراستی

[1] مثال کے طور پر عباس پر دیکھیں: ہلیری کلنٹن، ہارڈ چوائسز: ہلیری روڈھم کلنٹن کی ایک یادداشت، صفحہ 308 [عربی ایڈیشن۔]

مراکز میں متعدد مزاحمتی جنگجوؤں کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان وحشیانہ طریقوں کے ذریعے، نازک انٹیلی جنس حاصل کی گئی، بہت سے آزادی پسندوں کو بے نقاب کیا، لاتعداد مزاحمت اور شہادت کی کارروائیوں کو ناکام بنایا، اور بے شمار جانوں، وسائل اور محنتی تیاریوں کو ضائع کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ کمزور اور مجبور اتھارٹی، جس کے صدر اور وزراء کو چوکیوں سے گزرنے کے لیے اسرائیل کے جاری کردہ اجازت نامے کی ضرورت تھی، نے سیکیورٹی ایجنسیوں کے بہت زیادہ پھیلاؤ کا مشاہدہ کیا: داخلہ سیکیورٹی، جنرل سیکیورٹی، پولیس، انٹیلی جنس، پریوینٹیو سیکیورٹی، اور صدارتی انٹیلی جنس، اور دیگر[1]۔ ان ایجنسیوں کی صحیح تعداد محققین کے درمیان بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے، جو اتھارٹی کی نوعیت اور مقاصد کو اجاگر کرتی ہے۔ صرف پولیس فورس میں 40,000 افسران تھے، جو عالمی سطح پر پولیس سے آبادی کا سب سے زیادہ تناسب ہے۔ مزید برآں، اتھارٹی کے کل بجٹ کا حیرت انگیز طور پر 70 فیصد سیکورٹی ایجنسیوں اور عرفات کے دفتر کے لیے مختص کیا گیا۔[2]

بدعنوانی، اخلاقی انحطاط، تعاون اور ان گنت آفات کے باوجود اس اتھارٹی نے فلسطینی معاشرے کو پہلے ہی غربت، بدحالی اور جبر سے دوچار کر رکھا تھا،[3] عرفات نے ایک اور طریقہ سے اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کا جوا کھیلا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس کا بنیادی کردار، اپنے اختیار کو مضبوط کرنے کے لیے، فلسطینی مزاحمت کو دبانا تھا۔ غزہ پہنچنے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں عرفات نے ڈھٹائی سے کہا کہ نیلسن منڈیلا نے زولو قبائل پر گولی چلانے سے گریز کیا، وہ (عرفات) حماس کا حوالہ دیتے ہوئے گولی ماریں گے۔[4]

اگرچہ عرفات بڑے پیمانے پر عوامی احتجاج اور شہری مزاحمت کو روکنے میں کامیاب رہے، لیکن وہ مسلح مزاحمت کو مکمل طور پر ختم کرنے میں ناکام رہے، جو انتفاضہ کے دوران اور اس کے بعد نمایاں طور پر آگے

---

[1] کونڈولیزا رائس نے بتایا کہ ان ایجنسیوں کی تعداد کم از کم 12 سیکیورٹی تنظیمیں تھیں۔ دیکھیں کونڈولیزا رائس: نوہائر آنر: اے میموئر آف مائی ایرز ان واشنگٹن، صفحہ 167 [عربی ایڈیشن۔

[2] محسن صالح، ص 117۔

Ibid., pp.117-18[3]

[4] ابراہیم گوشہ، صفحہ 214

بڑھ چکی تھی۔ پتھراؤ کا آغاز اسرائیلی فوجیوں کو نشانہ بناتے ہوئے چھرا گھونپنے والے حملوں میں ہوا، جس سے وہ گنجان آباد علاقوں سے دستبردار ہو گئے اور بھاری قلعہ بند فوجی اڈوں پر منتقل ہو گئے، جن کے چاروں طرف چوکیاں ہیں اور یہودی بستیوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے مضبوط کیا گیا۔

پستول اور رائفلز جیسے آتشیں اسلحے کے ظہور نے مزاحمت میں ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا، اس کے ساتھ ہتھیاروں کی سمگلنگ اور حصول کی کوششیں بھی تیز ہوئیں۔ فلسطینی انجینئروں نے دستیاب مقامی وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھماکہ خیز مواد تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس چالاکی نے مزاحمت کو گھات لگانے، فوجی گاڑیوں میں دھماکہ کرنے اور اہم اہلکاروں کو نشانہ بنانے کے قابل بنایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، انہوں نے ایک گیم بدلنے والا اور انتہائی اثر انگیز حربہ تیار کیا: شہادت کے آپریشن۔ ان مشنز میں دھماکہ خیز بیلٹ پہنے ہوئے جنگجو شامل تھے جو جان بوجھ کر گنجان آبادی والے اسرائیلی علاقوں میں گھس کر خود کو دھماکے سے اڑا دیتے تھے۔ اس طرح کی کارروائیوں نے فلسطینی مزاحمت کو قتل عام اور حملوں کے خلاف جوابی کارروائی کی اجازت دی[1]، جس کی مثال ہیبرون (الخلیل) میں ابراہیمی مسجد کے قتل عام پر ان کے رد عمل سے ملتی ہے، جس میں پانچ آپریشن شامل تھے جن کے نتیجے میں تقریباً 40 اسرائیلی ہلاک اور تقریباً 160 زخمی ہوئے۔[2]

اس اہم تبدیلی کے پیچھے ماسٹر مائنڈ یحیٰی عیاش نام کا ایک نوجوان، غیر واضح انجینئر تھا، جو "انجینئر" کے نام سے مشہور تھا۔ عیاش نے ان ہتھیاروں کی تیاری اور تیاری میں غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بھیس بدلنے، نقل و حرکت اور خود کی حفاظت میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی مہارت نے اسے پتہ لگانے سے بچنے کے قابل بنایا، یہاں تک کہ مغربی کنارے اور غزہ کے درمیان سفر بھی کیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ عیاش فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیلیوں کے درمیان سیکورٹی تعاون کا نشانہ بنے۔ جنوری 1996 میں،

---

[1] 25 فروری 1994 کی صبح، جو کہ رمضان المبارک 1414 ہجری کے وسط کے مطابق تھی، ایک یہودی شخص نے شہر ہیبرون کی ابراہیمی مسجد پر دھاوا بول دیا اور نمازیوں پر فائرنگ کر دی، جس سے تیس افراد ہلاک اور 150 زخمی ہو گئے۔

[2] دیکھیں ظاہر جبرین ص 103ff۔

اسے اس وقت قتل کر دیا گیا جب اس کا سیل فون —جو اسرائیلیوں کے لیے کام کرنے والے ایک فلسطینی مخبر نے فراہم کیا تھا— کو دھماکا خیز مواد سے بھرا ہوا تھا اور اسے دور سے اڑا دیا گیا تھا۔

مزاحمت نے انجینئر عیاش کے قتل کے جواب میں کئی طاقتور شہادتوں کی کارروائیوں کے ذریعے ایک خطرناک حد تک بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے 13 مارچ 1996 کو مصر کے شہر شرم الشیخ میں "دہشت گردی" کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی۔ کانفرنس کا مقصد فلسطینی مزاحمت کو دبانے میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا تھا، جس میں عرب حکومتوں کی فلسطینیوں کے خلاف سازشوں اور ان کے کردار کو تحفظ فراہم کرنے کی واضح مثالوں میں سے ایک کو اجاگر کرنا تھا۔ کانفرنس کے دوران، عرفات کو واضح طور پر کہا گیا، "امن عمل اس وقت تک ختم ہو جائے گا جب تک کہ آپ سیکیورٹی کے معاملے پر ایکشن نہیں لیتے۔ آپ اس میں جوڑ توڑ نہیں کر سکتے، یہ حقیقی ہونا چاہیے۔"[1]

شرم الشیخ سے واپسی پر عرفات فلسطینی مزاحمت کو کچلنے کی کوششوں میں زیادہ پرعزم اور بے رحم ہو گئے۔ اسرائیلی حمایت، امریکی ہتھکنڈوں اور سرکاری عرب حمایت سے لیس، اس نے ایک وحشیانہ حفاظتی مہم شروع کی جس نے مزاحمت کو بری طرح متاثر کیا،[2] جسکے نتیجے میں اہم شخصیات جیسے کہ محی الدین الشریف (دوسرے انجینئر) کی موت واقع ہوئی، جنہیں 29 مارچ 1998 کو فلسطینی حفاظتی حفاظتی دستوں کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ الدین القسام بریگیڈز عدیل کو گرفتار کیا گیا، تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اور اس کا قتل 10 ستمبر 1998 کو اسرائیلی افواج کے ساتھ مل کر کیا گیا۔ اس مہم کے نتیجے میں ہزاروں افراد کو حراست میں لیا گیا، جن میں سے بہت سے لوگوں کو شدید اذیتیں دی گئیں، جن میں ہڈیاں ٹوٹی ہوئی اور داڑھیاں کٹی ہوئی تھیں، اور کچھ شہید بھی ہوئے۔[3]

---

[1] جارج ٹینٹ، صفحہ 80۔

[2] Ibid., p.78 ff.

[3] ابراہیم گوشہ ص 228۔

بین الاقوامی سطح پر، اسرائیل نے 26 اکتوبر 1995 کو فتحی شقاقی کو قتل کیا، 25 ستمبر 1997 کو اردن میں حماس کے سیاسی بیورو کے سربراہ خالد مشعل کو قتل کرنے کی کوشش کی، اور اگست 1997 میں اردن میں حماس کا دفتر بند کر دیا گیا۔ حماس کے رہنماؤں کو دو ماہ قبل قید کی سزا سنائی گئی۔

فلسطینی اتھارٹی نے جبر، تشدد اور نگرانی میں اپنی صلاحیتوں کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ یہ اکتوبر 1994 میں اس کے قیام کے صرف تین ماہ بعد واضح ہوا، جب ایک اسرائیلی فوجی کو پکڑنے کے لیے کیے گئے آپریشن کے نتیجے میں ایک اسرائیلی حملہ ہوا جس میں فوجی اور اس کے اغواکار دونوں ہلاک ہو گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کی فورسز نے ایک مسجد سے نکلنے والے مظاہرے پر بھی فائرنگ کی جس کے نتیجے میں 18 مظاہرین ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں، مشتعل ہجوم نے غزہ میں اتھارٹی کے سیکورٹی ہیڈ کوارٹر کو گھیر لیا، تقریباً اس کے اہلکاروں پر قابو پالیا۔

صرف غزہ میں، اتھارٹی نے 24 حراستی اور تفتیشی مراکز قائم کیے ہیں۔ 1995 کے وسط تک، اس نے صرف ایک ماہ میں 57 مساجد پر 138 بار چھاپے مارے۔ 1997 کے اوائل تک، اتھارٹی 1,600 فلسطینیوں کو حراست میں لے رہی تھی، جن میں سے نصف کو بغیر کسی الزام یا مقدمے کے حراست میں رکھا گیا تھا۔[1] ایک ہی خاندان کے دو افراد کا "حماس سے تعلق" کے ایک ہی الزام میں قید ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، جس میں سے ایک کو اسرائیلی فورسز اور دوسرے کو فلسطینی اتھارٹی نے حراست میں لیا تھا[2]۔ دریں اثنا، حماس کے قیدیوں اور ان کے اہل خانہ کو اتھارٹی کے قیدیوں کے وزیر کی طرف سے اکثر نظر انداز اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔[3]

ان کوششوں نے 1996 اور 2000 کے درمیان فلسطینی مزاحمتی سرگرمیوں میں نمایاں کمی کا باعث بنا۔ اس نتیجے کو امریکی انٹیلی جنس کے سربراہ نے کھلے عام منایا، جس نے عرفات اور اتھارٹی کی سیکیورٹی فورسز کی

[1] محسن صالح، ص118

[2] عبداللہ البرغوثی، امیر الظل (سائے کا شہزادہ)، صفحہ 44

[3] دیکھیے، مثال کے طور پر، حسن سلامہ، خمسة الف یوم فی البرزخ (برزخ کے دائرے میں پانچ ہزار دن)، صفحہ 55۔

حمایت میں ان کی ایجنسی کے کردار کو تسلیم کیا۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ اسرائیلی اور فلسطینی سیکورٹی فورسز کے درمیان مشترکہ آپریشن سینٹرز کے قیام پر ہوا، جو فلسطینیوں کو کوئی بامعنی سیاسی فائدہ حاصل کرنے سے پہلے ہی قائم کیا گیا تھا۔[1]

اس کے ساتھ ہی اردن نے حماس کے خلاف کریک ڈاؤن تیز کر دیا۔ عمان میں حماس کے سیاسی دفتر پر چھاپہ مارا گیا، جس کے نتیجے میں ساٹھ نوجوان ارکان کو گرفتار اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا، تحریک کے فنڈز ضبط کیے گئے اور کئی سرکردہ رہنماؤں اور عہدیداروں کو بیرون ملک جبری جلاوطن کر دیا گیا۔[2]

مزاحمت کو کمزور کرنے میں عرفات کی خاطر خواہ کامیابی کے باوجود، یہ کوششیں انہیں سیاسی عمل میں کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچانے میں ناکام رہیں۔ اس رفتار کو اسرائیلیوں کے ہاتھوں ایک بڑا دھچکا لگا، جو خود دو الگ الگ دھڑوں میں بٹ گئے۔

پہلا دھڑا، جس کی نمائندگی یتزاک رابن، شمعون پیریز، اور بعد میں لیبر پارٹی کے تحت حکومت کے رہنما ایہود بارک جیسی شخصیات نے کی جنہوں نے کھلے عام امن معاہدوں اور مذاکرات کی وکالت کی۔ ان کا خیال تھا کہ غیر مسلح، وسائل سے محروم فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ مشغولیت، جو کہ اسرائیل کے حق میں ایک غیر متناسب طاقت کے ساتھ متحرک ہے، بالآخر اسرائیل کی سلامتی کو تقویت دے گی اور اس کی پوزیشن کو مضبوط کرے گی۔ انہوں نے دلیل دی کہ یہ نقطہ نظر اسرائیل کو بے شمار سیاسی، مالی، سیکورٹی اور انتظامی بوجھ سے کم کر دے گا،[3] جس سے وہ اپنی توجہ دوسری حکومتوں کی طرف موڑ سکے گا جنہوں نے ابھی تک عراق، شام اور ایران جیسے امن عمل کی تعمیل یا ان میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔

[1] ابراہیم غوشہ، صفحہ 224، 228 ایف

[2] ابراہیم غوشہ، صفحہ 224، 228 ایف

[3] امن کے عمل، مذاکرات اور فلسطینی اتھارٹی کے قیام سے اسرائیل نے استحکام اور خوشحالی حاصل کی۔ 1983 اور 2000 کے درمیان، اس کی جی ڈی پی میں سات گنا اضافہ ہوا، اور گرانٹس اور امداد، جو پہلے اس کے بجٹ کا ایک چوتھائی تھی، گر کر صرف 3 فیصد رہ گئی۔ اسرائیلیوں کی فی کس آمدنی 18,000$ سے تجاوز کر گئی، جس سے یہ 2000 میں عالمی سطح پر آمدنی کی بلند ترین سطحوں میں سے ایک ہے۔ دیکھیں محسن صالح، صفحہ۔ 119.

مزید برآں، دو ریاستی حل کو اعلی زرخیزی کی شرح اور فلسطینیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے لاحق آبادی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے ایک اسٹریٹجک اقدام کے طور پر دیکھا گیا۔ ایک واحد ریاستی منظر نامے میں، آبادیاتی حقائق لامحالہ طاقت کے توازن کو فلسطینیوں کے حق میں بدل دیں گے، خواہ مستقبل قریب میں ہو یا بعید۔[1]

دوسرے دھڑے میں بنجمن نیتن یاہو اور ایریل شیرون جیسی شخصیات شامل تھیں،[2] جنہوں نے لیکوڈ پارٹی یا اس سے وابستہ تنظیموں کے تحت حکومت کی قیادت کی۔ اس گروپ نے کسی بھی شکل میں فلسطینی ریاست کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے فلسطینی اتھارٹی کے وجود کو امن کی طرف ایک قدم کے طور پر نہیں بلکہ ایک ممکنہ خطرے کے طور پر دیکھا، اور ایک ایسی چال ہے جو فلسطینیوں کو خود کو مسلح کرنے، جنگجوؤں کو تربیت دینے اور بیرونی فنڈنگ حاصل کرنے کے قابل بنا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی خبردار کیا کہ عراق، شام اور ایران جیسی حکومتیں اسرائیل کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لیے اتھارٹی کا استحصال کر سکتی ہیں۔ اس دھڑے کے لیے، فلسطینی ریاست کا تصور دریائے نیل سے فرات تک پھیلی ہوئی ریاست کے صیہونی-یہودی وژن کے خلاف اور غداری کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نظریے کی رہنمائی میں، Yitzhak Rabin کو 1995 میں قتل کر دیا گیا، اور Likud نے 1996 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ فتح نے تین سال تک امن مذاکرات کو روک دیا، جس کے دوران یروشلم کے ارد گرد تصفیہ کی توسیع میں اضافہ ہوا، جس نے

[1] ہلیری کلنٹن، صفحہ 307-08

[2] نیتن یاہو کو بانی نسل سے لے کر اب تک کا سب سے نمایاں اسرائیلی سیاستدان سمجھا جاتا ہے۔ ان کے پاس اسرائیل کے سب سے طویل عرصے تک خدمات انجام دینے والے وزیر اعظم کے طور پر ریکارڈ ہے، جس میں کل 17 سال کا عہدہ ہے، جس میں 11 سال کا بلاتعطل دور بھی شامل ہے۔ 1996 میں، صرف 47 سال کی عمر میں، وہ وزیر اعظم کا کردار سنبھالنے والے سب سے کم عمر شخص بن گئے۔ اس سے پہلے، وہ 39 سال کی عمر میں نائب وزیر خارجہ اور صرف 35 سال کی عمر میں اقوام متحدہ میں اسرائیل کے سفیر کے طور پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے والد ایک ممتاز صیہونی مورخ اور زیف جبوتنسکی کے قریبی ساتھی تھے، جو اسرائیل کی انتہائی نظریاتی شخصیتوں میں سے ایک اور اس کی مشہور شخصیت کے معمار تھے۔ دوسری جانب شیرون کو بانی نسل کے بعد اسرائیلی تاریخ کا سب سے ممتاز فوجی رہنما سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اسرائیل کی تمام جنگوں میں حصہ لیا، اس کے سب سے بے رحم اور موثر جنگجوؤں میں سے ایک کے طور پر شہرت حاصل کی۔ بہت سے اسرائیلیوں کے لیے، وہ ایک قومی ہیرو کے طور پر سراہا جاتا ہے، جو اس کی فیصلہ کن فوجی شراکت کے لیے منایا جاتا ہے۔ اگرچہ شیرون نیتن یاہو سے بڑے اور تجربہ کار تھے، لیکن دونوں نے ایک ہی سخت گیر دھڑے سے وفاداری کا اشتراک کیا، اس کے غیر سمجھوتہ کرنے والے نظریے کو مجسم بنایا۔

زمینی حقائق کو ڈرامائی طور پر نئی شکل دی۔ 1999 میں، لیبر پارٹی نے ایہود بارک کے ساتھ دوبارہ اقتدار حاصل کیا، جس سے مذاکرات کے لیے کچھ امیدیں بحال ہوئیں۔

تاہم، تین سال کے وقفے نے اوسلو معاہدے کی نزاکت کو ظاہر کیا، جس نے انہیں خالی وعدوں کے طور پر بے نقاب کیا۔ اسرائیلی سیاست دان مسلسل اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے میں ناکام رہے، اور فلسطینی اتھارٹی کے پاس اسرائیل کو جوابدہ ٹھہرانے کے لیے درکار ضمانتوں یا فائدہ اٹھانے کا فقدان تھا۔ اس عرصے کے دوران، اتھارٹی نے اپنی کوششوں کو عوامی بغاوت کو دبانے پر مرکوز رکھا، اور صرف بنیادی اسلامی مزاحمتی تحریکوں کو فعال چھوڑ کر عوامی مزاحمت کو مؤثر طریقے سے بجھا دیا۔ یہ تحریکیں بھی بغاوت کے زوال، عوامی حمایت میں کمی اور اتھارٹی کی سیکورٹی فورسز کی جانب سے مسلسل ظلم و ستم کے باعث کمزور پڑ گئیں۔

یہ سال فلسطینی اتھارٹی کی تباہ کن ناکامی کے واضح ثبوت کے طور پر کھڑے ہیں اگر صریحاً تعاون نہیں ہے۔ بغاوت کو ختم کرنے کے لیے اوسلو کے عمل کو استعمال کرنے کے بعد، اسرائیل نے بالآخر اس معاہدے کو ترک کر دیا جب اس نے مزاحمت کو بے اثر کرنے کا اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

بارک کا دور، جو بل کلنٹن کی ریاستہائے متحدہ میں صدارت کے ساتھ اوورلیپ ہوا، امن کے عمل اور اس کے معاہدوں کی رفتار میں ایک اہم اور افشا کرنے والا باب ہے۔ باراک، جسے بڑے پیمانے پر سب سے زیادہ مفاہمت کرنے والے اسرائیلی سیاست دانوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے،[1] کلنٹن، تنازع کے حل کے لیے سب سے زیادہ وقف امریکی صدر، اور یاسر عرفات، جنہوں نے اسرائیل کے وجود کے حق کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا تھا اور مزاحمت کو فعال طور پر دبایا تھا، جولائی 2000 میں اس بات کے لیے بلایا گیا تھا کہ مذاکرات کا ایک اور دور ناکام ہو جائے گا۔

[1] " سب سے زیادہ مفاہمت کرنے والے " کے طور پر باراک کی شہرت صرف دوسرے اسرائیلی رہنماؤں کی نسبت ہے۔ درحقیقت، وہ مذاکرات میں داخل ہونے سے پہلے اعلان کردہ پانچ پُرعزم "نہیں" کے معمار تھے: یروشلم کو تقسیم کرنے کے لیے نہیں، 1967 کی سرحدوں پر واپس جانے کے لیے نہیں، مہاجرین کی واپسی کے لیے نہیں، مغربی کنارے اور غزہ میں آباد بستیوں کو ختم کرنے کے لیے نہیں، اور مغربی کنارے میں عرب افواج کی موجودگی کے لیے نہیں۔

اسرائیل فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی کی اجازت دینے، یروشلم پر عربوں کی خود مختاری دینے یا 1967 کی سرحدوں پر واپس جانے سے انکار پر ثابت قدم رہا۔ عرفات نے ان نکات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں، مبینہ طور پر کہا کہ مجوزہ معاہدے کو قبول کرنا ان کے قتل کا باعث بنے گا۔[1] چہرے کو بچانے والی تجاویز کے ذریعے اپنی پوزیشن بچانے کی ان کی کوششیں، جیسے کہ الاقصیٰ پر خود مختاری کو اسلامی تعاون کی تنظیم، ایک بڑی علامتی اور غیر موثر تنظیم کو منتقل کرنا، یا اسرائیلی بستیوں سے متصل زمینی علاقے کو محفوظ بنانا، بھی ناکام رہا۔ مذاکرات ناکام ہو گئے۔

اس دور نے ایک سنجیدہ سچائی کا پردہ فاش کیا: حتیٰ کہ سب سے زیادہ ہم آہنگ اسرائیلی رہنما بھی ایک قابل عمل فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے بنیادی شرائط کو تسلیم نہیں کرے گا، اور حتیٰ کہ سب سے زیادہ محنت کرنے والا فلسطینی رہنما بھی اپنے عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی اہم نتیجہ حاصل نہیں کر سکا۔

ان تمام ادوار کے دوران جب تصفیہ کے مذاکرات کا بینر بلند ہوا، مسجد اقصیٰ پر حملے بلا روک ٹوک جاری رہے۔ باراک کے دور میں، ستمبر 1996 میں، اسرائیلیوں نے مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کے نیچے ایک سرنگ کھولی۔ اس اشتعال انگیز کارروائی سے شدید جھڑپیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں ساٹھ سے زائد فلسطینی شہید اور 160 سے زائد زخمی ہو گئے۔

الاقصیٰ انتفاضہ

یہ ناقابل تردید طور پر واضح ہو گیا کہ عرفات جیسا فلسطینی رہنما جتنا زیادہ سمجھوتہ کر سکتا ہے وہ اسرائیلی رہنما کے کم سے کم مطالبات کو پورا کرنے سے بہت دور تھا۔ ایک بار پھر مذاکرات ناکام ہو گئے۔

اس دوران ریٹائرڈ اسرائیلی جنرل ایریل شیرون جو کہ اسرائیل کی سب سے بااثر اور غیر سمجھوتہ کرنے والی فوجی اور سیاسی شخصیات میں سے ایک تھے، نے حزب اختلاف کی لیکود پارٹی کی قیادت سنبھال لی تھی۔ 28

[1] کونڈولیزا رائس، صفحہ 77

ستمبر 2000 کو، شیرون نے مسجد اقصیٰ کا ایک انتہائی اشتعال انگیز دورہ کیا، جس نے وسیع پیمانے پر احتجاج کو بھڑکا دیا جس نے دوسری فلسطینی بغاوت کا آغاز کیا، جسے بعد میں الاقصیٰ انتفاضہ کے نام سے جانا گیا۔

ابتدائی طور پر، مظاہرے اور پتھراؤ فلسطینی عوام کے لیے دستیاب مزاحمت کی بنیادی شکل بن گئے۔ اسرائیل کے جبر کی زبردست مشینری کا سامنا کرنے کے باوجود، فلسطینی عوام نے غیر معمولی جرات اور خود قربانی کا مظاہرہ کیا۔ اسرائیلی فورسز نے جواب میں وحشیانہ اقدامات کیے، جن میں قتل، حملے اور بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شامل ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں، ہلاکتوں کی تعداد ایک سو، پھر ایک ہزار سے تجاوز کر گئی، ہلاکتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

جیسے جیسے بغاوت شروع ہوئی، فلسطینی مزاحمتی دھڑوں نے اپنی کارروائیاں تیز کرنا شروع کر دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، بڑے پیمانے پر مظاہرے اور سڑکوں پر ہونے والی جھڑپیں کم ہوتی گئیں، جس سے مزید اسٹریٹجک اور جدید مزاحمتی کارروائیوں کو راستہ ملتا ہے۔ ان میں شہادت کی کارروائیاں سب سے طاقتور اور تباہ کن ہتھیار بن کر ابھری جو فلسطینی مزاحمت کاروں نے استعمال کی، جس نے غاصب اسرائیلی طاقت کے خلاف ان کی جدوجہد میں نمایاں اثر چھوڑا۔

انتفادہ کے شروع ہونے کے چند ماہ بعد ہی اسرائیلی حکومت میں تبدیلی کی وجہ سے صورتحال قابو سے باہر ہوگئی۔ ایریل شیرون نے عہدہ سنبھالنے کے 100 دنوں کے اندر بغاوت ختم کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے نئی حکومت کی قیادت سنبھالی۔ مختلف علاقوں میں سفاکانہ فوجی اور سیکورٹی مہمات شروع کرنے کے باوجود، وہ اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے بجائے، تنازعہ ایک شدید اور غیر مساوی جدوجہد میں بڑھ گیا، جس نے ایک غیر مسلح لیکن لچکدار فلسطینی آبادی کو اسرائیل کی طاقتور فوجی مشین کے خلاف کھڑا کر دیا۔ شیرون نے منظم طریقے سے عسکریت پسند مزاحمتی دھڑوں کے رہنماؤں کو نشانہ بنانے کی حکمت عملی کو نافذ کیا اور بعد میں ان قتلوں کو بڑھا کر سیاسی شخصیات کو بھی شامل کیا۔

ابتدائی طور پر، یاسر عرفات نے اپنے آپ کو بغاوت سے دور کرنے کی کوشش کی، اور مزاحمتی جنگجوؤں کا تعاقب کرنے اور ان کو دبانے کے لیے اپنی سیکیورٹی فورسز کی کوششوں کو ٹھیک طریقے سے روک دیا۔ انہوں نے اسے زیادہ سازگار شرائط کے تحت مذاکرات کی میز پر واپس آنے کے لیے اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک حکمت عملی کے طور پر دیکھا۔ تاہم، اس کی حکمت عملی واپس آگئی۔ شیرون کے اقتدار پر چڑھنے نے مذاکرات کو یکسر مسترد کرنے اور علاقوں پر مکمل اسرائیلی کنٹرول کی طرف جارحانہ دباؤ کی طرف اشارہ کیا۔

صورتحال اس وقت مزید بگڑ گئی جب امریکی صدر بل کلنٹن، جو ایک ڈیموکریٹ، نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا، اور ریپبلکن [1] جارج ڈبلیو بش [2] نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ بش کی انتظامیہ نے شیرون کی سخت گیر پوزیشن کو تقویت دی جبکہ عرفات کے موقف کو مزید کمزور کیا۔ اگلے سال، 11 ستمبر 2001 کو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک تباہ کن گھریلو حملے کا سامنا کرنا پڑا جس نے دنیا کو چونکا دیا، امریکی فخر کو گہرا زخم دیا، اور نام نہاد "دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ" کا آغاز کیا۔

اس کے جواب میں، امریکی فوج نے اکتوبر 2001 میں افغانستان اور مارچ 2003 میں عراق پر حملہ کیا، جس سے اسلامی سرگرمی کے خلاف کریک ڈاؤن کی ایک عالمی لہر شروع ہوئی۔ ابتدائی طور پر جہادی گروپوں کو نشانہ بناتے ہوئے، اس مہم میں خیراتی، انسانی ہمدردی اور یہاں تک کہ سیاسی اسلامی تنظیموں کو بھی شامل کیا گیا۔ شیرون نے اس تبدیلی کو فائدہ پہنچاتے ہوئے، فلسطین میں اسلامی دہشت گردی کے خلاف وسیع تر جنگ کے ایک حصے کے طور پر اپنے اقدامات کو مرتب کیا اور یاسر عرفات کو دہشت گردی کی اس مبینہ مہم میں ایک مرکزی شخصیت کے طور پر پیش کیا۔

---

[1] ڈیموکریٹس سفارت کاری اور نرم طاقت پر زیادہ انحصار کرتے ہیں، جب کہ ریپبلکن عام طور پر زیادہ کھرچنے والے ہوتے ہیں، اور پرسکون، مضحکہ خیز بیان بازی کا استعمال کرنے کی طرف کم مائل ہوتے ہیں۔

[2] جارج ڈبلیو بش کو ان کی والدہ نے "امریکہ کا پہلا یہودی صدر" کے طور پر بیان کیا کیونکہ ان کے یہودیوں کے تئیں سخت تعصب تھا (دیکھیں کونڈولیزا رائس، صفحہ 177) اسرائیل اور مسئلہ فلسطین کے حوالے سے دونوں بڑی جماعتوں کی پالیسیوں میں بہت کم فرق ہے۔

مذاکرات کی ناکامی اور انتفاضہ کے پھوٹنے سے بلاشبہ فلسطینی اتھارٹی (PA) کے اداروں میں اہم تناؤ پیدا ہوا۔ اگرچہ PA کے اندر ایک اقلیت نے مزاحمت کی حمایت کرنے کی کوشش کی یا کم از کم اس کی طرف آنکھیں بند کر لیں، اکثریت اس راستے اور مقصد پر قائم رہی جس کے لیے اتھارٹی کا قیام اور ڈیزائن کیا گیا تھا۔

ان اداروں کے اندر بہت سے رہنماؤں نے، خاص طور پر سیکورٹی کے آلات میں، اسرائیلی حکام کے ساتھ براہ راست رابطہ برقرار رکھا۔ کچھ لوگ عرفات کی جگہ لینے کے مغربی منصوبوں کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے خود کو فلسطین کا اگلا صدر بنانا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر، PA خاص طور پر اس کی سیکیورٹی ایجنسیوں نے مزاحمتی جنگجوؤں کو ٹریک کرنے، گرفتار کرنے اور ان سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے منظم طریقے سے کام کیا، اکثر ان کے نیٹ ورکس اور سیلز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تشدد کا سہارا لیتے ہیں۔ بہت سے مزاحمتی ارکان تشدد کے نتیجے میں ہلاک ہوئے، اور اہم انٹیلی جنس اسرائیلی افواج کو منتقل کر دی گئی، جس سے مزاحمت کے اندر متعدد سیاسی اور فوجی رہنماؤں کو نشانہ بنایا گیا۔

بعض صورتوں میں، ان سیکورٹی ایجنسیوں نے مزاحمتی ارکان کو صرف اس لیے گرفتار کیا کہ انہیں اسرائیل کے حوالے کیا جائے، یا انھوں نے اپنا ہیڈکوارٹر خالی کر دیا، جس سے اسرائیلی فورسز کو حراست میں لیے گئے افراد کو حراست میں لینے کی اجازت دی گئی۔ انہوں نے اسرائیل کے خلاف اہم مزاحمتی کارروائیوں کو بھی ناکام بنایا اور مزاحمت کے اہم اجزاء اور بنیادی ڈھانچے کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور اسے کئی علاقوں میں شروع سے دوبارہ تعمیر کرنے پر مجبور کیا۔

PA اور اس کے حفاظتی آلات کے اقدامات فلسطینی عوام کے لیے ایک گہری اور بے مثال آفت بن گئے، جس نے ان کی آزادی اور خود ارادیت کی جدوجہد پر بہت زیادہ بوجھ ڈالا۔

عرفات نے مزاحمت کی طرف آنکھیں بند کرنے کی اپنی ابتدائی حکمت عملی کو تیزی سے ترک کر دیا، جس سے وہ مذاکرات میں بہتر شرائط کو محفوظ بنانے کے لیے فائدہ اٹھانے کی امید کر رہے تھے۔ اس کے بجائے،

اس نے خود کو ذاتی طور پر، سیاسی طور پر، اور اپنی قیادت کے لحاظ سے بڑھتا ہوا خطرہ پایا۔ اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے، عرفات نے امن عمل کے لیے اپنی وابستگی کو دوگنا کر دیا، مزاحمتی کارروائیوں کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی۔ یہاں تک کہ اس نے اسرائیل کے خلاف سینکڑوں حملوں کو ناکام بنانے، مزاحمتی رہنماؤں اور کارندوں کو گرفتار کرنے اور اسرائیلی حکام کو اہم انٹیلی جنس فراہم کرنے میں اپنے حفاظتی آلات کی کامیابی پر فخر کیا۔

ان کوششوں کے باوجود عرفات کی کوششیں اس کی حفاظت میں ناکام رہیں۔ شیرون نے رام اللہ میں عرفات کے صدارتی کمپاؤنڈ پر ایک دم گھٹنے والا محاصرہ نافذ کیا، اسرائیلی فورسز نے شہر پر دھاوا بول دیا اور اس کے ہیڈکوارٹر کو جزوی طور پر منہدم کر دیا۔ یہ واضح ہو گیا کہ عرفات کو اب ایک قابل عمل پارٹنر کے طور پر نہیں دیکھا جا رہا تھا،[1] اور ایک نئے فلسطینی رہنما کی تلاش شروع ہو گئی جو عرفات کے جانے کے بعد مذاکرات اور مراعات لینے کے لیے تیار ہو۔ محمود عباس پسندیدہ امیدوار کے طور پر ابھرے اور انہیں وسیع اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم کا کردار قبول کرنے کے لیے شدید بین الاقوامی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

ابتدائی طور پر، عرفات نے ایک ایسے وزیر اعظم کی تقرری کی مخالفت کی جو ان کے اختیارات کا مقابلہ کرے اور، مؤثر طریقے سے، ڈی فیکٹو لیڈر کے طور پر کام کرے۔ تاہم، قتل کے بڑھتے ہوئے خطرے نے اس کا ہاتھ مجبور کر دیا، اور اس نے ہچکچاتے ہوئے 29 اپریل 2003 کو محمود عباس کا تقرر کیا۔ دونوں کے درمیان اختیارات اور اثر و رسوخ کے حوالے سے اندرونی طاقت کی کشمکش تیزی سے شروع ہو گئی، جس سے عباس کو پانچ ماہ سے بھی کم عرصے میں استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے جواب میں، عرفات نے احمد قری کو 5 اکتوبر 2003 کو وزیر اعظم مقرر کیا، یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ عباس کے مقابلے میں اپنے وژن سے زیادہ ہم آہنگ ہیں، جسے اسرائیل نے پسند کیا۔ شیرون نے، تاہم، نومبر 2004 میں عرفات کے قتل کا منصوبہ بنا کر ایک آخری دھچکا

---

[1] عرفات کی بے شمار مراعات اور دھوکہ دہی کے باوجود، امریکی فیصلہ ساز اپنی یادداشتوں میں اسے مسلسل حقارت اور حقارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف صہیونی مفادات کے ساتھ ان کی صف بندی کی عکاسی کرتا ہے بلکہ عرفات کے سیاسی اور اخلاقی زوال کے بارے میں شدید آگاہی بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کی مثالیں جارج ٹینیٹ کے ایٹ دی سنٹر آف دی سٹارم (صفحہ 103)، کونڈولیزا رائس کی نوہائر آنر (صفحہ 177) اور ہلیری کلنٹن کے ہارڈ چوائسز (صفحہ 306) میں مل سکتی ہیں۔

لگایا، مبینہ طور پر اس کے اندرونی دائرے میں کسی کے زیر انتظام سست اداکاری والے زہر کے ذریعے۔ اس نتیجے کو ایک گورننگ اتھارٹی نے سہولت فراہم کی جو بنیادی طور پر اسرائیلی تسلط کے تحت کام کرنے کے لیے ڈیزائن کی گئی تھی۔

عرفات کی موت کے بعد، محمود عباس فلسطینی اتھارٹی اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کی قیادت کرنے کے لیے واپس آئے، جسے اسرائیل اور امریکہ دونوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

جنوری 2005 میں، محمود عباس کو فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ کے طور پر نصب کرنے کے غیر واضح مقصد کے ساتھ ایک احتیاط سے منعقدہ صدارتی انتخابات ہوئے۔ سات امیدواروں نے حصہ لیا، جن میں سے کسی کے پاس بامعنی عوامی حمایت یا وسائل نہیں تھے کہ وہ عباس، PA کے پسندیدہ وارث اور اسرائیلی قبضے کے ساتھ ایک نمایاں ساتھی کے لیے سنگین چیلنج کر سکیں۔ جیسا کہ توقع کی گئی تھی، انتخاب عباس کی فتح پر اختتام پذیر ہوا، اور فلسطینی اتھارٹی کے صدر کے طور پر اپنا عہدہ حاصل کر لیا۔

عرفات کے قتل نے فلسطینی رہنماؤں کی ٹارگٹ کلنگ کے سلسلے کے اختتام کو نشان زد کیا۔ شیرون نے فلسطینی دھڑوں کے سیاسی رہنماؤں کو نشانہ بنا کر ان قتلوں کا دائرہ وسیع کیا، جو فوجی کمانڈروں پر پہلے کی توجہ سے ایک اہم اضافہ تھا۔ فلسطینی عوام نے انتفاضہ کے دوران اپنے بہت سے بہترین فوجی اور سیاسی رہنماؤں کو کھوتے ہوئے بھاری قیمت ادا کی۔ نومبر 2001 میں مغربی کنارے میں القسام بریگیڈز کے کمانڈر محمود ابو الحنود اور جولائی 2002 میں القسام بریگیڈز کے جنرل کمانڈر صلاح شہیدہ کو قتل کیے جانے والے اہم ترین عسکری رہنماؤں میں شامل تھے۔ شہید ہونے والے اہم سیاسی رہنماؤں میں ابو علی مصطفیٰ، اگست 2001 میں F-Genes کے سیکرٹری جنرل ابو علی مصطفیٰ اور FG200 کے سیکرٹری جنرل شامل تھے۔ حماس کی شخصیات جیسا کہ جولائی 2001 میں جمال منصور اور جمال سلیم، جولائی 2002 میں اسماعیل ابو شناب، مارچ 2004 میں حماس کے بانی شیخ احمد یاسین اور اپریل 2004 میں ان کے نائب اور جانشین ڈاکٹر عبدالعزیز الرنتیسی۔ برغوتی کو مارچ 2003 میں گرفتار کیا گیا۔

ان گھرے نقصانات کے باوجود، مزاحمت نے غیر معمولی لچک دکھائی، اپنی صفوں کو بھرتی رہی اور لڑائی جاری رکھی۔ اس نے جدید سیکورٹی اور فوجی حکمت عملی تیار کی جس نے اسرائیلی افواج کو مسلسل مایوس کیا۔ سخت حفاظتی اقدامات کے باوجود بھی، مزاحمتی جنگجوؤں نے اسرائیلی سرزمین کے اندر شہادت کی کارروائیوں کو انجام دینے کے لیے مسلسل دفاع کی خلاف ورزی کی۔ ان کارروائیوں میں خواتین[1] کی شرکت بھی شامل تھی اور 2000 اور 2005 کے درمیان 135 مشنز تھے، جن میں سے 61 حملوں میں حماس کا حصہ تھا۔[2]

مزاحمت مقامی طور پر بنائے گئے راکٹوں کی تیاری کے ساتھ اپنے ہتھیاروں کو آگے بڑھانے میں بھی کامیاب رہی۔ ابتدائی طور پر ان راکٹوں کی رینج 10 کلومیٹر تھی، جو بعد میں 12 کلومیٹر تک پھیل گئی، جس میں فلسطینی ماحول میں مقامی طور پر حاصل کردہ اجزاء کا استعمال کیا گیا۔ یہ اسرائیلی بستیوں کی سلامتی کو درپیش خطرے میں نمایاں اضافے کی نمائندگی کرتا ہے۔

انتفاضہ کے پانچ سالوں کے دوران، اسرائیلی فوج نے 22,000 سے زیادہ حملے، فائرنگ اور راکٹ لانچ کیے،[3] جن میں 17 اکتوبر 2001 کو پاپولر فرنٹ کے ذریعے اسرائیلی وزیر سیاحت ریحام زیوی کا قتل جیسے ہائی پروفائل آپریشنز بھی شامل ہیں۔

غزہ اور مغربی کنارے دونوں نے مزاحمتی جدوجہد کے لیے الگ الگ فوائد فراہم کیے ہیں۔ غزہ کو اس کی آبادی کی کثافت کی وجہ سے ممتاز کیا گیا تھا، بنیادی طور پر بے شمار پناہ گزین کیمپوں کی وجہ سے۔ اس کی خاصیت اسلامی تحریک کی طاقت سے بھی تھی، جو اس گھنی آبادی کے اندر، خاص طور پر کیمپوں میں سرگرم عمل تھی۔ اس کے برعکس، مغربی کنارے میں ناہموار علاقہ، غاروں اور چٹانوں سے بھرا ہوا، نیز متعدد پہاڑی راستے تھے جنہوں نے مزاحمتی جنگجوؤں کو اہم سڑکوں پر وسیع حفاظتی چوکیوں کے باوجود اسرائیل میں گھسنے کے قابل بنایا۔

---

[1] دوسری انتفاضہ کے دوران فلسطینی شہداء کا ہراول دستہ مختلف دھڑوں سے آیا تھا، جن میں وفا ادریس، آیت الخراس، دارین ابو عائشہ، ہنادی جرادات، ریم الریاشی اور دیگر شامل تھے۔

[2] مشین صالح، ص128

[3] Ibid

نتیجے کے طور پر، غزہ میں آپریشن اپنی تعداد، تنوع، اور بڑی، گھنی آبادی کے درمیان مجرموں کا سراغ لگانے اور انہیں پکڑنے میں دشواری کے لیے قابل ذکر تھے۔ اسرائیلی فوج کو غزہ میں بڑے پیمانے پر دراندازی شروع کرنے میں بھی اہم چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف، مغربی کنارے میں کارروائیاں زیادہ مرکوز اور اثر انگیز تھیں، خاص طور پر یروشلم اور تل ابیب میں اسرائیلی مراکز کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ تنگ، پہاڑی راستوں کو کنٹرول کرنے میں دشواری کی وجہ سے۔

انتفاضہ اور شہادت کی کارروائیاں اسرائیل کے سلامتی کے نظریے کو غیر مستحکم کرنے میں کامیاب ہوئیں، جس کے نتیجے میں ہجرت میں اضافہ ہوا اور اہم اقتصادی نقصان ہوا۔ بڑھتے ہوئے نقصانات کا سامنا کرتے ہوئے، شیرون نے محسوس کیا کہ نیچے کی جانب بڑھنے والے اس عمل کو روکنے کا واحد طریقہ دو اہم فیصلے کرنا تھا جو کہ کوئی بھی اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کی طاقت اور طویل فوجی تاریخ کے بغیر نہیں لے سکتا تھا۔ یہ فیصلے غزہ کی پٹی سے انخلاء اور مغربی کنارے میں علیحدگی کی دیوار کی تعمیر تھے۔ علیحدگی کی دیوار کے ساتھ شیرون کا مقصد خودکش بمباروں کے داخلے کے تمام ممکنہ مقامات کو بند کرنا تھا۔ غزہ سے انخلاء کا ان کا استدلال اسرائیلیوں کو خطرے سے دور کرنا تھا، اسرائیل کو باہر سے غزہ کی ناکہ بندی کرنے کے لیے چھوڑنا تھا جب کہ فلسطینی سیکیورٹی فورسز نے اندر سے کنٹرول سنبھال لیا تھا، اس طرح فلسطینیوں کے درمیان اندرونی کشمکش بھڑک اٹھی۔ بہت سے اسرائیلیوں کے لیے، غزہ سے انخلاء اور مغربی کنارے کے وسیع علاقوں میں علیحدگی کی رکاوٹ کا کھڑا ہونا ناقابل تصور تھا۔ فوجی طاقت میں تفاوت کے باوجود، ان کارروائیوں کو فلسطینی مزاحمت کے ہاتھوں اسرائیل کی شکست کے اعتراف کے طور پر گہری جڑی ممنوعات کی خلاف ورزی کے طور پر دیکھا گیا۔ اس اقدام سے مغربی کنارے سے مزید انخلاء کی مثال قائم کرنے کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا، ممکنہ طور پر 1967 سے قائم بستیوں کو ختم کرنا۔ پھر بھی، شیرون نے اسرائیل کے اندر کسی بھی اندرونی مخالفت کو کچلتے ہوئے اپنے منصوبے کو آگے بڑھایا۔

درمیانی مدت میں، ان اقدامات نے شہادت کی کارروائیوں کو کامیابی سے روک دیا، فلسطینی مزاحمت کو نئے حربے تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم، شیرون یہ پیشین گوئی کرنے میں ناکام رہے کہ آزاد کرایا گیا غزہ مزاحمت کے ایک مضبوط گڑھ، ایک شدید راکٹ مہم کے لیے لانچنگ پیڈ، اور طاقت کے توازن کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے والا ایک بڑا فوجی اڈہ بن جائے گا۔

غزہ سے اسرائیلی انخلاء اس جرأت مندانہ انتفاضہ کا سب سے اہم نتیجہ تھا، جس کے دوران اس کے پانچ سالوں (2000–2005) کے دوران 4000 سے زائد فلسطینی شہید ہوئے، جن میں تقریباً 800 بچے اور 300 کے قریب خواتین شامل تھیں۔ 45,000 سے زیادہ زخمی ہوئے، تقریباً 10,000 فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا، اور 70,000 سے زیادہ گھر تباہ ہوئے[1]۔ اس کے مقابلے میں اسرائیل کو 1500 سے زیادہ ہلاکتیں اور 3000 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اقتصادی طور پر، 2002 اسرائیلی تاریخ کا بدترین سال تھا، جس میں انتفادہ کے پہلے دو سالوں میں مجموعی طور پر آٹھ بلین ڈالر کا نقصان ہوا، اوسطاً 11 ملین ڈالر یومیہ۔ اس کے علاوہ، اسرائیلیوں نے ایک گہرا نفسیاتی صدمہ برداشت کیا، سلامتی، خوشحالی اور بہبود میں اعتماد کھو دیا جس کا ان سے امیگریشن کی حوصلہ افزائی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وقت سے، ریورس منتقلی آہستہ آہستہ بڑھ گئی ہے.[2]

اگرچہ یہ تعداد ابتدائی طور پر فلسطینی عوام کی شکست اور اسرائیلیوں کی فتح کا اشارہ دے سکتی ہے، لیکن قریب سے دیکھنے سے ایک الگ کہانی سامنے آتی ہے۔ طاقت کے بگڑتے توازن کے تناظر میں غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ فلسطینی عوام نے غیر معمولی لچک، عزم اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔

مزید برآں، جب ہم اہم اخلاقی تبدیلیوں پر غور کرتے ہیں تو تصویر اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ان اخلاقی تبدیلیوں میں سے ایک سب سے زیادہ قابل ذکر زپی لیونی کی طرف سے آیا، جو ایک سخت صہیونی اور قوم

1 محسن صالح، صفحہ 126، 128۔
2 Ibid., pp.129-30.

پرست شخصیت ہے، جس نے تسلیم کیا کہ گریٹر اسرائیل کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ اسرائیلی دردناک رعایتوں کے بغیر فلسطینیوں پر تسلط برقرار نہیں رکھ سکتے۔[1]

[1] کونڈولیزا رائس، صفحہ 328۔

غزہ کی پٹی کی آزادی

مغربی کنارے اور غزہ میں مزاحمتی تحریکوں کے درمیان ایک اہم فرق یہ ہے کہ مغربی کنارے میں اسلام پسند 1967 تک اردن کی حکمرانی کے تحت رہے، ایک ایسی حکومت جو عام طور پر کنٹرول اور نرم کنٹرول کی حکمت عملی پر انحصار کرتی تھی۔ اس کے برعکس، غزہ میں ان کے ہم منصبوں کو سخت اور جابرانہ مصری حکومت کا نشانہ بنایا گیا، جس نے اسلامی تحریک کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا اور بھرتی اور فعالیت کے لیے اس کے نقطہ نظر کو تشکیل دیا۔

مزید برآں، غزہ کا جغرافیہ اس کے نسبتاً ہموار خطوں اور چھوٹے سائز نے اسے بہت سے بے گھر لوگوں کے لیے قدرتی پناہ گاہ بنا دیا، جس کے نتیجے میں ایک گنجان آباد آبادی ہے۔ اس نے ایک سماجی طور پر سخت بنا ہوا، پھر بھی غیر جدید ڈھانچہ بنایا، جس میں قریبی برادریوں، تنگ گلیوں، اور گلیوں اور راستوں کی بھولبلییا شامل تھی۔ ان حالات نے غزہ کو خاص طور پر جدید حکام کی طرف سے لگائے گئے نگرانی اور کنٹرول کے اقدامات کے خلاف مزاحم بنا دیا۔

ان عوامل نے دوسروں کے ساتھ مل کر غزہ میں اسلام پسندوں کو مغربی کنارے میں اپنے ہم منصبوں کے مقابلے میں طاقت میں اضافہ کرنے کی اجازت دی، جو ان کے اسرائیلی قابضین کے لیے ایک اہم چیلنج بن گئے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ یتزاک رابن نے ایک بار بیدار ہونے اور غزہ کو سمندر میں نگل جانے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ خطہ اسرائیلی سیکیورٹی حکمت عملی میں سب سے پیچیدہ مسائل میں سے ایک بن گیا، اور یہ ان اولین معاملات میں سے ایک تھا جسے انہوں نے عرفات کے اختیار میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، بالآخر، یہ شیرون تھا جو غزہ سے واپس چلا گیا۔

اندرونی طور پر، غزہ کے اسلام پسند اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ دلیر، زیادہ فعال اور پہل کرنے کے لیے زیادہ تیار تھے۔ فلسطینی اتھارٹی کے قیام کے آغاز سے ہی، انہوں نے مغربی کنارے اور بیرون ملک اپنے

ہم منصبوں کے برعکس 1996 کے انتخابات میں حصہ لینے کی اہمیت کو تسلیم کیا[1]۔ غزہ سے پہلا انتفاضہ شروع ہوا، غزہ سے ہی مسلح مزاحمت سب سے پہلے ابھری، اور غزہ سے ہی فلسطینی مزاحمت کے چند بااثر رہنما ابھرے۔

غزہ سے اسرائیلی انخلاء

غزہ سے اسرائیلی انخلا 2005 میں طے پایا تھا۔ جواب میں، فلسطینی اتھارٹی نے علاقے پر حکومت کرنے کے لیے اپنی تیاری اور صلاحیت کا اعلان کیا، جب کہ مزاحمتی دھڑوں نے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اپنی رضامندی کا اشارہ دیا، جس کا مقصد کسی بھی ایسے بہانے کو ختم کرنا تھا جو انخلاء کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور اتھارٹی کے ساتھ مستقبل میں مفاہمت کی امید ہے۔

غزہ میں پریوینٹیو سیکیورٹی سروس کے سربراہ محمد دحلان کو اسرائیلی اس شعبے میں سیکیورٹی برقرار رکھنے کے لیے اپنی بنیادی امید کے طور پر دیکھتے تھے۔ دحلان اسرائیل کے ساتھ انتہائی وفادار ساتھیوں میں سے ایک تھا، جو مزاحمتی اراکین کو ٹریک کرنے، گرفتار کرنے اور ان پر تشدد کرنے کی اپنی انتھک کوششوں کے لیے مشہور تھا۔ انہیں یاسر عرفات کے ممکنہ جانشین کے طور پر بھی دیکھا جاتا تھا، جس میں فلسطینی اتھارٹی کا صدر بننے کی خواہش تھی۔ تاہم، محمود عباس جیسی پرانی شخصیات کی موجودگی نے ان کے عزائم کو ناکام بنا دیا، کیونکہ دحلان کو قائم قیادت میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے بہت کم عمر سمجھا جاتا تھا۔

اگرچہ اس نے اتھارٹی کی قیادت کرنے کا موقع کھو دیا، غزہ نے دحلان کو اپنی قابلیت ثابت کرنے یا علاقے کی آزادی حاصل کرنے کا ایک منفرد موقع پیش کیا۔ اس نے اس کے اور عباس کے درمیان کشیدگی کو بڑھانے کا مرحلہ طے کیا۔ غزہ پر دحلان کے کنٹرول کی حمایت کرنے کے لیے شیرون کی حکمت عملی میں اہم مزاحمتی رہنماؤں جیسے شیخ احمد یاسین اور عبدالعزیز الرنتیسی کا قتل شامل تھا۔

---

[1] ابراہیم گوشہ ص225

جب کہ غزہ سے اسرائیلی انخلاء فلسطینی مزاحمت کے لیے ایک اہم کامیابی تھی جس نے اسے پورا کرنے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا جسے عرب فوجیں کرنے میں ناکام رہی تھیں، اس نے بھی صورت حال میں ایک خطرناک تبدیلی کی نشاندہی کی۔ اس پیش رفت سے دو اہم مسائل سامنے آئے: پہلا، دحلان اور عباس کی قیادت میں فلسطینی اتھارٹی، اور اس کے ساتھیوں سے بھری سیکیورٹی فورسز نے مزاحمتی دھڑوں کے خلاف اس بینر کے تحت سخت مہمات کا ایک سلسلہ شروع کیا کہ "جائز ہتھیار فلسطینی اتھارٹی کے پاس ہیں۔" دوسرا، گنجان آباد غزہ کی پٹی پر حکومت کرنے کا مشکل چیلنج، جس میں اقتصادی وسائل، جغرافیائی گہرائی اور سیاسی پشت پناہی کی کمی تھی، نے موثر انتظامیہ کو مشکل سے مشکل بنا دیا۔

ن چیلنجوں کا عملی اور حقیقت پسندانہ حل پیش رفت کے ایک سلسلے کے ذریعے سامنے آیا، یہ سب غزہ سے باہر ہوئے:

11 ستمبر 2001 کے حملوں نے ریاستہائے متحدہ کو ایک بے مثال صدمہ پہنچایا، جس کا تجربہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد، امریکی سیاسی حلقوں میں ایک نیا خیال گردش کرنے لگا: اسلامی دنیا کو جمہوری بنانے کی ضرورت۔ اگرچہ یہ تصور علمی، مشرقیت اور سلامتی کے مباحثوں میں طویل عرصے سے موجود تھا، لیکن اس نے پالیسی سازوں کو اپیل نہیں کی تھی۔ جب تک عرب آمروں نے امریکی اور اسرائیلی مفادات کو برقرار رکھا، ان کی جگہ لینے یا ان کے ممالک میں جمہوریت کو فروغ دینے کے لیے بہت کم ترغیب دی گئی تھی، اس طرح کے خطرات اور غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر اس طرح کی تبدیلی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

تاہم، 11 ستمبر کے بعد ایک تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا: یہ عرب مطلق العنان غصے اور جذبات کی دھماکہ خیز سطح کو فروغ دے رہے تھے۔ یہ ٹک ٹک ٹائم بم اب صرف عرب اور اسلامی دنیا تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ امریکہ اور یورپ کے قلب میں پھٹنے لگے تھے۔ اس پس منظر میں اسلامی دنیا کے دو ماڈل ترکی اور پاکستان امریکی حکمت عملیوں کے لیے خاصے پرکشش بن گئے۔

ترکی اور پاکستان دونوں میں، جمہوری عمل نے حکومت کرنے والی جماعتوں کو تبدیل کرنے کی اجازت دی، لیکن ریاست کی طاقت کا مرکز جو فوج میں شامل تھا، امریکی مفادات کے ساتھ مضبوطی سے منسلک رہا۔ ان ممالک میں فوج مداخلت کر سکتی ہے یا بغاوت کر سکتی ہے جب بھی جمہوریت ان کے یا امریکہ کے لیے ناگوار نتائج پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر، ترکی نے تقریباً ہر دہائی میں ایک فوجی بغاوت کا سامنا کرنے کے لیے شہرت حاصل کی،[1] جب کہ پاکستان میں اوسطاً ہر آٹھ سال میں ایک بغاوت ہوئی[2]۔

ان ماڈلز کا بنیادی فائدہ اسلامی تحریکوں کی توانائی کو جذب کرنے کی ان کی صلاحیت تھی، جو انہیں عسکریت پسند مزاحمت کی بجائے سیاسی مشغولیت کی طرف لے گئے۔ اس نے جہادی تحریکوں کے عروج کو روکا، کیونکہ سیاسی تبدیلی کے امکانات نے مسلح جدوجہد کا ایک قابل فہم، قابل حصول اور کم خرچ متبادل پیش کیا تھا۔

نتیجتاً، امریکی پالیسی عرب دنیا میں "جمہوریت پھیلانے" کی طرف منتقل ہوئی جو کہ جمہوری اصولوں یا عرب آبادی کے لیے حقیقی وابستگی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسلامی توانائی کو جہادی راستوں سے ہٹانے کے لیے ایک اسٹریٹجک اقدام کے طور پر ہے جو مستقبل میں 11 ستمبر جیسے حملوں کا باعث بن سکتی ہے۔ اپنے اسٹریٹجک مفادات کے ساتھ۔

یاسر عرفات نے فلسطینی اتھارٹی کے رہنما کے طور پر خدمات انجام دیں، فلسطینی عوام کی ان کے براہ راست انتخاب یا انتخابی مینڈیٹ کے بغیر نمائندگی کی۔ ان کا عروج تحریک فتح کے رہنما کے طور پر شروع ہوا، جس نے اصل میں مصری ناصری حکومت کی حمایت سے قائم ہونے والی فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) میں شمولیت کے بعد تنظیم کا کنٹرول جلد ہی سنبھال لیا۔ عرفات بعد میں اس کے چیئرمین بن گئے۔ فلسطینی عوام کے نمائندے کے طور پر پی ایل او کا کردار خود فلسطینیوں کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ عرب ریاستوں کی

[1] ترکی میں 1960، 1971، 1980 اور 1997 میں فوجی بغاوتیں ہوئیں، جسے بعد ازاں اسلام پسند رہنما نیکمتین اربکان کی حکومت کے خلاف "نرم بغاوت" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

[2] پاکستان میں 1958ء، 1971ء، 1977ء، 1998ء اور 1999ء میں فوجی بغاوتیں ہوئیں، اس کے علاوہ 1988ء میں جنرل ضیاء الحق کا قتل بھی ہوا، جو امریکی مفادات کے خلاف تھے۔

قرارداد کا نتیجہ تھا۔ انتفاضہ کے بعد، عرفات کو فلسطینی کاز کی قیادت کرنے کے لیے ایک بار پھر انتخاب کی قانونی حیثیت کے بغیر بلند کیا گیا۔

اگرچہ ان منفرد حالات نے عرفات کو انتخابی توثیق کے بغیر قیادت پر چڑھنے کی اجازت دی، لیکن انھوں نے ان کے جانشینوں، خاص طور پر محمود عباس کے لیے وہی راستہ فراہم نہیں کیا۔ عباس کے پاس مزاحمت کی ایک قابل ذکر تاریخ نہیں تھی، وہ فصیح مقرر نہیں تھے، اور اوسلو معاہدے کے معمار کے طور پر ایک متنازعہ شہرت رکھتے تھے۔ نتیجتاً، فلسطین میں امریکی اور اسرائیلی حمایت یافتہ انتخابات کی ضرورت پیش آئی تاکہ عباس کو فلسطینی اتھارٹی کے صدر کے طور پر قانونی حیثیت دی جائے۔ یروشلم، پناہ گزینوں اور بستیوں جیسے نازک مسائل پر اس سے توقع کی جانے والی رعایتوں کو اس قابل بنانے کے لیے یہ قانونی حیثیت اہم تھی۔ [1] مزید برآں، اس کا مقصد اسے مزاحمتی دھڑوں کے خلاف فیصلہ کن مہم کی قیادت کرنے کے لیے بااختیار بنانا تھا، اور ایک "آزادانہ اور منصفانہ" انتخابات میں قانونی طور پر منتخب صدر کے طور پر اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جسے قانون ساز کونسل میں بنیادی طور پر فلسطینی پارلیمنٹ میں فتح کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔

اس موڑ پر، فلسطینی مزاحمتی دھڑوں نے خطرے کی گھنٹی بجا دی، اس بات کا احساس تھا کہ آئندہ انتخابات کے ذریعے فلسطینی کاز کی قرارداد اور ممکنہ بندش کو تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس بحران کو مزید پیچیدہ کرنے کی حقیقت یہ تھی کہ ان دھڑوں نے خود کو اور اپنی کارروائیوں کو مزاحمتی تحریکوں کے طور پر اپنی شناخت کے ارد گرد تشکیل دیا تھا، نہ کہ سیاسی جماعتوں کے طور پر جو الیکشن لڑنے کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ ان کے آغاز سے نہ تو یہ تصور کیا گیا تھا اور نہ ہی اندازہ تھا کہ اسرائیل کبھی بھی فلسطینی عوام کے لیے

[1] محمود عباس مزاحمت کی مذمت کرنے سے باز نہیں آئے اور نہ ہی یہ اعلان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی کہ مہاجرین کی واپسی کوئی حقیقت پسندانہ حل نہیں ہے حالانکہ عباس خود ایک مہاجر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ اصل میں مقبوضہ شہر صفد سے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے، وہ اپنے اور پورے فلسطینی عوام کے حقوق سے دستبردار ہونے والے پہلے شخص بن گئے۔

انتخابات کی اجازت دے گا۔ اس بے مثال صورتحال نے ایک بڑا چیلنج پیش کیا، جس کے نتیجے میں دو بڑے اسلامی مزاحمتی دھڑوں: حماس اور اسلامی جہاد کے درمیان ایک اہم تقسیم ہو گئی۔

حماس نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، جس کا مقصد فلسطینی کاز کو ختم کرنے میں رکاوٹ ڈالنے اور فتح کو، جو پہلے ہی اقتدار پر اجارہ داری رکھتی ہے، کو اہم فیصلے کرنے اور مقصد کی تقدیر کو یکطرفہ طور پر تشکیل دینے سے روکنا ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی جہاد نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا انتخاب کیا، اس بات کو برقرار رکھتے ہوئے کہ انتخابات تاریخی حقوق پر مراعات کے لیے جواز فراہم نہیں کر سکتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اتھارٹی کے فیصلوں سے قطع نظر مزاحمتی تحریک کو فوجی اور میدانی مزاحمت کے لیے مضبوطی سے کاربند رہنا چاہیے۔

امریکیوں، اسرائیلیوں، عرب حکومتوں اور یہاں تک کہ الفتح کے نقطہ نظر سے، انتخابات میں حماس کی شرکت کو کوئی حقیقی خطرہ نہیں تھا۔ فلسطینی اتھارٹی پر اس کے دیرینہ کنٹرول، اس کے مالی وسائل، اور انتظامی مشینری پر اس کے 13 سالہ تسلط کے پیش نظر فتح کی فتح یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ مزاحمتی تحریکیں، اپنی مقبولیت کے باوجود، حکمرانی اور نظم و نسق کے لیے ضروری تجربہ کار کیڈرز کی کمی، سیاسی کارروائیوں میں پیشگی شمولیت نہیں رکھتی تھی، اور (خاص طور پر انتخابات میں حصہ لینے والے مقامی امیدواروں کے درمیان) بین الاقوامی تعلقات کا فقدان تھا۔ مزید برآں، اسلامی تحریکوں کے طور پر، انہیں علاقائی عرب ماحول سے موروثی طور پر مسترد ہونے کا سامنا کرنا پڑا، جس نے ان کے امکانات کو مزید کم کر دیا۔

محمود عباس اور فلسطینی اتھارٹی کی حکومت کی قانونی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے ہوئے ان کی شفافیت کو یقینی بنانے کے لیے انتہائی احتیاط کے ساتھ انتخابات کرائے گئے۔ اس کے باوجود نتائج زلزلے کے جھٹکے سے کم نہیں تھے: حماس بھاری اکثریت کے ساتھ جیت کر ابھری، اس نے 132 میں سے 74 نشستیں حاصل کیں اور آزادانہ طور پر حکومت بنانے کی صلاحیت حاصل کی۔ یہ نتیجہ، جس میں حماس سمیت سب کی طرف سے غیر متوقع تھا، نے سیاسی منظر نامے کی نئی تعریف کی۔ حماس کا مقصد

ابتدائی طور پر ایک طاقتور اپوزیشن کے طور پر کام کرنا تھا جو فلسطینیوں کے حقوق پر کسی بھی رعایت کو ناکام بنا سکتا ہے، نہ کہ حکومت سنبھالنے کے لیے۔ اس دوران الفتح صرف 45 نشستیں جیتنے میں کامیاب رہی۔

انتخابی نتائج فلسطین، عرب دنیا اور مغربی ممالک میں گونج اٹھا۔ جمہوری عمل نے حماس کو، جسے بہت سے لوگوں نے دہشت گرد تنظیم کے طور پر درجہ بندی کیا ہے، کو اقتدار میں لایا تھا۔ اس پیش رفت نے بین الاقوامی برادری کو پابند سلاسل کر دیا۔ انتخابات کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے فلسطینی عوام کی مرضی کا احترام کرنا ہو گا، جب کہ نتائج کو مسترد کرنا ان کی جمہوری بیان بازی کی منافقت کو بے نقاب کرے گا۔[1] تاہم، انتخابات کے نتائج کے مخالفین نے آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کیا: انہوں نے اس عمل کے منصفانہ ہونے کو تسلیم کیا لیکن اس کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، انتخابات کے اثرات کو روکنے اور بالآخر اسے کالعدم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

غزہ میں فوجی قرارداد

ان انتخابات کا سب سے گہرا نتیجہ فتح کے زیر تسلط حکومت کے ذریعے مسئلہ فلسطین کے حل کے منصوبے کو ختم کرنا تھا۔ تاریخی فلسطین پر دعویٰ کرنے اور یروشلم، پناہ گزینوں، ریاست کا درجہ، پانی کے حقوق اور بستیوں جیسے اہم معاملات پر سمجھوتہ کرنے کے لیے مکمل قانونی جواز کے ساتھ فلسطینی صدر کی تعیناتی کے امکانات کو مؤثر طریقے سے ناکام بنا دیا گیا۔ یہ ایک یادگار فتح اور خطرناک خطرے سے پیچھے ہٹنے کی نمائندگی کرتا ہے۔

تاہم، اس کامیابی نے مزاحمتی تحریک کے لیے نئے اور پیچیدہ چیلنجز بھی متعارف کرائے، جن کو اب ایک محصور اور گھٹن زدہ آبادی پر مسلسل بیرونی دباؤ کے تحت حکومت کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ کسی بھی

[1] دیکھیں کونڈولیزا رائس، pp.476-77

معاشرے کے معاملات کو سنبھالنا فطری طور پر چیلنج ہوتا ہے، لیکن فلسطینی کمیونٹی کے لیے ایسی غیر معمولی رکاوٹوں کے تحت، یہ سیاسی، انتظامی اور انسانی جدوجہد کی ایک بے مثال آزمائش ثابت ہوئی۔

حماس نے تمام فلسطینی دھڑوں پر مشتمل ایک قومی اتحاد کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جس میں حکمرانی کی ذمہ داری بانٹ دی جائے اور فلسطینی اتھارٹی، عرب حکومتوں اور مغربی اقوام کی طرف سے دشمنی کی آنے والی لہر کو ختم کیا جا سکے۔ تاہم، اس کوشش کو اس وقت ناکام بنا دیا گیا جب حماس کی حکومت میں شامل ہونے کے خواہشمند کسی بھی دھڑے کے خلاف دھمکیاں دی گئیں۔ نتیجتاً، حماس کے پاس تنہا حکومت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، اسماعیل ہنیہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ محمود الزھار اس وزیر خارجہ اور سعید صیام وزیر داخلہ کے طور پر، آخری دونوں حماس کے اندر نمایاں شخصیات ہیں۔

فلسطینی اتھارٹی اور الفتح کی قیادت میں اپوزیشن کی ایک مربوط مہم شروع کی گئی۔ محمود عباس کے ابتدائی اقدامات میں سے ایک سبکدوش ہونے والی قانون ساز کونسل کا اجلاس بلانا تھا تاکہ آئینی ترامیم کی جائیں جس نے حکومت سے اس کے اختیارات چھین لیے اور انہیں صدر کے ہاتھ میں مرکوز کر دیا۔ عباس نے وزارتوں اور ایجنسیوں کی تنظیم نو کے لیے اضافی احکام جاری کیے، جس میں اہم ذمہ داریاں جیسے کہ سیکیورٹی فورسز، میڈیا کی نگرانی، بارڈر مینجمنٹ، اور سفارت خانے کی کارروائیاں براہ راست خود کو منتقل کیں۔

تاہم، سب سے زیادہ دھچکا فلسطینی اتھارٹی کے اندرونی نظام کے اندر سے آیا۔ حماس کے وزراء نے اپنی وزارتیں خالی، فنڈز یا وسائل سے خالی پائی۔ انتظامی ڈھانچے پر مکمل طور پر الفتح کے ارکان کا غلبہ تھا جنہوں نے وزیر داخلہ سعید صیام کی طرف سے جاری کردہ وزارتی ہدایات سمیت فعال طور پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ صیام کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر اس کے نائب راشد ابو شبک کی طرف سے، جنہیں عباس نے تمام سکیورٹی فورسز کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ تعاون کی کمی نے بڑے پیمانے پر سیکیورٹی افراتفری کو جنم دیا، جس میں الفتح عناصر کی جانب سے سڑکوں پر بدامنی پھیلانے اور سیکیورٹی اہلکاروں کی جانب سے اپنے کردار کو پورا کرنے سے انکار کی وجہ سے مزید اضافہ ہوا۔

دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے، سعید صیام نے ایک "ایگزیکٹو فورس" قائم کی، جو مختلف دھڑوں کے اراکین پر مشتمل تھی اور اسے براہ راست جوابدہ تھی۔ یہ فورس، جس کی قیادت پاپولر ریز سٹنس کمیٹیوں کے بانی جمال ابو سمہدان کر رہے تھے، نظم و ضبط کی بحالی میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ تاہم، ابو سمہدانہ کی قیادت مختصر رہی، کیونکہ وہ جون 2006 میں ایک اسرائیلی فضائی حملے میں مارے گئے تھے۔

یہ نئی حکومت کی راہ میں رکاوٹ اور رکاوٹ ڈالنے کی واحد کوشش نہیں تھی۔ مغربی کنارے میں اسرائیلی فورسز نے انتخابات میں نشستیں جیتنے والے فلسطینی قانون سازوں کو نشانہ بناتے ہوئے گرفتاریوں کی مہم شروع کی، خاص طور پر حماس سے وابستہ افراد، ان کی تعداد کم کرنے کے لیے۔ مقصد یا تو اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ فتح کو قانون ساز کونسل میں اکثریت برقرار رہے یا اگر الفتح کے ارکان نے رکنے کا انتخاب نہ کیا تو کورم کو پورا ہونے سے روکنا تھا، اس طرح کونسل غیر فعال ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی، الفتح عناصر کی جانب سے ترتیب دیے گئے سیکورٹی افراتفری میں شدت آگئی۔ تنخواہوں کی عدم ادائیگی پر مظاہرے پھوٹ پڑے، جس کے نتیجے میں دھرنے، ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے، جو پرتشدد تصادم اور ہلاکتوں میں بڑھ گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کی سیکیورٹی فورسز ہنگامہ آرائی میں شامل ہو گئیں جس سے صورتحال مزید خراب ہو گئی۔ حماس کے وزراء اور رہنماؤں کو قتل کا نشانہ بنایا گیا، جن میں سیاسی اور عسکری دونوں شاخوں کی اعلیٰ شخصیات بھی شامل تھیں۔ مثال کے طور پر، عبدالکریم القوقہ کو 31 مارچ 2006 کو، محمد الطار کو 16 مئی 2006 کو اور حسین العوجہ کو 6 جولائی 2006 کو قتل کیا گیا۔ الفتح کے عسکریت پسندوں نے وحشیانہ ہتھکنڈوں کا سہارا لیا، جیسے کہ حماس کے نوجوانوں کو گولی مار کر ان کے پیروں میں گولی مارنا، ان تک رسائی سے روکنا اور ان تک رسائی حاصل کرنا۔ اونچی عمارتیں. بڑھتے ہوئے تشدد کے باوجود، حماس نے تحمل کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کی، اسے اندرونی تنازعات یا خانہ جنگی کے امکان کے بارے میں گہری تشویش تھی۔

مفاہمت کی متعدد کوششیں کی گئیں۔ جون 2006 میں، اسرائیلی جیلوں میں قید فلسطینیوں نے ایک دستاویز کی تجویز پیش کی جس کا مقصد دونوں دھڑوں کے لیے متفقہ فریم ورک بنانا تھا۔ اس کے بعد کئی میٹنگیں ہوئیں، جو قاہرہ اور مکہ میں منعقد ہوئیں، جس کا اختتام 7 فروری 2007 کو مکہ معاہدے پر ہوا۔ ان کوششوں کے باوجود، تمام کوششیں بالآخر ناکام ہو گئیں، کیونکہ نہ تو فتح اور نہ ہی اسرائیل ایسی قرارداد کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے جو حماس کو مؤثر طریقے سے حکومت کرنے کی اجازت دے گی۔ اس ہنگامہ خیز سال کے اختتام تک، سیکورٹی افراتفری نے تقریباً 700 جانیں لے لی تھیں اور 3000 سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ عباس نے بار بار قبل از وقت انتخابات کرانے کے اپنے ارادے کا اعلان کیا، سیاسی عمل کو اس طرح سمجھتے ہوئے جیسے یہ ان کے یکطرفہ فیصلوں کے تابع ہو۔[1]

کشیدگی کے اس بھیانک سال نے مفاہمت کو تیزی سے ناقابلِ حصول محسوس کیا۔ فلسطینی اتھارٹی کے اداروں نے کنٹرول چھوڑنے یا حماس کی حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ باس نے ایک خصوصی فورس قائم کی جسے صدارتی گارڈ کے نام سے جانا جاتا ہے، جس نے 80 ملین ڈالر سے زیادہ امریکی مدد حاصل کی[2] اور اسے ایک فوجی مشیر کی نگرانی میں تربیت دی گئی۔ عباس نے حماس کے شدید مخالف محمد دحلان کو بھی سلامتی کے امور کے مشیر کے طور پر مقرر کیا اور اسے مؤثر طریقے سے وزیر داخلہ کا اختیار دے دیا۔ دحلان نے منظم طریقے سے آزاد وزیر داخلہ ہانی القواسمی کو کمزور کیا اور بالآخر انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] ان پیش رفتوں کا تفصیلی تجزیہ احمد سعید نوفل اور محسن صالح کے باب، "فلسطین لبریشن آرگنائزیشن پر حماس کا مؤقف اور اس کے = دھڑے، محسن صالح (ایڈ:) میں دیکھیں: اسلامی مزاحمتی تحریک حماس: فکر اور تجربے کا مطالعہ، صفحہ 2، صفحہ 2، صفحہ 2، صفحہ 2 ص 144 اور اس کے بعد

[2] حماس کی 2006 کی انتخابی کامیابی کے بعد محمود عباس اور فلسطینی اتھارٹی ((PA کو مضبوط کرنے کی کوششوں کے ایک حصے کے طور پر امریکہ نے فلسطینی صدارتی گارڈ کے لیے ٹریننز فراہم کیے تھے۔ اس اقدام میں اردن کے ساتھ تعاون شامل تھا، جہاں یہ تربیت ہوئی تھی، اور اسے اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کے لیے امریکی سیکورٹی کوآرڈینیٹر کی حمایت حاصل تھی۔ تربیت دینے والوں میں امریکی سیکورٹی ماہرین اور امریکی محکمہ خارجہ کے انٹرنیشنل نارکوٹکس اینڈ لا انفورسمنٹ افیئر بیورو ((INL کے تحت کام کرنے والے اہلکار شامل تھے۔ یہ پروگرام، جس کا مقصد ایک قابل اور پیشہ ور سیکورٹی فورس بنانا ہے، جس میں وی آئی پی تحفظ اور انسداد دہشت گردی پر توجہ دی گئی ہے۔ اگرچہ اس نے PA گورننس کو مستحکم کرنے کی کوشش کی، اس نے الفتح اور حماس کے درمیان کشیدگی میں بھی حصہ ڈالا، خاص طور پر گروہی جھڑپوں کے دوران۔

See: https://pdf.usaid.gov/pdf_docs/Pcaab579.pdf (CRS-4), and,
https://2001-2009.state.gov/documents/organization/113300.pdf

سیکورٹی کی صورت حال بدستور خراب ہوتی چلی گئی، جس کی وجہ سیکورٹی چوکیوں میں اضافہ اور قتل وغارت گری میں اضافہ ہوا۔ ایک خاصے سنگین ہفتے میں حماس کے 22 ارکان مارے گئے۔ 2006 کے اوائل اور 2007 کے وسط کے درمیان، حماس نے الفتح سے منسلک سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں اپنے 76 ارکان اور اس سے وابستہ افراد کی ہلاکتوں کی دستاویز کی ہے۔ مزید برآں، مکہ معاہدے پر دستخط کے بعد چار ماہ میں 462 پرتشدد واقعات ریکارڈ کیے گئے۔

اس موڑ پر، قسام بریگیڈز نے حماس کے سیاسی بیورو سے آزادانہ طور پر کام کرتے ہوئے، غیر معمولی صورتحال کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کیا۔ انہوں نے تل الحوا میں محمد دحلان کی حفاظتی حفاظتی فورس کے مرکزی ہیڈکوارٹر پر تیز اور ٹارگٹ حملہ کیا، جسے حزب اختلاف کا "اعصابی مرکز" سمجھا جاتا ہے۔ محض چند گھنٹوں کے اندر، مضبوط قلعہ ٹوٹ گیا، جس سے اس کے اہلکار یا تو بھاگتے، بے گھر، یا چھپتے ہوئے بکھر گئے۔

یہ فوجی قرارداد فلسطینی تاریخ کے اہم ترین لمحات میں سے ایک کے طور پر کھڑی ہے، جسے بہت سے لوگ غزہ کی حقیقی آزادی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد سے، غزہ فلسطین کا واحد حقیقی طور پر آزاد کردہ علاقہ رہا ہے اور عرب دنیا کا واحد مکمل طور پر آزاد علاقہ ہے۔

جوابی کارروائی میں، مغربی کنارے میں فلسطینی اتھارٹی (PA) اور الفتح فورسز نے حماس اور اس کے اداروں کے خلاف پرتشدد کریک ڈاؤن شروع کیا۔ محمود عباس نے اسماعیل ہنیہ کی حکومت کو برطرف کیا اور یکطرفہ طور پر ایک نئی انتظامیہ قائم کی جس کی سربراہی سلام فیاض ایک فرد نے کی جس پر آئینی اصولوں کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے انتخابات، ریفرنڈم یا قانون سازی کی منظوری کے بغیر اسرائیل اور امریکی مفادات سے مضبوط تعلقات پر تنقید کی گئی۔ اس پیش رفت نے اس کا آغاز کیا جسے فلسطینی ڈویژن کے نام سے جانا جاتا ہے: حماس نے آزاد کردہ غزہ کی پٹی کا کنٹرول سنبھال لیا، جب کہ فتح کے تحت PA نے اسرائیل کے زیر قبضہ مغربی کنارے پر اپنی گرفت برقرار رکھی۔

مغربی کنارے میں عباس کی انتظامیہ نے حماس کا مقابلہ کرنے کی آڑ میں مذہبی سرگرمیوں، خیراتی تنظیموں اور سماجی اقدامات کو دبانے میں اضافہ کرتے ہوئے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات اور سیکیورٹی کو آرڈینیشن دوبارہ شروع کیا۔ اس عرصے میں اسرائیل کے ساتھ مزاحمتی نیٹ ورکس کو ختم کرنے، کارکنوں کو گرفتار کرنے، انٹیلی جنس شیئر کرنے اور مشترکہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے بے مثال تعاون دیکھا گیا۔ مغربی کنارے کے فلسطینیوں کے لیے، اس نے ایک غیر معمولی سخت اور جابرانہ دور کا آغاز کیا۔[1]

ایک غیر معمولی اور بے مثال اقدام میں، الفتح نے غزہ کی پٹی میں سرکاری شعبے کے ملازمین کی تنخواہیں روکنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ وہ کام پر رپورٹ کرنے سے گریز کریں۔ دلیل یہ تھی کہ ملازمین اپنی ملازمتوں پر حاضر ہو کر غزہ پر حکومت حماس کی مدد کر رہے ہوں گے اور اس طرح ان کی تنخواہوں میں کٹوتی کی جائے گی۔ اس "زبردستی ہڑتال" نے حماس کے شعبے کو سنبھالنے کی صلاحیت میں شدید رکاوٹ ڈالی اور ساتھ ہی ساتھ الفتح کے وفاداروں کے انتظامی عہدوں کو بھی صاف کر دیا، صرف حماس کے وفادار یا جبر کی مخالفت کرنے والوں کو چھوڑ دیا۔

عرب حکومتوں نے بھی حماس کے خلاف اقدامات کئے۔ مصر نے رفح کراسنگ کو مکمل طور پر بند کر دیا اور غزہ کا مکمل محاصرہ کر دیا۔ سعودی عرب نے حماس کے فوجی قبضے کے بعد پہلے سال غزہ کے باشندوں کو حج کی ادائیگی سے روک دیا تھا۔ دریں اثنا، عرب اور مغربی حکومتوں نے سلام فیاض کی حکومت کے لیے مالی امداد

[1] فلسطینی اتھارٹی کے بارے میں بصیرت کے لیے درج ذیل کاموں سے رجوع کریں۔
مغربی کنارے میں پالیسیاں:
حماس میڈیا آفس، دی بلیک بک: "ڈیٹن اتھارٹی" کے طرز عمل کی ایک حقیقت کی تلاش اور دستاویزی دستاویز اور مغربی کنارے میں اس کے حفاظتی آلات کی خلاف ورزیاں (6/14/2007–6/15/2008)، پہلا ایڈیشن۔ غزہ: الیکٹرانک ورژن، 2008۔
محسن صالح (ایڈیٹر)، Clash of Wills: The Security Conduct of Fatah, Hamas, and Other Concerned Parties (2006–2007), پہلا ایڈیشن۔ بیروت: الزیتونہ سنٹر، 2008۔
اسر الافی، مزاحمت کا مقابلہ کرنے کی پالیسیاں: مغربی کنارے میں حماس بطور کیس اسٹڈی،
مصری انسٹی ٹیوٹ فار اسٹڈیز، 16 مارچ 2018۔

دوبارہ شروع کی، عباس کی انتظامیہ کو مضبوط کرنے اور مغربی کنارے میں مزاحمت کے خلاف کوششوں کو فنڈ دینے کے لیے گرانٹ اور امداد فراہم کی۔

اسرائیل نے غزہ پر اپنے حملوں میں اضافہ کر دیا، اسرائیل کے انخلاء کے بعد حماس کے غیر متوقع فوجی قبضے سے صدمہ ہوا۔ بہت کم لوگوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ غزہ سے اسرائیلی پسپائی کے نتیجے میں حماس کا کنٹرول ہو جائے گا، جس کی حمایت ایک زبردست انتخابی فتح کے جواز سے ہو گی۔ برطانوی قبضے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ فلسطینیوں نے زمین کے ایک ٹکڑے پر حکومت کی، اصولوں سے سمجھوتہ کرنے والوں اور حقوق کو ترک کرنے والوں کے بجائے مزاحمتی لیڈروں کے ساتھ۔

اگرچہ حماس نے محاصرے کا مقابلہ کیا، لیکن تحریک اور غزہ کے عوام دونوں کو ناکہ بندی کے تحت شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی، صحت اور تعلیمی شعبے تیزی سے بگڑ گئے، مختلف ترقیاتی منصوبے منہدم ہو گئے، اور سماجی حالات نمایاں طور پر خراب ہوئے۔ غربت اور بے روزگاری کی شرح آسمان کو چھونے لگی، پانی کی قلت سنگین ہو گئی، اور ادویات کی کمی اور طبی آلات کی درآمد پر پابندیوں کی وجہ سے بیماریاں پھیل گئیں۔ غزہ مؤثر طریقے سے دنیا کی سب سے بڑی اوپن ایئر جیل میں تبدیل ہو گیا۔

غزہ میں پانچ جنگیں

حماس کے فوجی استحکام کے بعد سے، غزہ ایک آزاد فلسطینی علاقے میں تبدیل ہو گیا ہے جس پر انتظامیہ کی حکومت ہے جو مزاحمت کو دبانے کی بجائے حمایت کرتی ہے۔ اس تبدیلی نے اپنے مخالفین کے لیے ایک سنگین خطرہ پیش کیا۔ اہم چیلنجوں کا سامنا کرنے کے باوجود، جیسے کہ تنخواہوں اور سامان کی فراہمی کو یقینی بنانا، مزاحمتی آپریشنز پروان چڑھے اور ترقی کرتے ہوئے، لچک اور اسٹریٹجک ترقی کے ایک نئے مرحلے کو نشان زد کیا۔

حماس نے مختلف طریقوں سے غزہ کے اندر اسرائیلی جاسوسی نیٹ ورکس کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ ان میں توبہ کرنے والے ساتھیوں کو معافی اور تحفظ کی پیشکش کرنا، دوسروں پر مقدمہ چلانا اور انہیں پھانسی دینا، اور کبھی کبھار اسرائیلی انٹیلی جنس کو گمراہ کرنے کے لیے مخبروں کو دوبارہ ملازمت دینا شامل ہے۔ تنظیم نے اپنی آپریشنل صلاحیتوں کو بڑھا کر، باہمی تعاون کو فروغ دے کر، اور مشترکہ آپریشن رومز اور کوآرڈینیشن کمیٹیوں کے قیام کے ذریعے مزاحمت کی ترقی میں سہولت فراہم کی۔ ان اقدامات نے اتھارٹی کی حکمرانی کی ذمہ داریوں اور اسرائیل کے ساتھ فوجی مشغولیت میں توازن رکھتے ہوئے متفقہ فیصلہ سازی کو یقینی بنایا۔

حکمرانی اور مزاحمت کا توازن حماس کے لیے اہم چیلنجز کا سامنا ہے، جس کی وجہ سے اسے غزہ کے سیاسی، سیکورٹی اور روزمرہ کے معاملات کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپنی فوجی صلاحیتوں کو بڑھانے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ غزہ کی جغرافیائی تنہائی اور سخت مصری ناکہ بندی کی وجہ سے یہ خاص طور پر چیلنجنگ تھا، جو اکثر اسرائیل کی پابندیوں سے زیادہ شدید تھا۔

فوجی کنٹرول کو مستحکم کرنے کے بعد سے، غزہ نے اسرائیل کے ساتھ چار بڑی جنگوں کا تجربہ کیا ہے: پہلی 2008 کے اواخر سے 2009 کے اوائل تک، دوسری 2012 میں، تیسری 2014 میں، اور چوتھی 2021 میں۔ ان تنازعات کے درمیان وقفے وقفے سے جھڑپیں اور اضافہ بھی ہوا۔

اسرائیل نے ان جنگوں کے دوران مسلسل حماس کو ختم کرنا یا اسے غزہ میں اقتدار سے بے دخل کرنا چاہا لیکن ہر بار ناکام رہا۔ اس کے برعکس، ہر تصادم نے مزاحمت کے ہتھیاروں اور تکنیکی مہارت میں قابل ذکر پیش رفت کا انکشاف کیا۔ دشمنی ختم کرنے کے لیے حماس کی بنیادی شرط غزہ کی بندرگاہ کا قیام اور اسے چلانے سمیت ناکہ بندی کا خاتمہ تھا۔ تاہم یہ مطالبہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔

غزہ میں حماس کے فوجی استحکام کی پیش گوئی کرنے والا پانچواں تنازعہ 2006 کی جنگ تھی، جس نے انتخابات میں داخل ہونے اور حکومت بنانے کے بعد بھی مزاحمت کے لیے تحریک کے غیر متزلزل عزم کا ایک طاقتور

ثبوت کے طور پر کام کیا۔ یہ فتح کی رفتار کے بالکل برعکس تھا، جس نے اپنے اصولوں کو ترک کر دیا تھا، تعاون کو قبول کیا تھا، اور اسرائیلی مفادات کا آلہ کار بن گیا تھا۔

جون 2006 میں مزاحمت نے ایک جرات مندانہ فوجی آپریشن کیا جس کے نتیجے میں اسرائیلی فوجی گیلاد شالیت کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس جرات مندانہ اقدام نے ایک شدید اسرائیلی جارحیت کو جنم دیا جس کا مقصد شالیت کو بازیافت کرنا، جنوبی اسرائیلی بستیوں کو نشانہ بنانے والے راکٹ لانچنگ انفراسٹرکچر کو ختم کرنا اور غزہ کے سرنگوں کے نیٹ ورک کو تباہ کرنا تھا۔ ان مقاصد کے باوجود، اسرائیل اپنے اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہا، اور تنازعہ نومبر 2006 میں جنگ بندی کے ساتھ ختم ہوا۔

اگر اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو ان جنگوں نے فلسطینیوں کو ہلاکتوں اور تباہی کے لحاظ سے غیر متناسب طور پر متاثر کیا۔ سطح پر، بہت زیادہ مادی نقصان بار بار شکست کے طور پر ظاہر ہو سکتا ہے۔ تاہم، یہ بیانیہ طاقت میں نمایاں عدم توازن اور دونوں فریقوں کے مختلف مقاصد کو نظر انداز کرتا ہے۔ مزاحمت، بقا، دشمن کو نقصان پہنچانا، اور اس کے مقاصد کو شدید فوجی اور سیاسی مجبوریوں میں ناکام بنانا غیر معمولی کامیابیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

مصر کے ثالث اور مخالف کے کردار نے بھی غزہ کی جدوجہد کو تشکیل دیا۔ مصری حکومت نے، جو مزاحمت کے سب سے بڑے دشمنوں میں سے ایک ہے، نے غزہ پر سخت ناکہ بندی کر دی۔ رفح کراسنگ کی بندش، جو کہ سامان اور افراد کے لیے واحد گیٹ وے ہے، نے انسانی بحران میں شدت پیدا کر دی۔ بجلی اور طبی آلات کے لیے ایندھن سمیت اہم سپلائیز کو سختی سے روک دیا گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر، غزہ کی آبادی کو ناقابل تصور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا: بجلی کی بندش اور ادویات کی قلت کی وجہ سے ہسپتال بند ہو گئے، سرجری معطل ہو گئی، اور بہت سے مریض بیرون ملک علاج کی اجازت کے انتظار میں مر گئے۔

غزہ کے لوگوں نے اپنی حکومت کے تعاون سے رفح کے فلسطینی اور مصری اطراف کے درمیان سرنگیں تعمیر کرنے کا رخ کیا (اصل میں ایک شہر جو کہ ایک برطانوی سرحد سے تقسیم ہونے سے پہلے تھا)۔ یہ

سرنگیں انکلیو کی واحد لائف لائن بن گئیں، جو سامان اور ضروری سامان کی نقل و حمل میں سہولت فراہم کرتی ہیں۔ فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی میں کھڑے ہونے کی توقعات کے باوجود، مصری حکومت نے "غیر جانبدار ثالثی" کا موقف اپنایا جس نے عملی طور پر اسرائیل کی حمایت کی اور مزاحمت پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا۔

حماس کے فوجی استحکام کے بعد مصر نے تحریک اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ایک بے مثال مہم شروع کی۔ مصری انٹیلی جنس نے حماس کے متعدد ارکان کو مصر سے گزرتے ہوئے گرفتار کیا، جن میں سے بعض کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا، جس سے ہلاکتیں ہوئیں۔ ہلاک ہونے والوں میں حماس کے ترجمان سامی ابو زہری کا بھائی یوسف ابو زہری بھی شامل ہے۔ ایک اور ایمن نوفل تھا، القسام بریگیڈز کے ایک سینئر کمانڈر، جنہوں نے 2011 کے مصری انقلاب کے دوران فرار ہونے تک شدید اذیتیں برداشت کیں۔

حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کے لیے ثالث کے طور پر کام کرتے ہوئے غزہ کی ناکہ بندی ہٹانے کی پیشین گوئی مصر اسرائیل کی تعمیل کو نافذ کرنے میں ناکام رہا۔ جب اسرائیل اپنے وعدوں سے مکر گیا تو مزاحمتی دھڑوں نے جنگ بندی کی تجدید سے انکار کر دیا۔ مذاکرات کے درمیان، اسرائیل نے 27 دسمبر 2008 کو ایک حیرت انگیز حملہ کیا، جس میں فلسطینی پولیس کیڈٹس کی گریجویشن تقریب پر حملہ کیا اور 100 سے زائد افراد کو ہلاک کر دیا۔ یہ حملہ اسرائیلی وزیر خارجہ زپی لیونی اور مصری صدر حسنی مبارک کے درمیان ہونے والی ملاقات کے صرف ایک دن بعد ہوا، جس میں مصر کے کردار پر سنگین سوالات اٹھائے گئے تھے۔

21 دن تک جاری رہنے والی اس جنگ نے غزہ کو تباہ کر دیا۔ 400 سے زائد بچے اور 100 خواتین سمیت 1300 سے زائد فلسطینی شہید اور 5000 سے زائد زخمی ہوئے۔ اس کے برعکس، اسرائیل نے نو ہلاکتوں کی اطلاع دی، حالانکہ مزاحمتی دھڑوں کا اندازہ ہے کہ تقریباً 80 اسرائیلی فوجی مارے گئے۔[1]

اس جنگ کا سب سے اہم نتیجہ اسرائیل کا غزہ کی پٹی پر دوبارہ قبضہ کرنے میں ناکامی تھا۔ غیر متوقع اور شدید مزاحمت کا سامنا کرتے ہوئے، وہ اپنی ناکہ بندی کی حکمت عملی پر واپس آتے ہوئے، غیر مشروط طور پر پیچھے

[1] محسن صالح، صفحہ 132-33۔

ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح، حماس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں، جس سے غزہ کے کردار کو مستحکم علاقے کے طور پر ایک بہت ہی اعلیٰ اسرائیلی فوجی قوت کا سامنا کرنا پڑا۔

تنازعہ کے درمیان، قطر کے امیر نے غزہ کی حالت زار پر توجہ دینے کے لیے عرب سربراہی اجلاس بلانے کی کوشش کی۔ تاہم، مصری حکومت نے سربراہی اجلاس میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کافی کوششیں کیں، بالآخر اسے ہنگامی عرب سربراہی اجلاس کے بجائے ایک نجی اجلاس میں تبدیل کر دیا۔[1] قابل ذکر بات یہ ہے کہ محمود عباس نے حماس کے رہنما خالد مشعل کی موجودگی پر اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے شرکت سے انکار کر دیا۔ عباس نے مشعل کی شرکت کو فلسطینی عوام کے واحد جائز نمائندے ہونے کے اپنے دعوے کے لیے ایک چیلنج کے طور پر دیکھا، یہ دعویٰ حماس کے فوجی استحکام کے بعد سے ان کا مرکزی مشغلہ تھا۔

اس جنگ کا سب سے خطرناک انکشاف یہ تھا کہ فلسطینی اتھارٹی اور مصری حکومت نے اسلامی مزاحمت بالخصوص حماس کی کس حد تک مخالفت کی۔ اس دشمنی نے حماس کو نہ صرف بیرونی دشمنوں بلکہ علاقائی اداکاروں کی طرف سے درپیش چیلنجوں کی نشاندہی کی۔

گولڈ اسٹون رپورٹ اسکینڈل کے دوران فلسطینی اتھارٹی کے متنازعہ اقدامات کی جانچ پڑتال کی گئی۔ رچرڈ گولڈسٹون، ایک جنوبی افریقی قانون دان نے غزہ پر اسرائیل کی جنگ میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی دستاویزی رپورٹ تیار کی۔ حیران کن طور پر فلسطینی اتھارٹی نے اس رپورٹ کی مخالفت کی۔ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ اسرائیل نے اسرائیلی وزیر دفاع ایہود باراک کے ساتھ ملاقات میں محمود عباس کی ایک ویڈیو جاری کرنے کی دھمکی دی تھی، جس کے دوران عباس نے مبینہ طور پر اسرائیل پر زور دیا تھا کہ وہ حماس کو بے دخل کرنے کے لیے غزہ کے خلاف اپنی فوجی مہم جاری رکھے۔

---

[1] مصری حکومت مسئلہ فلسطین کو ایک سٹریٹجک اثاثہ کے طور پر دیکھتی ہے جس پر خصوصی طور پر اس کے کنٹرول میں رہنا چاہیے اور اسے امریکہ کی نظروں میں اس کی اہمیت کو بڑھانے کے لیے دیکھنا چاہیے۔ اس اجارہ داری کو برقرار رکھنے کے لیے، مصر دوسری قوموں یا ثالثوں کی شمولیت کی سرگرمی سے مخالفت کرتا ہے۔ تاہم، اسرائیل کے غیر متزلزل موقف اور بڑھتی ہوئی اندرونی کمزوریوں نے بتدریج قطر اور ترکی کو فلسطینی کاز میں ثالثی کرنے میں بااثر کھلاڑی کے طور پر ابھرنے کی اجازت دی ہے۔ ان پیش رفتوں کے باوجود، مصر کا جغرافیائی فائدہ، خاص طور پر رفح کراسنگ پر اس کا اختیار، مسئلہ فلسطین کے انتظام میں اس کے غالب کردار کو مستحکم کرتا جا رہا ہے۔ یہ فائدہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ قاہرہ ایک اہم اداکار رہے جو اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہاں تک کہ دوسرے علاقائی کھلاڑی خود کو ثالث کے طور پر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

PA کی کارروائیوں کے مزید شواہد فلسطینی ایوان صدر کے سیکرٹری جنرل طیب عبدالرحیم اور اسرائیلی وزیر اعظم کے چیف آف سٹاف ڈوو ویسگلاس کے درمیان ایک افشا ہونے والی فون پر بات چیت کے ذریعے سامنے آئے۔ کال میں، عبدالرحیم نے مبینہ طور پر اسرائیلی فوج کو غزہ کے جبالیہ اور شطی پناہ گزین کیمپوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی، اور شہری جانوں کے ممکنہ نقصان کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ ان سب نے حماس کو ووٹ دیا، اس لیے انہوں نے اپنی قسمت کا انتخاب کیا۔

مصری حکومت نے بھی جنگ کے دوران ایک متنازعہ کردار ادا کیا۔ حماس کے خلاف میڈیا مہمات خفیہ کارروائیوں کے ساتھ مل کر کی گئیں۔ مبصرین کا خیال ہے کہ عمر سلیمان، مصر کے انٹیلی جنس چیف نے اسرائیلی اور امریکی مفادات سے وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو صدر حسنی مبارک کے جانشین کے طور پر کھڑا کرنے کی کوشش کی، جو اس وقت 80 سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ سلیمان نے قیدی اسرائیلی فوجی گیلاد شالیت کو تلاش کرنے کی کوششوں کو ترجیح دیتے ہوئے حماس اور اسرائیل کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے مذاکرات میں رکاوٹ ڈالی۔ اس کے اقدامات کا مقصد حماس سے فلسطینی قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک بڑے سودے بازی کے ہتھیار کو چھیننا تھا۔ مزید برآں، سلیمان نے خود اسرائیل کے مطالبے سے زیادہ سخت شرائط عائد کیں، فرانس اور جرمنی سمیت بین الاقوامی ثالثوں کی مداخلت کے باوجود تبادلے میں تاخیر ہوئی۔

جنوری 2011 میں جب مصری انقلاب برپا ہوا تو پورے خطے میں راحت پھیل گئی، جس سے حسنی مبارک کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور عمر سلیمان، جو حکومت کے آخری دنوں میں نائب صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس یادگار ہلچل سے پوری عرب دنیا ہل گئی تھی، اور اسرائیل کو مبارک کی معزولی سے ایک وجودی خطرہ محسوس ہوا تھا۔ اسرائیلی وزیر بنیامین بین الیزیر نے مشہور طور پر مبارک کو "اسرائیل کے لیے ایک سٹریٹجک خزانہ" کے طور پر بیان کیا، جبکہ سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر جارج ٹینٹ نے انھیں "دہشت گردی سے نمٹنے اور مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد شراکت داروں میں سے ایک" قرار

دیا۔ تاہم، امریکی سیکورٹی لغت میں، "دہشت گردی" کا ترجمہ اکثر اسلام سے ہوتا ہے، جب کہ "امن کی تلاش" اسرائیل کو بااختیار بنانے کا مترادف ہے۔

یہ ہنگامہ ایک اور زلزلے کے ساتھ مزید گہرا ہوا: مارچ 2011 میں شامی انقلاب کا آغاز۔ اس بغاوت نے اسد حکومت کے لیے ایک سنگین خطرہ پیدا کر دیا، جس نے چار دہائیوں سے گولان کی پہاڑیوں کی حفاظت کو برقرار رکھا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ مبارک حکومت کے خاتمے نے ایک اہم رکاوٹ کو ہٹا دیا، جس سے اکتوبر 2011 میں حماس کے لیے ایک تاریخی معاہدے پر بات چیت کی راہ ہموار ہوئی۔

عرب انقلابات کے عروج کے ساتھ فلسطین کی آزادی کا خواب پہلے سے کہیں زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ یہ خواہشات اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئیں جب مصر کے صدارتی انتخابات میں اخوان المسلمون نے فتح حاصل کی اور محمد مرسی کو اقتدار میں لایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے تاریخ تیز ہو گئی ہے اور دور دراز کے خواب اچانک پہنچ گئے ہیں، جس کی علامت مصری صدارتی محل میں حماس کے رہنماؤں کا پرتپاک استقبال تھا۔

مرسی، جنہوں نے جولائی 2012 میں صدارت کا عہدہ سنبھالا، ایک گہرے طور پر جڑے ہوئے ریاستی آلات پر اپنے اختیار کو مستحکم کرنے کے لیے جدوجہد کی، جس کی جڑیں تاریخی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی پر مبنی تھیں اور اسلام پسندوں کو دبانے کے لیے وقف تھیں۔ اسے گورننس کی پیچیدہ حرکیات کو نیویگیٹ کرنے میں اہم چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ امریکہ یا اسرائیل کے ساتھ تنازعات میں ملوث ہونے کے بارے میں محتاط تھا۔ اخوان المسلمون کی حکمت عملی نے بین الاقوامی طاقتوں کو یقین دلانا اور بتدریج اصلاحات کو ترجیح دی۔

ان حدود کے باوجود، مرسی کے دور صدارت میں فلسطینیوں پر بہت سی پابندیوں میں نرمی کی گئی، خاص طور پر محصور غزہ کی پٹی کے لیے واحد لائف لائن رفح بارڈر کراسنگ کے ذریعے نقل و حرکت کے حوالے سے۔ جب کہ کراسنگ اسی سیکورٹی اپریٹس کے کنٹرول میں رہی، جس نے ہتھیاروں یا مواد کی منتقلی پر پابندی عائد کر دی تھی جو ان کی تیاری میں مدد کر سکتے تھے، مرسی کا ایک ہی سال غزہ کے لیے سنہری دور بن گیا۔ اس

دوران، حماس بڑی مقدار میں ہتھیاروں کی اسمگلنگ میں کامیاب ہو گئی، انقلاب کے نتیجے میں کمزور مصری سیکورٹی فورسز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور یہ تصور کیا گیا کہ اسلام پسندوں کی قیادت میں دور آنے والا ہے۔ معمر قذافی کے زوال کے بعد کلیدی سامان بھی لیبیا کے ذخیرے سے آیا۔

اس اہم سال میں اسرائیل نے 14 نومبر 2012 کو القسام بریگیڈز کے نائب رہنما احمد جباری کو قتل کر دیا، جس نے 2007 میں غزہ کی ڈی فیکٹو آزادی کے بعد دوسری جنگ چھیڑ دی۔ سابقہ تنازعات کے برعکس، یہ جنگ ایک مصری حکومت کے تحت ہوئی جس نے غزہ کو سیاسی طور پر حمایت کی اور ایک کمزور عوامی ریاست کو متحرک کرنے کے لیے مصری حکومت کی حمایت کی۔ غیر یقینی ماحول نے اندیشوں کو بڑھا دیا کہ غیر چیک شدہ اضافہ وسیع پیمانے پر عدم استحکام کا باعث بن سکتا ہے۔ نتیجتاً، امریکی سفارت کاری نے تنازعہ کو روکنے کے لیے تیزی سے حرکت کی۔ جنگ بندی کا معاہدہ صرف ایک ہفتے کے اندر طے پا گیا، جس سے یہ غزہ پر سب سے کم اور مہنگی جنگ ہے۔ اس دشمنی میں 105 فلسطینیوں کی جانیں گئیں، تقریباً1000 زخمی ہوئے، اور اس کے نتیجے میں 4 اسرائیلی ہلاک اور 219 زخمی ہوئے۔

سنہرے سال کا اچانک اختتام ایک خونی فوجی بغاوت کے ساتھ ہوا جس نے 3 جولائی 2013 کو محمد مرسی کو اقتدار سے ہٹا دیا تھا۔ بغاوت کے رہنما نے اخوان المسلمون کے خلاف ایک وحشیانہ کریک ڈاؤن شروع کیا، جس سے چھ دہائیوں قبل کی سخت نصری مہمات کی بازگشت تھی۔ 14 اگست 2013 کو بدنام زمانہ رابع قتل عام میں ایک ہی دن میں اخوان کے تقریباً1000 ارکان مارے گئے، جس کا نام اس چوک کے نام پر رکھا گیا جہاں یہ ہوا تھا۔

غزہ کے سلسلے میں، نئی فوجی حکومت نے حماس اور غزہ کی پٹی کے ساتھ بنیادی دشمنوں کی طرح سلوک کیا، انہیں دبانے اور الگ تھلگ کرنے کی بے مثال کوششیں شروع کیں۔ اس مہم کا آغاز ناکہ بندی کو زیادہ سے زیادہ حد تک سخت کرنے اور رفح بارڈر کراسنگ کو عملی طور پر سیل کرنے سے ہوا۔ یہ فلسطینی رفح کو مصری رفح لائف لائنز سے جوڑنے والی سرنگوں کے نیٹ ورک کو ختم کرنے کے لیے ایک بھرپور فوجی آپریشن کے

ساتھ بڑھا جس کو مبارک کے دور سے طویل عرصے سے جاری زمینی ناکہ بندی کو روکنے کے لیے بڑھایا گیا تھا۔ مصری فوج نے تباہ کن ہتھکنڈوں کی ایک حد استعمال کی، بشمول دھماکہ، کھارے پانی یا آلودہ پانی سے سرنگوں کو سیلاب میں ڈالنا، اور زہریلی گیسوں کو تعینات کرنا۔ یہ مہم یہاں تک کہ اسمگلنگ کے تمام راستوں کو منقطع کرنے کے لیے مصری گاؤں رفح کو مسمار کر دیا گیا۔ مزید برآں، عبدالفتاح السیسی کی حکومت نے مستقبل میں سرنگوں کی کارروائیوں کو ناکام بنانے کے لیے ایک بڑی فولادی دیوار تعمیر کی، جس میں زیر زمین گہرائی تک پھیلی اور زمین کے اوپر بلندی تک پھیل گئی۔ غزہ کے لیے، بغاوت کے بعد کی دہائی بے لگام مشکلات اور مصیبتوں سے عبارت تھی۔

بغاوت کے ایک سال سے بھی کم عرصے کے بعد، اسرائیل نے 2014 میں غزہ پر اپنی تیسری جنگ شروع کی، جو اس سے پہلے کے تمام تنازعات میں سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس وقت مصری حکومت حماس کو کچلنے کی کوششوں میں اسرائیل کی طرح پرعزم دکھائی دی۔ پہلی بار، رفح کراسنگ کو غزہ میں دستیاب طبی امداد کی اشد ضرورت والے زخمیوں کے لیے بھی بند کر دیا گیا۔ مصر کے سیاسی اور میڈیا کے موقف نے اسرائیل کے جارحانہ انداز میں سختی سے ہم آہنگ کیا، جو ایک بے مثال تعاون کی نشاندہی کرتا ہے۔

چیلنجوں کے باوجود، مزاحمت کو اس جنگ کے دوران ایک غیر متوقع دھچکا لگا جب اس کے راکٹ اسرائیل کے اقتصادی اور انتظامی مرکز تل ابیب تک پہنچ گئے۔ جب کہ راکٹوں کی تباہ کن طاقت محدود تھی، وہ اسرائیل کی معیشت کو درہم برہم کرنے میں کامیاب ہو گئے، ہوائی اڈوں، سکولوں اور دیگر ضروری انفراسٹرکچر پر آپریشن روک دیا۔ ان راکٹوں کا بنیادی اثر کم فوجی اور زیادہ نفسیاتی اور معاشی تھا، جو مشکلات کے درمیان لچک کا پیغام دیتا تھا۔

یہ جنگ، جو آج تک کی سب سے شدید تھی، سب سے طویل بھی تھی، جو پچاس دنوں سے زیادہ جاری رہی۔ شدید بمباری کے بعد اسرائیلی افواج نے زمینی دراندازی کی کوشش کی لیکن غزہ کے محافظوں کی جانب سے شدید مزاحمت اور قابل ذکر استقامت کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ان کے مقاصد کو ناکام بنایا گیا۔ ثالثوں نے

جنگ بندی کی کوشش کی، لیکن مزاحمت نے مضبوطی سے غزہ کی ناکہ بندی اٹھانے کا مطالبہ کیا۔ اسرائیل، اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا، مزاحمت پر دباؤ ڈالنے کے لیے رہائشی عمارتوں کی اندھادھند تباہی کا سہارا لیا۔ بالآخر جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا۔

جنگ نے غزہ کے مسئلے کو حل کرنے میں فوجی کارروائی کے غیر موثر ہونے پر زور دیا، کیونکہ یہ علاقہ مضبوط اور زیادہ لچکدار ہوتا جارہا ہے۔ اس کے نتیجے میں، تمام جماعتوں نے سیاسی حکمت عملیوں کی طرف توجہ مرکوز کر دی، جس کے نتیجے میں غزہ سے نمٹنے کے لیے تین الگ الگ لیکن بعض اوقات اوورلیپنگ اپروچ سامنے آئے۔ ان حکمت عملیوں کو بیک وقت یا باری باری نافذ کیا گیا تھا:

1. **ناکہ بندی کو زیادہ سے زیادہ کرنا:** اس حکمت عملی نے ناکہ بندی کو انتہائی سخت کرنے کی کوشش کی، اسمگلنگ کے تمام ممکنہ راستوں کو بند کر دیا۔ اس کا مقصد غزہ کو اندرونی طور پر غیر مستحکم کرنا بھی تھا فتح کے کارندوں کا فائدہ اٹھا کر یا ٹارگٹڈ قتل کے لیے ISIS سے وابستہ افراد کی فہرست میں شامل کرنا، اندرونی بدامنی پیدا کرنا اور مزاحمتی حکومت کے لیے عوامی حمایت کو ختم کرنا۔
2. **کنٹرولڈ ریلیف:** اس نقطہ نظر نے غزہ کو معمولی معاشی ریلیف فراہم کرنے کے لیے پابندیوں میں محدود نرمی کی اجازت دی، بشمول سامان کے داخلے اور آزادانہ نقل و حرکت۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان چھوٹے فوائد کو مزاحمت کے دفاع کے لیے کافی قیمتی بنایا جائے، جبکہ یہ شرط لگائی گئی کہ غزہ کی آبادی، جو پہلے ہی دہانے پر ہے، اگر یہ کم سے کم مراعات بھی واپس لے لی گئیں تو وہ منہدم ہو جائیں گی۔
3. **علیحدگی اور پسماندگی:** اس حکمت عملی نے غزہ کو ایک پریشان کن انکلیو کے طور پر پیش کیا جسے نظر انداز کیا جائے گا، اس کے بجائے وسیع صہیونی ایجنڈے کو آگے بڑھانے پر توجہ دی جائے گی۔ اس میں بستیوں کی توسیع، یروشلم کو یہودیانا، اور مغربی کنارے کے باشندوں کی نقل مکانی کی منصوبہ بندی شامل ہے، جس سے غزہ کے مسئلے اور بڑے فلسطینی کاز کے درمیان عملی طور پر علیحدگی پیدا کرنا شامل ہے۔

ان حکمت عملیوں کو مصری حکومت نے فعال اور وسیع کیا، جس کی فعال اور سخت کوششیں حماس کو زیر کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ غزہ کی لائف لائن، رفح کراسنگ کو مزاحمت پر پھندے کو مضبوط کرنے کے لیے ہتھیار بنایا گیا، جس سے پٹی میں پہلے سے ہی سنگین حالات میں مزید اضافہ ہوا۔

ایک نرم، غیر تصادم کی پالیسی سے پیدا ہونے والی بڑھتی ہوئی چیلنجنگ صورتحال کے جواب میں، حماس نے کئی اہم اقدامات کیے، جن میں تین اہم اقدامات سامنے آئے:

1. **متحدہ حکومت کا حصول:** حماس نے فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ ایک قومی اتحاد کی حکومت بنانے کے لیے ایک معاہدے تک پہنچنے کی کوشش کی، جس نے غزہ پر مکمل کنٹرول چھوڑنے کی پیشکش کی۔ تحریک نے خاطر خواہ رعایتیں دینے کے لیے واضح آمادگی ظاہر کی۔ تاہم، فلسطینی اتھارٹی نے ایک ناقابل عمل شرط عائد کی: حماس کی مکمل تخفیف اسلحہ[1]۔ یہ شرط، جسے ہتھیار ڈالنے کے طور پر دیکھا جاتا ہے، کسی بھی صورت میں ناقابل قبول تھا۔ نتیجتاً، متحدہ حکومت کے قیام کی کوششیں ناکام ہو گئیں، غزہ کو حماس کے زیر انتظام چھوڑ دیا گیا یا زیادہ مناسب طریقے سے، حماس کو نظم و نسق اور انتظام کے چیلنجوں کا بوجھ پڑا۔
2. **"مارچز آف ریٹرن" کا آغاز:** اپنی حکمرانی کے خلاف بڑھتے ہوئے عوامی عدم اطمینان کو دور کرنے کے لیے، حماس نے "واپسی کے مارچ" کا تصور متعارف کرایا۔ ان مارچوں کا مقصد عوامی مایوسی کو اسرائیلی قبضے کی طرف موڑنا، فلسطینی کاز پر عالمی توجہ دلانا اور غزہ اور اس کے باشندوں کو پسماندہ کرنے کی کوششوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ مارچوں میں اسرائیل کے زیر کنٹرول علاقوں کی سرحدوں کے ساتھ بڑے پیمانے پر، پرامن مظاہرے شامل تھے، ان کے ساتھ مختلف سویلین کی قیادت میں، غیر فوجی کوششوں کے ذریعے ان سرحدوں کی خلاف ورزی کی گئی اور وہاں تعینات فورسز کو روکا گیا۔ غزہ کی حالت زار پر

[1] 2 اکتوبر 2017 کو مصر کے سی بی سی چینل کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران، محمود عباس نے کہا کہ غزہ میں کوئی غیر قانونی ہتھیار نہیں ہو گا اور وہ حزب اللہ ماڈل کی نقل قبول نہیں کریں گے۔ اس موقف کی بازگشت فلسطینی پولیس کے ڈائریکٹر جنرل حازم عطا اللہ نے 8 نومبر 2017 کو رام اللہ میں غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ ایک پریس بریفنگ کے دوران کہی، جہاں انہوں نے عباس کے موقف کا اعادہ کیا۔ دوسری جانب حماس کے سیاسی بیورو کے رکن خلیل الحیا نے 27 نومبر 2017 کو غزہ میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا، جہاں انہوں نے حالیہ پیش رفت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، جو کہ ان کی نظر میں اچھا نہیں تھا، پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مزاحمت کے ہتھیار ایک سرخ لکیر ہیں۔

محدود بین الاقوامی میڈیا اور سیاسی توجہ کے باوجود، مارچوں نے کامیابی کے ساتھ فلسطینی جدوجہد کے بارے میں کچھ بیداری پیدا کی اور عوامی غصے کو قابض کی طرف منتقل کیا، جسے بحران کی بنیادی وجہ کے طور پر شناخت کیا گیا۔

3. **مغربی کنارے میں مزاحمت کو بحال کرنا:** حماس نے مغربی کنارے میں مزاحمتی کوششوں کو زندہ کرنے پر توجہ مرکوز کی، جس کا مقصد اپنے مزاحمتی خلیوں کے نیٹ ورک کی تعمیر نو اور دوبارہ فعال کرنا ہے۔ اس علاقے پر پہلے اسرائیلی سکیورٹی فورسز اور پھر فلسطینی اتھارٹی کا بہت زیادہ کنٹرول ہو چکا تھا۔ 2006 کے آغاز سے، امریکہ نے ایک امریکی جنرل کیتھ ڈیٹن کی قیادت میں اردن میں تربیت کے لیے فلسطینی اتھارٹی کے اندر گروپوں کی نشاندہی کی، جن کا نام اس اقدام کا مترادف بن گیا۔ ان افواج کو فلسطینی اتھارٹی کا غیر سمجھوتہ کرنے والا نفاذ کرنے والا بازو بننے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا، جو مزاحمت کو کمزور کرنے میں گہرا حصہ ڈالتی ہیں۔ یاسر عرفات کے دور کے برعکس، جب اتھارٹی کے بعض ارکان نے کبھی کبھار مزاحمتی سرگرمیوں پر آنکھیں بند کر لیں یا امن مذاکرات کے خاتمے اور انتفاضہ کے پھٹنے کے دوران محدود حمایت کی پیشکش کی، ڈیٹن کے پروگرام نے اس طرح کے استثناء کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

ڈیٹن اور اس کے جانشینوں نے کامیابی کے ساتھ ایسے کارکنوں کو تربیت اور تعینات کیا جو اپنے تعاون اور دھوکہ دہی کی وجہ سے بدنام ہوئے،[1] فلسطینی اتھارٹی کے نفاذ کے طور پر کام کیا۔ یہ طاقتیں اکثر مغربی کنارے میں فلسطینی آبادی پر اسرائیلی قبضے سے زیادہ جابرانہ تھیں، منظم طریقے سے مزاحمتی نیٹ ورکس کو ختم کر رہی تھیں اور مزاحمتی کوششوں کے بنیادی ڈھانچے کو تباہ کر رہی تھیں۔

اس گھٹن کے ماحول کے درمیان، مٹھی بھر افراد شہدا کے طور پر ابھرے، چھرا گھونپنے یا فائرنگ کے حملے کرتے ہوئے۔ جب کہ کچھ اپنے اہداف کو مارنے یا زخمی کرنے میں کامیاب رہے، باقی ناکام رہے۔ تاہم، ان کی قسمت پر

[1] دیکھیں کونڈولیزا رائس، صفحہ 652؛ رابرٹ گیٹس، ڈیوٹی: جنگ میں سیکرٹری کی یادداشتیں، صفحہ 346۔ گیٹس سابق امریکی وزیر دفاع اور سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کے ڈائریکٹر ہیں۔

ہمیشہ مہر ثبت تھی: وہ یا تو فوری طور پر، تعاقب کے چند گھنٹوں کے اندر، یا زیادہ سے زیادہ، کچھ دنوں بعد مارے گئے۔ اسرائیلی قبضے اور فلسطینی اتھارٹی دونوں کے زبردست سیکورٹی تسلط نے مزید کامیابیوں کو تقریباً ناممکن بنا دیا۔

بہرحال، خلاف ورزی کی ان مسلسل کارروائیوں نے مغربی کنارے میں مزاحمت میں نئی جان ڈالی، جس نے ایک طویل عرصے تک جبر اور جمود کے بعد حیات نو کی جھلک پیش کی۔

ان اقدامات کی تشخیص وسیع پیمانے پر مختلف ہوتی ہے۔ دستیاب وسائل کے عینک کے ذریعے ان کا تجزیہ کرنے والے انہیں قابل ذکر نتائج حاصل کرنے والے کے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم، جب وسیع تر مقاصد کے خلاف فیصلہ کیا جاتا ہے، تو وہ ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہ کوششیں فلسطینی مقصد کو نمایاں طور پر آگے بڑھانے یا غزہ کے حالات کو وسیع تر فلسطینی جدوجہد سے دوبارہ جوڑنے میں ناکام رہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ غزہ کے لیے بنیادی مطالبہ -ناکہ بندی کا خاتمہ ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے، جس میں مستقبل قریب میں پیش رفت کے بہت کم اشارے ملے ہیں۔

اس وقت کے دوران، حماس کے حفاظتی آلات نے بدامنی کو بھڑکانے، ٹارگٹ کلنگ کو انجام دینے، اور فتح اور آئی ایس آئی ایس (داعش) سے کارکنوں کو بھرتی کرنے کی کوششوں کو کامیابی کے ساتھ بے اثر کر دیا، جس سے اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی دونوں کے منصوبے مؤثر طریقے سے پٹڑی سے اتر گئے۔

اس کے نتیجے میں نہ تو اسرائیل نے غزہ میں اپنے تزویراتی مقاصد حاصل کیے اور نہ ہی حماس ناکہ بندی کو توڑنے، اندرونی تقسیم کو مزید گہرا کرنے یا غزہ کو فلسطینی کاز سے الگ تھلگ کرنے کی کوششوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس تعطل کا سامنا کرتے ہوئے، حماس نے جنگ شروع کرنے کا بے مثال قدم اٹھایا، 2021 میں یروشلم کی تلوار مہم کا آغاز کیا۔

یہ حماس کی پہلی جارحانہ جنگ تھی، جس کا اشارہ یہودیت کے بڑھتے ہوئے خطرات، بشمول اسرائیل کی طرف سے منصوبہ بند اشتعال انگیز فلیگ مارچ کے ذریعے کیا گیا۔ قسام بریگیڈز کے کمانڈر محمد دیف کی جانب سے جاری

کردہ انتباہ کو اسرائیل کی جانب سے نظر انداز کیے جانے کے بعد حماس نے راکٹ داغنا شروع کر دیا۔ 11 دن تک جاری رہنے والے اس تنازعے کے نتیجے میں 200 سے زائد فلسطینی شہید ہوئے، جب کہ اسرائیل نے 13 ہلاکتوں کی اطلاع دی۔

جنگ نے ایک زبردست پیغام دیا: غزہ مسجد اقصیٰ کے دفاع کے لیے پہل کر سکتا ہے، اور یروشلم کے پاس اب ایک استعاراتی تلوار غزہ سے چلانے کے لیے تیار تھی۔ یہ اہم دعویٰ یروشلم کی جنگ کی تلوار کی وضاحتی میراث بن گیا۔

الاقصیٰ سیلاب (طوفان الاقصیٰ)

"یروشلم کی تلوار" جنگ کے اختتام کے بعد سے، اسرائیل نے مسجد اقصیٰ کے تقدس کی مسلسل خلاف ورزی کی ہے، اور اس تنازع سے مزاحمت کی کامیابیوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان اشتعال انگیزیوں میں رمضان کے دوران مسجد پر دھاوا بولنا، نمازیوں پر حملہ کرنا اور تراویح کی نماز کے دوران بھی سخت پابندیاں عائد کرنا شامل تھا۔ تاہم، غزہ میں مزاحمت نے توقع سے کم شدت کے ساتھ ردعمل ظاہر کیا، خاص طور پر "یروشلم کی تلوار" کے بعد بڑھی ہوئی توقع کے پیش نظر۔ ان کا ردعمل زیادہ تر مذمت اور دھمکیوں تک محدود تھا، جسے اسرائیل نے مسجد اقصیٰ پر اپنے مکمل تسلط کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسترد کر دیا، ظاہری معافی کے ساتھ کام کیا۔

اس نے اسرائیل کو یہ یقین دلایا کہ حماس کو مؤثر طریقے سے روکا گیا ہے اور اب وہ ایک "عقلی مخالف" ہے جو لاپرواہی کے اقدامات میں شامل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس تاثر سے خوش ہو کر، اسرائیل نے مغربی کنارے میں فوجی اور سکیورٹی آپریشنز کو تقویت دینے کے لیے غزہ کے قریب تعینات اپنی کئی افواج کو دوبارہ تعینات کر دیا۔

اس مفروضے کو ڈرامائی طور پر ہفتہ 7 اکتوبر 2023 کی صبح ناکام بنا دیا گیا۔ سینکڑوں مزاحمتی جنگجوؤں نے اسرائیل کے متعدد علاقوں کو نشانہ بنانے والے ایک بڑے راکٹ بیراج کے درمیان غزہ کی بھاری قلعہ بندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک بڑے پیمانے پر حملہ کیا۔ انہوں نے درجنوں بستیوں میں گھس کر 1,000 سے زیادہ اسرائیلیوں کو ہلاک کیا، بنیادی طور پر فوجی اہلکار، اور غزہ ڈویژن پر قبضہ کر لیا، اس کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر لیا، اور سینکڑوں اسرائیلی اسیروں کے ساتھ غزہ واپس آ گئے۔ حملے کا وقت غزہ کی سرحد کے قریب ایک کنسرٹ کے ساتھ موافق تھا، جس کا اہتمام اسرائیلی پرفارمنس گروپس نے کیا تھا، نادانستہ طور پر شرکاء کو پکڑنے کے لیے آسان ہدف بنا رہے تھے۔

مزاحمت کے قریبی ذرائع کے مطابق، آپریشن کو ابتدائی طور پر ایک دن تک جاری رکھنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے تمام مقاصد حیران کن طور پر صرف چھ گھنٹے میں حاصل کر لیے گئے۔ اس نازک ونڈو کے دوران، اسرائیلی دفاعی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا، حملے کے پیمانے یا نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، جو اسرائیل کی تاریخ کے سب سے بے مثال اور تباہ کن حملوں میں سے ایک ہے۔

اپنے محدود وسائل اور 17 سالہ محاصرے کی قید کے باوجود، غزہ میں مزاحمت نے اسرائیل کو بے مثال شدت کا ایک دھچکا پہنچایا، جو کہ مشترکہ عرب فوجوں نے بھی کبھی حاصل نہیں کیا تھا۔ اس حملے میں اسرائیل کی تاریخ میں ایک دن میں سب سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اسرائیل، اپنے جدید ترین حفاظتی آلات کے ساتھ غزہ پر چوبیس گھنٹے نگرانی کرتا ہے، اتنے بڑے پیمانے پر آپریشن کے کسی بھی نشان کا پتہ لگانے میں ناکام رہا۔ اس کی انتہائی مضبوط حفاظتی باڑ، سینسرز، حفاظتی تدابیر اور نگرانی کی متعدد پرتوں سے لیس، بالکل غیر موثر ثابت ہوئی، یہ سراب جارحانہ کارروائی کو روکنے کے قابل نہیں تھا۔

مزاحمت کا بنیادی مقصد قیدیوں کے تبادلے کو محفوظ بنانا تھا جو اسرائیلی جیلوں سے تمام فلسطینیوں کی رہائی کا باعث بنے۔ تاہم، حملے کے پیمانے، شدت اور حیرت نے اسرائیل کی شدید جوابی کارروائی کو اکسایا، جس نے مغربی ممالک کی طرف سے فوری مداخلت کی، جس کی سربراہی امریکہ کر رہی تھی۔ امریکی صدر نے اسرائیل کا دورہ

کرنے کے لیے جلدی کی، ان کے ساتھ اعلیٰ عہدے دار، بشمول دفاع اور ریاست کے سیکریٹریوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ فوجی اور انٹیلی جنس شخصیات بھی شامل تھیں۔ امریکہ نے اپنے دو سب سے بڑے طیارہ بردار بحری جہاز بھی بحیرہ روم میں تعینات کیے ہیں، جس نے ایک سخت انتباہ جاری کیا ہے تاکہ کسی بھی علاقائی اداکار کو تنازع میں شامل ہونے سے روکا جاسکے۔ اس ردعمل نے ایک حیران کن حقیقت کو سامنے لایا: اسرائیل، ایک مضبوط طاقت کے طور پر اپنی خود کی تصویر کے باوجود، ہلکے ہتھیاروں سے لیس مزاحمتی جنگجوؤں کے ایک چھوٹے سے گروپ کے ذریعے، جو محصور اور وسائل کی کمی کے ماحول میں کام کر رہے ہیں، مارا اور ہلا سکتا ہے۔

"ال اقصیٰ سیلاب" کے بارے میں کوئی حتمی بیان پیش کرنا قبل از وقت ہے کیونکہ واقعات سامنے آرہے ہیں۔ پھر بھی، اب تک جو کچھ ہوا وہ غزہ کی تاریخ کے ایک یادگار باب کی نمائندگی کرتا ہے۔ تحریر کے وقت، جنگ نے 36,000 سے زیادہ غزہ کے لوگوں کی جانیں لی ہیں اور تقریباً 90,000 زخمی ہوئے ہیں۔ اس کشمکش میں بے نقاب سچائیاں ہیں جو کبھی دھندلی یا نظر انداز کر دی گئی تھیں، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں سوائے ان لوگوں کے جن کے دل اور بصارت انکار کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

اس جنگ نے صہیونیوں اور ان کے اتحادیوں کی طرف سے سفاکیت، خونریزی اور غیر انسانی سلوک کی گہرائی کو آشکار کیا۔ انہوں نے اندھا دھند ہسپتالوں، مساجد، گرجا گھروں، پناہ گاہوں، خیمہ بستی بے گھر افراد، انسانی امداد کی تنظیموں، اور یہاں تک کہ پانی کی صفائی اور ہسپتال کے آپریشنز کے لیے ضروری پانی کے کنویں اور پاور جنریٹر جیسے اہم انفراسٹرکچر کو بھی نشانہ بنایا۔ میدانی قتل عام کیا گیا، متاثرین کو اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا، قبروں کی بے حرمتی کی گئی، اور نوزائیدہ بچوں بشمول قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کو بھوک اور سردی سے ہسپتال کے بستروں پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

اس تنازعہ نے اسرائیل کے لیے امریکہ کی سربراہی میں مغربی ممالک کی غیر متزلزل حمایت پر بھی زور دیا۔ یہ حمایت اسلحے، گولہ بارود، اور میزائلوں کے مسلسل بہاؤ سے ظاہر ہوتی ہے، ماہرین کے نیٹ ورک کے ساتھ، انٹیلی جنس آپریٹو، اور نگرانی کے نظام کو قیدیوں اور مزاحمتی رہنماؤں کا پتہ لگانے کے لیے تعینات کیا جاتا ہے۔

حمایت بین الاقوامی اور ملکی دونوں محاذوں پر مربوط سیاسی، میڈیا اور قانونی کوششوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس حمایت کی ڈھٹائی نے ایک بے مثال، کھلی پیچیدگی کا پردہ فاش کیا، جس سے ایک غیر فلٹر شدہ اور عجیب و غریب تعصب کا انکشاف ہوا۔

مزید بر آں، اس جنگ نے مخصوص عرب حکومتوں، خاص طور پر مصر، اردن، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی غداری اور اخلاقی زوال کو بے نقاب کیا۔ ان ریاستوں نے فعال طور پر اسرائیل کی حفاظت کی اور یمن کے باب المندب آبنائے کے قریب حوثیوں کے حملوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی رکاوٹوں کو روکنے کے لیے اس کی سپلائی کے لیے متبادل سمندری اور زمینی راستوں کی سہولت فراہم کی۔ ان کے ارادے واضح ہو گئے کیونکہ انہوں نے حماس اور غزہ میں مزاحمت کو تیزی سے ختم کرنے کی اسرائیل کی کوششوں کی کھل کر حمایت کی۔ اردن نے اسرائیل کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے مضبوط سرحدی حفاظتی اقدامات کو تقویت دی، جب کہ مصر نے لوگوں اور سامان کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتے ہوئے، اسرائیلی ہدایات کے تحت رفح کراسنگ کو سختی سے کنٹرول کیا۔ یہاں تک کہ غزہ میں پھنسے ہوئے مصری شہریوں کو بھی واپسی کے لیے اسرائیلی رضامندی کی ضرورت تھی، اور فلسطینیوں کو 5,000 ڈالر سے لے کر 10,000 ڈالر فی شخص تک، صرف باہر نکلنے کے لیے، دھوکہ دہی اور استحصال کی علامت کے طور پر بے تحاشا فیسوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس جنگ نے بین الاقوامی اداروں کے مفلوج اور پیچیدگی کو بھی ننگا کر دیا۔ اقوام متحدہ، اپنے انسانی، صحت اور قانونی ہتھیاروں کے ساتھ، ہلاکتوں کی تعداد کا حساب لگانے، رپورٹیں تیار کرنے، اور کمزور مذمت جاری کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین پر ان کی کارروائیاں مکمل طور پر اسرائیلی صوابدید سے مشروط تھیں، جس نے عالمی حکمرانی کی نظامی ناکامیوں اور اسرائیل کے ایجنڈے پر غیر چیک شدہ غلبہ کو بے نقاب کیا۔

عرب اور عالم اسلام کی اپنے بھائیوں کی مدد اور مدد کرنے میں بے بسی دردناک طور پر واضح ہو گئی۔ انہیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا کہ ان کے اقدامات ان کی حکومتوں کی مقرر کردہ حدود تک کیسے محدود تھے۔ احتجاج صرف اس صورت میں ممکن تھا جب اجازت ہو، اور سوشل میڈیا پر اظہار رائے کی اجازت صرف سخت حدود میں تھی۔

کچھ مکمل طور پر خاموش تھے، آن لائن پلیٹ فارم پر بھی بولنے یا لکھنے سے قاصر تھے۔ اس دلخراش حقیقت نے ان کی طاقت یا کمی کی اصل حد کو ظاہر کیا اور ان حکومتوں نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ بے شک اللہ کے سوا کوئی طاقت اور طاقت نہیں جو سب سے بلند اور عظیم ہے۔

فلسطین کی جدید تاریخ سے بصیرت

فلسطین کی تاریخ ایک گہرا اور پیچیدہ ٹیپسٹری ہے، جو اسباق اور عکاسی سے بھری ہوئی ہے۔ جتنا گہرائی سے اس کی کھوج کرتا ہے، پچھلی دو صدیوں میں دنیا کی حرکیات کے بارے میں اتنی ہی زیادہ بصیرت ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ فلسطینی کاز دنیا کی اہم ترین جدوجہد، مذہبی، تاریخی، فکری، سیاسی اور قانونی طور پر یکجا ہے۔ درج ذیل اہم ترین نکات ہیں جو اس بھرپور اور کثیر جہتی تاریخ سے توجہ مرکوز کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

تاریخی اور فکری بصیرت

تاریخی حکایتیں اکثر بکھری اور منقسم رہتی ہیں جب تک کہ وہ اسباق اور تشریحات کے ساتھ نہ ہوں جو ان کو ایک مربوط مکمل میں بناتی ہیں۔ ان واقعات سے درج ذیل کلیدی بصیرتیں ابھرتی ہیں:

1. یروشلم کے لیے جدوجہد بلاشبہ مذہب میں جڑی ہوئی ہے، مذہبی محرکات سب سے زیادہ طاقتور اور واضح محرک قوتوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ پوری تاریخ میں، جنہوں نے اس مقدس مقصد کے لیے جدوجہد کی ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں یا یہودی اپنے عقیدے کے نام پر۔ اگرچہ کچھ انفرادی جنگجوؤں نے دنیاوی فائدے کی کوشش کی ہو گی، اور حکمرانوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں نے اکثر شان و شوکت یا علاقائی توسیع کی کوشش کی ہو، لیکن انہوں نے ہمیشہ اپنے عزائم کو مذہب اور تقدس کی چادر میں ڈھانپ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یروشلم کی گہری مذہبی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی وہ

جنگجوؤں کو اپنے گھروں سے نکال سکتے ہیں اور انہیں اس کے دفاع میں اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لانے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

تھیوڈور ہرزل نے ابتدا میں یہودیوں کے وطن کے قیام کے لیے مختلف مقامات پر غور کیا، لیکن اس نے جلد ہی تسلیم کر لیا کہ صرف یروشلم واپسی ہی یہودی لوگوں کو اپنے پیچھے متحد کر دے گی۔ اسی طرح، صلیبی جنگوں کے دوران، جب کہ کچھ یورپی بادشاہوں نے دودھ اور شہد سے بہنے والی زمینوں کا خواب دیکھا ہو گا، وہ صرف مسیح کے مقبرے کے دفاع کے لیے اپیل کر کے ہی فوجیں جمع کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ قبلہ اول کے طور پر یروشلم کی گہری مذہبی اہمیت کے بغیر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے سفر کی جگہ، اور آپ کے معراج کے معاملے میں ایک ہی وزن نہیں ہو گا۔

ایسا لگتا ہے کہ خدا کا حکم ہے کہ یہ سچائی واضح طور پر واضح ہو۔ فلسطین نہ تو سب سے زیادہ زرخیز زمینوں میں سے ہے اور نہ ہی مصر یا عراق جیسے دریاؤں میں بکثرت ہے۔ اس میں خلیجی ریاستوں کے تیل اور معدنی دولت کی کمی ہے۔ تاہم، یہ بغداد، قاہرہ، ریاض، یا دوسرے شہروں سے زیادہ دلوں کو موہ لیتا ہے اور زیادہ توجہ دیتا ہے۔

یہودیوں کے لیے مذہبی نعرے لگانا مضحکہ خیز اور غدار دونوں ہے جب کہ مسلمان تاریخی زمینی دعووں، انسانی حقوق، یا خود ارادیت کے بارے میں سیکولر بیان بازی کے ساتھ جواب دیتے ہیں، ایسے دلائل جو اس بے رحم دنیا میں عمل کی ترغیب دینے یا وزن اٹھانے میں ناکام رہتے ہیں۔

جب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کیا تو موسیٰ دایان نے اعلان کیا، "اگر تورات ہمارے پاس ہے، اور ہم تورات والے ہیں، تو ہم تورات کی سرزمین کے حقیقی مالک ہیں جو یروشلم، ہیبرون، جیریکو اور آس پاس کے علاقوں کے پادریوں اور بزرگوں کی سرزمین ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے خواب کی تکمیل ہے۔[1] اسی طرح، میناچم بیگن نے اپنی یادداشتوں میں اپنے اٹل عقائد کو بیان کیا، "تقسیم کے معاہدے پر دستخط کالعدم ہے اور یہودیوں کو پابند نہیں

[1] یروشلم پوسٹ، شمارہ 10 اگست 1967۔

کرتے۔ یروشلم ہمارا ابدی دارالحکومت تھا اور رہے گا، اور اسرائیل کی سرزمین ایک بار پھر اس کے تمام لوگوں کی ہمیشہ کے لیے ہو گی۔[1]

کیا اقوام متحدہ کے چارٹروں، سلامتی کونسل کی قراردادوں، یا بین الاقوامی عدالت انصاف کی سفارشات کی اپیلوں کے ساتھ اس طرح کے پر عزم بیان بازی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

اس جدوجہد میں مذہب ایک ایسی چیز فراہم کرتا ہے جس کی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ہے جس کی امید صرف ایمان ہی دے سکتا ہے۔

ایرک ہوفر نے حیرت سے نوٹ کیا کہ نازی جرمنی میں بغیر کسی مزاحمت کے جن یہودیوں کو گیس چیمبروں اور اجتماعی پھانسی کی طرف لے جایا گیا وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے بعد میں فلسطین میں زبردست لڑائی لڑی۔ بہت سے لوگ اپنی اُمیدوں کی تکمیل کو دیکھے بغیر ہی مر گئے، پھر بھی وہ اُس خواب کے لیے انتھک جدوجہد کرتے رہے جو وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ اس کے برعکس، دوسروں نے اس حقیقت کا دفاع کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور ہلاک ہو گئے۔[2]

یہ امید بالکل وہی ہے جو اسرائیلی سیکورٹی نظریے کے علمبردار Zeev Jabotinsky کو پریشان کر رہی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب تک عربوں میں امید کی ایک چنگاری برقرار رہے گی، اسرائیل کا مستقبل غیر یقینی رہے گا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ امید فلسطین کے اسرائیل میں تبدیل ہونے کے خلاف ان کی مزاحمت کو ہوا دے گی۔ اس طرح، اس نے ایک حفاظتی حکمت عملی تیار کی جس کا مقصد اس امید کو مکمل طور پر ختم کرنا تھا۔ اس کا نقطہ نظر زبردست، تیز اور ناگزیر روک تھام پر انحصار کرتا ہے، اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ سزا دینے اور پیشگی سزا دینے کی اسرائیل کی طاقت عرب مزاحمت کے کسی بھی موقع کو کچل دے گی۔

---

[1] میناچیم بیگن، p.335

[2] ایرک ہوفر، دی ٹرو بیلیور: تھوٹس آن دی نیچر آف ماس موومنٹس، پی پی 118، 130 [عربی ایڈیشن]۔

اگر اسرائیل نے ایسے ہی حالات میں غیر مسلم آبادی کا مقابلہ کیا ہوتا تو اس کا سیکورٹی نظریہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ تاہم، اس کا چیلنج ایک ایسی آبادی کا سامنا کرنے میں ہے جو اس عقیدے میں گہری جڑی ہوئی ہے جو حتمی فتح کی ضمانت دیتا ہے، ان کی مسجد میں واپسی، یہودیوں کے تعمیر کردہ ڈھانچے کو ختم کرنا، اور ایک ایسی جنگ جہاں فطرت بھی، درختوں اور پتھروں کی علامت ہے، ان کے مقصد میں شامل ہو جاتی ہے۔

یہ روحانی لچک، جو ایمان سے چلتی ہے، وہ واحد قوت ہے جو اسرائیل کی سلامتی کی حکمت عملیوں کو چیلنج کرنے اور وسیع تکنیکی تفاوت کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ فلسطینی کاز کے سیکولر یا ملحد حامی، جو قوم پرستی، نظریے یا انسانی حقوق سے متاثر ہیں، اکثر خود کو مذہبی جذبات کو جنم دینے پر مجبور پاتے ہیں، کیونکہ اس جدوجہد کو برقرار رکھنے میں کوئی دوسرا ڈرائیور اس کی تاثیر سے مطابقت نہیں رکھتا۔

2. تاریخ بتاتی ہے کہ یروشلم کی تقدیر کا فیصلہ اس کی دیواروں کے اندر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اس کے بجائے، یہ مسلم دنیا کی وسیع تر جیونت کی عکاسی کرتا ہے، خاص طور پر پڑوسی دارالحکومتوں جیسے قاہرہ اور دمشق کی طاقت۔ یہ شہر یروشلم کی حیثیت اور حالت کو نمایاں طور پر متاثر کرتے ہیں۔

صحابہ کرام نے اس حکمت عملی کی مثال دی۔ انہوں نے یروشلم پر دمشق کو ترجیح دی، مؤخر الذکر کے تقدس اور قربت کے باوجود، یہ سمجھتے ہوئے کہ بازنطینی طاقت دمشق میں لنگر انداز تھی۔ رجب 14 ہجری میں دمشق فتح ہونے کے بعد ربیع الآخر 16 ہجری میں یروشلم کی آزادی سیدھی ہو گئی، صرف ڈیڑھ سال میں ان اہم واقعات کو الگ کیا گیا۔

پہلی صلیبی جنگ کے دوران یروشلم صلیبیوں کے قبضے میں نہیں آیا جب تک کہ مسلم دنیا دو حریف خلافتوں کے درمیان ٹوٹ نہیں گئی تھی: بغداد میں سنی عباسی خلافت اور قاہرہ میں شیعہ اسماعیلی فاطمی خلافت۔ اس تقسیم نے لیونٹ میں ایک جیو پولیٹیکل فالٹ لائن بنائی، جس میں سلجوقوں کے تحت دمشق، بغداد کے ساتھ منسلک، اور فاطمیوں کے تحت قاہرہ۔ اس تقسیم نے صلیبیوں کو 492 ہجری / 1099 عیسوی میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے قابل بنایا۔

جروشلم پر دوبارہ قبضہ کرنے کی مسلمانوں کی کوششیں اسی وقت کامیاب ہوئیں جب مصر اور لیونٹ کے درمیان اتحاد بحال ہوا۔ یہ سلسلہ عماد الدین زنگی سے شروع ہوا، جو اس کے بیٹے نورالدین کی قیادت میں آگے بڑھا، اور صلاح الدین ایوبی (صلاح الدین) پر اختتام پذیر ہوا۔ ایک بار جب یہ اتحاد حاصل ہو گیا تو، یروشلم کو تین سال کے اندر، رجب 583 ہجری / 1187 عیسوی میں آزاد کر دیا گیا۔

مصر اور لیونٹ کے درمیان تقسیم کے ادوار نے، تاہم، صلیبیوں کو یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اجازت دی۔ ایوبی دور کے دوران، مصر کے سلطان الکامل نے اپنے بھائی، لیونٹ کے سلطان المعظم عیسیٰ کے خلاف صلیبیوں کے ساتھ اتحاد کیا۔ 624 ہجری (1229 عیسوی) میں الکامل نے ایک پر امن معاہدے کے تحت یروشلم کو فریڈرک دوم کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد صلیبی قبضہ 641ھ / 1244 عیسوی میں ہوا، جس کی قیادت الناصر داؤد نے کی۔

یروشلم کی سلامتی اس وقت بحال ہوئی جب 642 ہجری / 1244 عیسوی میں نجم الدین ایوب کے تحت مصر اور لیونٹ کو دوبارہ ملایا گیا۔ اگلی چھ صدیوں تک، مملوکوں اور بعد میں عثمانیوں کے دور میں، یروشلم اس وقت تک محفوظ رہا جب تک کہ مصر اور لیونٹ سیاسی طور پر متحد رہے۔

پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد یہ شہر 1366 ہجری / 1917 عیسوی میں دوبارہ گر گیا، 1882 عیسوی میں قاہرہ پر برطانوی قبضے سے پہلے کے خاتمے کے بعد۔ اس نے یروشلم پر غیر ملکی کنٹرول کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

یہ انتہائی مشکل شاید ناممکن ہے، جیسا کہ تاریخی نظیریں یروشلم کی آزادی کے لیے تنہا فلسطینیوں سے توقع رکھنا چاہتی ہیں۔ محدود افرادی قوت اور وسائل کی حقیقتیں صہیونی طاقتوں کے ساتھ فیصلہ کن تصادم کے لیے ان کی صلاحیت کو محدود کرتی ہیں، خاص طور پر جب وہ قوتیں مضبوط مغربی حمایت سے مستفید ہوں۔ اس پشت پناہی کی جڑیں صیہونیت کی مغربی جغرافیائی سیاسی مفادات اور اسلامی علاقوں پر تسلط سے جڑی ہوئی ہیں۔

3. ایک "یہودی ریاست" کے وژن کو آگے بڑھانے میں تھیوڈور ہرزل کی کامیابی کا سنگ بنیاد خواب کی تکمیل کے لیے ایک مکمل خود مختار ادارہ قائم کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے موجودہ عالمی قوتوں کی طاقت کو بروئے کار لانے کی صلاحیت تھی۔ ہرزل کی صہیونی تنظیم اہم بین الاقوامی طاقتوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی تھی، اس بات کو یقینی بناتی تھی کہ ان کے وسائل اور پالیسیاں صہیونی ایجنڈے سے ہم آہنگ ہوں۔

ہرزل نے فیصلہ سازوں تک رسائی کے لیے کافی کوششیں کیں، مختلف طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے: ان کے مفادات، مذہبی جھکاؤ، یا دراندازی، دھمکیوں، سازشوں، اور یہاں تک کہ قتل کے ذریعے اپیل۔ اس کا مقصد واضح تھا: یہودیوں کو خلافت کے خلاف باغی کے طور پر پیش کیے بغیر یا اپنے دور کی غالب قوتوں کو چیلنج کیے بغیر، عثمانیوں سمیت موجودہ طاقتوں کو شامل کرنا۔

پچھلی صدی میں اسلامی تحریکوں کی جدوجہد کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ موجودہ طاقت کے ڈھانچے کے ساتھ منسلک ہونے اور فطری معاشرتی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کے اصول سے انحراف کرتے ہیں۔ مروجہ نظاموں کی حرکیات کو اپنانے کے بجائے، وہ اکثر الگ تھلگ، مصنوعی طور پر مضبوط تنظیمیں بنانے کی کوشش کرتے تھے جن کا مقصد حکمرانی یا آزادی کے لیے آزادانہ طور پر لڑائیاں لڑنا تھا۔ اس نقطہ نظر نے انہیں اکثر ڈھانچے کے ذریعہ لاحق ناگزیر چیلنجوں کو نیویگیٹ کرنے کے لئے ناکارہ چھوڑ دیا، جس سے وہ دراندازی، تقسیم اور دبائو کا شکار ہو گئے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلامی تحریکوں نے اپنی نمایاں کامیابیاں اس وقت حاصل کیں جب انہوں نے مروجہ نظاموں کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے موجودہ سماجی ڈھانچے کو استعمال کیا۔ مثال کے طور پر، کچھ تحریکوں نے گورننس فریم ورک میں گھس لیا، جیسا کہ ترکی میں کیس، یا فوجی اداروں کو متاثر کیا،

جیسا کہ سوڈان میں دیکھا گیا۔ دوسروں نے گہرے سماجی ڈھانچے کے اندر قبائلی اور قبائلی نیٹ ورکس پر انحصار کیا، جس کی مثال یمن میں ان کی سرگرمیوں سے ملتی ہے۔[1]

پیغمبر اسلام کا طرز عمل اس اصول کی مثال دیتا ہے۔ اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے ایک الگ تھلگ تنظیم بنانے کے بجائے، اس نے اپنے وقت کے مروجہ سماجی ڈھانچے کے ساتھ سرگرمی سے کام کیا، اپنے مشن کو مضبوط اور آگے بڑھانے کے لیے ان کے اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھایا۔ مثال کے طور پر، اس نے مکہ کے بااثر رہنماؤں کو تبدیل کرنے کو ترجیح دی، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اپنے معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب ان کوششوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ طائف کے قائدین کے سخت رد کے باوجود ان تک پہنچا۔ بے خوف ہو کر، اس نے حج کے موسم میں مختلف قبائل کا رخ کیا، ان کی حمایت اور تحفظ کے لیے۔ بالآخر، انصار کے قائدین کے قبول اسلام نے مدینہ میں مسلم کمیونٹی کی طاقت اور حتمی قیام کے لیے ضروری سماجی اور قبائلی بنیاد فراہم کی۔

ہرزل بلاشبہ ناکام ہو جاتا اگر وہ مکمل طور پر یہودی ریاست کے قیام کے لیے کسی خفیہ یا عوامی یہودی تنظیم کی آزادانہ کوششوں پر انحصار کرتا۔

کوئی بھی معاشرہ اندرونی اختلافات سے محفوظ نہیں ہے، خواہ وہ افراد ہوں یا گروہ۔ پیشرفت کا انحصار ان اختلافات کو مؤثر طریقے سے سنبھالنے اور استعمال کرنے کی قائدین کی صلاحیت پر ہے۔ اسرائیل کی کامیابی کا ایک بڑا عنصر، خاص طور پر اس کے ابتدائی سالوں میں، اس کے لیڈروں، جیسے کہ چیم ویزمین اور ڈیوڈ بین گوریون، کی صہیونیوں کے درمیان اندرونی تنازعات کو نتیجہ خیز نتائج میں تبدیل کرنے کی صلاحیت تھی۔ مثال کے طور پر، بین گوریون نے طویل مدتی قومی اہداف کو ترجیح دی، اکثر رائے عامہ اور میڈیا کی تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے، یہ مانتے ہوئے کہ اسرائیل کا فیصلہ عصری منظوری کے بجائے اس کی کامیابیوں سے کیا جائے گا۔ اس کے برعکس،

[1] نوٹ کریں کہ میں نے کہا تھا، "اسلامی تحریکوں نے اپنی اہم ترین کامیابیاں حاصل کیں،" جس کا مطلب سراسر کامیابی نہیں ہے۔ ایک باریک بینی سے جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ یمن اور سوڈان میں آنے والے دھچکے دوسرے عوامل کی وجہ سے تھے۔ تاہم، ان معاملات میں اسلام پسندوں کے اثر ورسوخ اور اسٹیبلشمنٹ کی سطح اس حد سے کہیں زیادہ تھی جو انہوں نے دوسرے تجربات میں حاصل کی جو صرف اپنے تنظیمی ڈھانچے کی مضبوطی پر انحصار کرتے تھے۔

موشے شارٹ نے اسرائیل کی شبیہہ پر زور دیا، اپنے اقدامات کو عوامی رائے سے ہم آہنگ کرنے اور تنازعات سے بچنے کے لیے احتیاط سے تیار کیا۔ اپنے اختلافات کے باوجود، انہوں نے برسوں تک تعاون کیا، اسرائیل کے قیام کے سات سال بعد ہی علیحدگی اختیار کی۔[1]

ہاگناہ، اسرائیل کی بنیادی فوجی قوت، نے بھی تقسیم ہونے والے گروہوں جیسے ارگن اور لیہی (سٹرن گروپ) کو دیکھا، جنہوں نے زیادہ انتہائی طریقے اپنائے۔ بین گوریون نے اکثر ان کے اقدامات کی مذمت کی، بشمول دیر یاسین قتل عام، پھر بھی اپنے بہت سے ارکان کو اسرائیلی فوج میں دوبارہ شامل کرنے میں کامیاب رہے۔ لہی کی بنیاد پرستی یہاں تک کہ نازی جرمنی کو برطانویوں کے خلاف اور اقوام متحدہ کے ایلچی کاؤنٹ فوک برناڈوٹے کے قتل کا باعث بنا۔ اگرچہ اس کے اراکین کو مختصر عرصے کے لیے قید کیا گیا تھا، لیکن انھیں جلد ہی معاف کر دیا گیا، کچھ کو پنشن یا اعزازات کے ساتھ۔ لیہی کے سابق رکن یتزاک شامیر بعد میں وزیر اعظم بنے۔ آج تک، اسرائیلی رہنما لہی کے بانی، ابراہم سٹرن کو سالانہ خراج تحسین اور ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

صہیونی تحریک کو، کسی بھی دوسری انسانی کوشش کی طرح، اندرونی اختلافات کا سامنا کرنا پڑا، جن میں سے کچھ تقسیم، بغاوت اور یہاں تک کہ قتل و غارت تک بڑھ گئے۔[2] کچھ ارکان نے ایک موجودہ ریاست کے فریم ورک کے اندر فلسطین میں یہودیوں کی واپسی کی کوشش کی، جس کا مقصد عرب آبادی کے ساتھ بقائے باہمی کا مقصد ہے، دوسرے کثیر الثقافتی سیاق و سباق کی طرح[3]۔ یہ نقطہ نظر دوسروں کے عزائم کے برعکس تھا جنہوں نے ایک وسیع، متبادل پر مبنی واپسی کی وکالت کی جو مقامی آبادی کو بے گھر کرے گی اور فلسطین سے آگے ٹرانس جورڈن میں پھیل جائے گی۔ اس توسیع پسندانہ رجحان کا مظہر بااثر نظریہ دان زیف جبوتنسکی کی زیر قیادت پارٹی نے ظاہر کیا[4]۔ تیزی سے ڈیٹرنس کے نظریے کے معمار کے طور پر، جو اسرائیل کی موجودہ سیکیورٹی حکمت عملی کا مرکزی تصور ہے، جبوتنسکی نے یہودی ایجنسی کی اس وقت کی فلسطین کی موجودہ سرحدوں کو قبول کرنے کی مخالفت کی۔

---

[1] گولڈا میر، صفحہ 219۔

[2] مثال کے طور پر دیکھیں، ایریل شیرون کی خودنوشت، صفحہ 29-30

[3] راجر گورودی، صفحہ 29 اور اس سے آگے

[4] 1929 میں 16ویں صیہونی کانگریس سے پہلے زیف جبوتنسکی کی تقریر کا ایک حصہ فلسطین ڈاکومینٹس فائلز، جلد 1، صفحہ 411 میں دیا گیا ہے۔

قرآن یہودی کمیونٹیز کے اندر بعض پائیدار خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہے، بیان کرتا ہے،

﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ﴿١٤﴾﴾

(ان کی آپس میں دشمنی شدید ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ متحد ہیں، لیکن ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔)[سورۃ الحشر، 59:14]۔ یہ آیت بنیادی تقسیم کے باوجود متحدہ محاذ پیش کرنے کے دوہرے پن کی عکاسی کرتی ہے۔ تاریخی طور پر، سیاسی طور پر منقسم ہونے کے بعد بھی، یہودی گروہوں نے اجتماعی یکجہتی کو ترجیح دی، جیسے کہ یہودی جنگی قیدیوں کو رہائی دینا، حتیٰ کہ مخالف دھڑوں سے بھی۔ اس کی مثال ایک اور قرآنی آیت میں ہے:

﴿ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴿٨٥﴾﴾

پھر تم وہ لوگ ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور اپنی قوم کے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بے دخل کرتے ہیں، گناہ اور زیادتی میں ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ آپ کے پاس قیدی بن کر آئیں تو آپ ان کا فدیہ دے دیں، حالانکہ ان کا بے دخل کرنا آپ پر حرام تھا۔ تو کیا آپ کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہ مانتے ہیں؟ پھر جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کیا ہے؟ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں واپس بھیجے جائیں گے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے(سورۃ البقرۃ 2:85

اتحاد اور اندرونی اختلاف کے اس امتزاج نے پوری تاریخ میں یہودیوں کی شناخت اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، حتیٰ کہ منتشر اور پسماندگی کے ادوار میں بھی۔ اللہ تعالیٰ اس کیفیت کو مزید بیان کرتا

﴿وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِنْهُمُ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٦٨﴾﴾

مایوسی، جبر اور کمزوری کے ادوار کے دوران، یہودی برادری نے گہرے مایوسی کا سامنا کیا، جیسا کہ آج کل کچھ مسلمانوں میں ناامیدی اور خود شک کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ جذبات اکثر سخت خود تنقید، اور سستی، نااہلی اور بے حسی کے الزامات کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہودی برادری کے اندر، کچھ لوگوں نے مسیحا کے انتظار یا فلسطین میں واپسی کی تڑپ کے تصور کا مذاق اڑایا، اس کے بجائے متبادل حل تلاش کرنے کا انتخاب کیا۔ انہوں نے یہودی خود مختاری کے لیے اقدامات کی تجویز پیش کی جس کی سربراہی ان کے رہنماؤں نے کی، فلسطین کے علاوہ دیگر مقامات پر، جسے وہ اس وقت ناقابل حصول تصور کرتے تھے۔

1882 میں، لیون پنسکر نے ان خیالات کو اس دور میں بیان کیا جب عالمی کوششیں فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے لیے یکجا ہو رہی تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی سال برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا، ایک ایسا واقعہ جس نے فلسطین پر دوبارہ دعویٰ کرنے کا خواب حقیقت کے قریب پہنچایا جتنا کہ بہت سے لوگوں کے خیال میں تھا۔ پنسکر بے حسی سے کوسوں دور تھا وہ "صیون سے محبت کرنے والے" معاشروں کے بانیوں میں سے ایک تھا، جس نے جدید صیہونیت کی فکری بنیادیں قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ اس کے نقطہ نظر نے اپنا حتمی مقصد حاصل نہیں کیا، لیکن اس نے یہودیوں کے شعور کو دوبارہ زندہ کرنے اور فلسطین کی طرف توجہ مرکوز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس طرح کی جدوجہد کی چکراتی نوعیت کو اجاگر کرنے کے لیے میں یہاں اس متوازی کو کھینچتا ہوں۔ آج اسلامی دنیا کے کچھ حصوں میں خود شکوک وشبہات، اصلاح کے مطالبات، اور اعلیٰ امنگوں کے مقابلے عملی حل کی ترجیح، کمزوری کے وسیع تر احساس کی عکاسی کرتے ہیں۔ پھر بھی، جیسا کہ تاریخ نے دکھایا ہے، فتح ممکن ہے دسترس میں

ہو، یہاں تک کہ جب وہ شکست خوردہ جذبے کے بوجھ تلے دبے لوگوں کے لیے سب سے زیادہ دور محسوس کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے تاریخی یہودی تحریکیں - اگرچہ ابتدائی طور پر ناکام ہو کر مستقبل کی کامیابیوں کے لیے اہم بنیاد رکھی گئی تھی، لیکن عصری اسلامی کوششیں، چاہے وہ کمزور پڑ جائیں، عظیم مقاصد کی جانب ناگزیر اقدامات میں حصہ ڈالتی ہیں۔

پوری تاریخ میں، بہت سے یہودیوں نے فلسطین واپسی کے وقت کے بارے میں مختلف پیشین گوئیاں کیں، جن میں سے اکثر غلط ثابت ہوئیں۔ یہ پیشین گوئیاں، جو اکثر مذہبی متون اور روایات سے اخذ کیے گئے سالوں اور دنوں کے حساب پر مبنی ہوتی ہیں، ان لوگوں کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں جو بے اختیار محسوس کرنے کے باوجود، حتمی فتح کی امید سے چمٹے رہتے ہیں۔

صہیونی تحریک کے اندر بھی، بعض لیڈروں نے خود کو مشکل حالات میں حکمران حکومتوں کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور پایا۔ ایک قابل ذکر مثال الفریڈ نوسگ ہے، ایک صیہونی شخصیت جس نے طلعت پاشا کے ساتھ فلسطین میں یہودیوں کی حیثیت پر 1918 میں بات چیت کی۔ بعد میں، نوسگ نے حیران کن طور پر خود کو نازی حکومت کے ساتھ جوڑ دیا، اور یورپ میں یہودیوں کے خاتمے کے منصوبوں میں حصہ لیا۔

یہ تاریخ امت مسلمہ کے لیے ایک یاد دہانی کا کام کرتی ہے: اگر تاریخی طور پر مظلوم اور قابل مذمت گروہ 3000 سال بعد بیرونی اتحادوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہوئے وہ حاصل کر سکتا ہے جو ایک ناممکن خواب کی طرح لگتا تھا، تو ملت اسلامیہ کے پاس امید کی اور بھی مضبوط بنیاد ہے۔ کامیابی اور بااختیار بنانے کے خدائی وعدوں کے ساتھ، اور جیسا کہ منتخب کمیونٹی کو صحیفے کے سپرد کیا گیا جب دوسرے اسے برقرار رکھنے میں ناکام رہے، مسلمانوں کے پاس اپنی فتح کی صلاحیت پر یقین کرنے کی ہر وجہ ہے۔

بین الاقوامی اور علاقائی سیاق وسباق پر کچھ نتائج

اگر ہم بین الاقوامی اور علاقائی حرکیات کی نوعیت کو سمجھنے کی نیت سے فلسطین کی تاریخ کا جائزہ لیں تو چند تنقیدی مشاہدات سامنے آتے ہیں۔

ایک اہم بحث کا مرکز کنٹرول کے سوال پر ہے: کیا یہودی اور صیہونی مغرب اور اس کی سیاست پر غلبہ حاصل کر رہے ہیں، یا مغرب ایک اعلیٰ طاقت ہے، جو اپنے استعماری اور سامراجی مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے یہودیوں اور صیہونیوں کو استعمال کر رہا ہے؟ اس بحث میں دو اہم نقطہ نظر شامل ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنی خفیہ تنظیموں، مالی اثر و رسوخ اور میڈیا، فنون لطیفہ اور ثقافت میں گہرے دخول کے ذریعے مغربی سیاسی معاملات پر ہیرا پھیری، بے ایمانی اور سازشوں کے ذریعے قبضہ جمالیا ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ رکھتا ہے کہ مغربی طاقتیں نہ تو بولی ہیں اور نہ ہی بے وقوف۔ یہودی صدیوں تک ان کے درمیان رہتے تھے لیکن پسماندہ اور ظلم و ستم کا شکار رہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مغرب نے جان بوجھ کر صہیونیوں کو بااختیار بنایا اور اسرائیل کے قیام میں سہولت فراہم کی، نہ کہ تسلیم شدہ بلکہ اپنے استعماری مفادات کے لیے ایک اسٹریٹجک ٹول کے طور پر۔ اس طرح اسرائیل مسلم سرزمین کے اندر ایک فوجی چوکی کے طور پر کام کرتا ہے، جہاں یہودی مغربی، عیسائی زندگیوں کو بچانے کے لیے قابل خرچ انسانی وسائل کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

میں مؤخر الذکر رائے کی طرف جھکاؤ رکھتا ہوں: مغرب ایک غالب طاقت ہے، جس نے صیہونیوں کو اپنے استعماری مقاصد کے لیے استعمال کیا[1] جتنا صیہونیوں نے مغرب کو استعمال کیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ جب چاہے اسرائیل کی پالیسیوں کو کنٹرول اور کنٹرول کرنے کی صلاحیت کے ساتھ بالادست ہے۔

اگرچہ یہ تاریخی اور سیاسی شواہد کو مکمل طور پر پیش کرنے کی جگہ نہیں ہے، لیکن مجھے قرآن میں اس نظریے کی تائید ملتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

[1] دیکھیں عبدالوہاب المسیری، جلد 7، 347، جلد 8، صفحہ 39

﴿إِذۡ قَالَ ٱللَّهُ يَٰعِيسَىٰٓ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَجَاعِلُ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوكَ فَوۡقَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِۖ﴾

(یاد رکھو) جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں تجھے لے کر اپنی طرف اٹھاؤں گا اور تجھے کافروں سے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک کافروں پر فضیلت دوں گا۔ بعض مفسرین اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عیسائی اور رومی ان لوگوں پر برتری حاصل کریں گے جنہوں نے عیسیٰ (یہود) کو آخری زمانے تک کافر کیا[1]۔ ایک اور متعلقہ آیت کہتی ہے،

﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلذِّلَّةُ أَيۡنَ مَا ثُقِفُوٓاْ إِلَّا بِحَبۡلٖ مِّنَ ٱللَّهِ وَحَبۡلٖ مِّنَ ٱلنَّاسِ﴾

(وہ جہاں بھی ملے ذلیل وخوار ہوئے، سوائے اس کے کہ اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کے نیچے ہو۔)[آل عمران 3:112]۔ ذلت کی یہ تفصیل، بیرونی حمایت اور مدد پر انحصار کرنے کی شرط کے ساتھ، کسی بھی دور میں یہودیوں کے حتمی غالب طاقت ہونے کے امکان کی نفی کرتی ہے۔ جاری بحث اور اس کے حل سے قطع نظر، اہم نکتہ یہ ہے کہ مغرب اسرائیل کو کبھی نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی اس کی حمایت اور تحفظ کو ختم کرے گا، چاہے سفارت کاری کے ذریعے ہو یا جنگ کے ذریعے۔

---

[1] میں نے آیت کی مختلف تشریحات کا جائزہ لیا اور پایا کہ بعض مفسرین واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ مقصود کا مطلب یہ ہے کہ عیسائی (اور کچھ خاص طور پر رومیوں کا ذکر کرتے ہیں) یہودیوں سے برتر ہیں۔ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ علماء کا یہی قول ہے۔ تشریحی اختلاف کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

کچھ لوگوں نے "برتری" کو استعاراتی سمجھا، جو دلائل، شواہد اور سچائی کی پابندی کے ذریعے برتری کا حوالہ دیتے ہیں۔ تاہم، یہ تفسیر آیت کے سیاق وسباق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ دوسرے اسے لفظی دنیاوی غلبہ سے تعبیر کرتے ہیں، جو زیادہ قابل فہم لگتا ہے اور سیاق وسباق کے ساتھ بہتر طور پر موافق ہے۔ جو لوگ اس نظریہ کی حمایت کرتے ہیں، ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ غلبہ حاصل کرنے والے اسلام کے ماننے والے ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، بشمول مسلمان اور عیسائی۔ اس مؤخر الذکر نقطہ نظر کا امکان کم ہے کیونکہ تقریر محمد کی نبوت اور مسلم کمیونٹی کے ظہور سے پہلے عیسیٰ کی طرف ہے۔ اگرچہ یہ خیال کہ مسلمان، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے طور پر، ان کا مقصد سمجھ میں آتا ہے، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ماضی قریب کے علاوہ مسلمانوں نے صدیوں سے یہودیوں پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ تاہم، موجودہ صورت حال کے پیش نظر جہاں یہودیوں نے مسلمانوں پر غلبہ حاصل کیا ہے، مضبوط تشریح عیسائیوں اور رومیوں کے غالب گروہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، جیسا کہ ابن زید اور دیگر نے تجویز کیا ہے۔

مزید حوالہ کے لیے دیکھیں:

الطبری کی تفسیر، جلد 6، صفحہ 463۔

- ابن ابی حاتم کی تفسیر ابن ابی حاتم، جلد 2، صفحہ 662۔
- الثلابی کی تفسیر الثلابی، جلد 3، صفحہ 83۔
- السیوطی کی تفسیر الجلالین، ص۔ 74.
- تفسیر کا انسائیکلوپیڈیا از بیان، جلد 5، صفحہ 245-246

یہ ثابت قدم ایوینجلیکل عیسائیوں پر مشتمل ہے جو ان کے عقیدے سے متحرک ہیں، وہ عیسائی جو یہودیوں کو کرائسٹ کلر سمجھتے ہیں لیکن یہودیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھتے ہیں، اور سیکولرسٹ جو اسرائیل کو مغربی استعماری عزائم کے لیے ایک اسٹریٹجک اثاثہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔[1]

یہ متحرک صیہونی اقدامات کے لیے مغرب کی غیر معمولی رواداری کی وضاحت کرتا ہے جو کسی دوسرے ادارے کے لیے ناقابل قبول ہوگی۔ مثال کے طور پر، 1940 کی دہائی میں صہیونی گروہوں نے فلسطین میں برطانوی افواج کو بم دھماکوں، قتل وغارت اور دیگر پر تشدد کارروائیوں کا نشانہ بنایا، جس کے نتیجے میں برطانوی فوجیوں اور افسران کو کافی جانی نقصان ہوا۔ اس کے باوجود برطانیہ نے بالآخر فلسطین ان کے حوالے کر دیا۔ اسی طرح، اسرائیلی جاسوس امریکی انٹیلی جنس میں دراندازی کرتے ہوئے بار بار پکڑے گئے ہیں، اور امریکی رہنماؤں کو اکثر اسرائیلی سیاست دانوں کی طرف سے عوامی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے باوجود اس طرح کی توہین کو معمول کے مطابق نظر انداز کیا جاتا ہے۔[2]

مزید برآں، ایک یہودی مذہبی اور نسلی ریاست کے طور پر اسرائیل کی شناخت بنیادی مغربی اصولوں جیسے سیکولرازم، لبرل شمولیت، انسداد نسل پرستی، اور ریاستی سرحدوں کے ویسٹ فیلین فریم ورک سے بالکل متصادم ہے۔ اسرائیل نہ صرف اس طرح کی حدود کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ کھلے عام توسیع پسندانہ عزائم کا اعلان کرتا ہے (نیل سے فرات تک)۔ اس بنیادی تضاد کے باوجود، مغرب اسرائیل کا اتحادی ہے جبکہ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (PLO) جیسے گروپوں کی مخالفت کرتا ہے، جو ایک سیکولر، جامع ریاست کے مغربی لبرل نظریات کے ساتھ زیادہ قریب سے ہم آہنگ ہے۔ مغربی حکام اس تضاد کو کھلے دل سے تسلیم کر سکتے ہیں، یا تو کوئی جواز پیش کرتے ہیں یا اپنے اعمال یا پالیسیوں کے لیے کسی ایک کو یکسر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ واضح طور پر پر تشدد قتل عام کا دفاع ناگزیر ضروریات کے طور پر کیا گیا ہے۔[3]

---

[1] راجر گوروڈی، صفحہ 16

[2] ہلیری کلنٹن، صفحہ 313-14؛ رابرٹ گیٹس، صفحہ 460، 469

[3] مثال کے طور پر دیکھیں، کونڈولیزا رائس، صفحہ 67-77، 328-29؛ ہلیری کلنٹن، p.29 اور اس سے آگے اور p.23 کے ساتھ موازنہ کریں؛ ہنری کسنجر، ورلڈ آرڈر: ریفلیکشنز آن دی کریکٹر آف نیشنز اینڈ دی کورس آف ہسٹری، پی پی 132، 135 [عربی ایڈیشن]؛ جارج ٹینٹ، صفحہ 111۔

اس کو سمجھنے سے تنازعہ کی گہرائی اور پیچیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ اسرائیل محض ایک صہیونی یہودی منصوبہ نہیں ہے بلکہ مذہبی اور سٹریٹجک بنیادوں کے ساتھ ایک مغربی استعماری صلیبی جنگ بھی ہے۔ یہ صلیبی صیہونی نظریہ، مغربی سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی اشرافیہ کے اندر گہرائی سے پیوست ہے، قرون وسطیٰ کے صلیبی عزائم کے عصری احیاء کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ تجزیہ اس غلط فہمی کو دور کرتا ہے کہ مغربیوں کو صرف فلسطینی کاز کے انصاف کے بارے میں روشن خیال ہونے کی ضرورت ہے یا یہ کہ ان کی صورتحال کے بارے میں معلومات کی کمی اس مسئلے کی جڑ ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملے کو انسانی حقوق، خودارادیت، یا بین الاقوامی قانون کی پاسداری جیسے فریم ورک کے ذریعے پیش کرنے کی وکالت کرتے ہیں، اس سے مغربی ہمدردی یا کارروائی کی توقع رکھتے ہیں۔ درحقیقت، مغربی معاشرے کا ایک اہم حصہ اس اعتقاد کے نظام کو پوری طرح سمجھتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہے جو زمین کو یہودیوں سے خدائی وعدے کے مطابق دیکھتا ہے، جسے بعض لوگوں نے ایک بدقسمتی سے تاریخی بے ضابطگی کے طور پر بیان کیا ہے، یہاں تک کہ "تہذیب کے چہرے پر ایک داغ" کے طور پر بیان کردہ عربوں کو بے گھر کرنے کے لیے انہیں بحال کیا گیا ہے۔ اس عالمی منظر میں، یہودیوں کو، جو مغربی صلیبیوں کے ذریعے تقویت یافتہ ہیں، اس سرزمین کو دوبارہ حاصل کرنے، ترقی کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کے الہی مشن کی تکمیل کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جبکہ اس کے نام نہاد بدنام زمانہ عرب مکینوں کو نکال باہر کیا جاتا ہے۔

یہ تفہیم تنازعہ کی پیچیدگی اور اس کے لیے درکار بے پناہ مالی اور انسانی وسائل کے بارے میں ہمارے نقطہ نظر کو بھی تیز کرتا ہے۔ کچھ فلسطینیوں میں ایک طویل غلط فہمی، جو آج بھی برقرار ہے، یہ تصور ہے کہ وہ آزادانہ طور پر آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ الگ تھلگ کامیابیوں سے متاثر ہو کر، بعض نے فلسطین کو آزاد کرنے کے بعد دیگر علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جدوجہد کو بڑھانے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ یہ خواہشات اکثر اچھے ارادوں سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن یہ تنازعات کے سراسر پیمانے اور سنگینی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

1962 میں الجزائر کی کامیاب آزادی کے ساتھ موازنہ، جس نے کبھی فلسطینی مزاحمت کو متاثر کیا تھا، اہم امتیازات کو واضح کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے کمزور ہونے والے فرانس کو امریکہ اور سوویت یونین دونوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے بین الاقوامی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اپنی نوآبادیاتی گرفت چھوڑ دی۔ اس کے برعکس اسرائیل کو بے مثال مغربی حمایت حاصل ہے۔ الجزائر کی بڑی آبادی، وسیع و عریض علاقہ، اور وافر وسائل فلسطین کی صلاحیتوں سے نمایاں طور پر کہیں زیادہ ہیں۔ مزید برآں، الجزائر نے ایک جغرافیائی سیاسی ماحول سے فائدہ اٹھایا جو بدترین غیر جانبدار تھا، جب کہ فلسطین کے پڑوسی اکثر اس کے مخالف کے ساتھ ملی بھگت سے کام کرتے ہیں، اس کے مخالف کی کوششوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اس جذبات کی بازگشت متعدد مغربی رہنمائوں نے بھی کی ہے، حتیٰ کہ مخالف نظریات رکھنے والے بھی،[1] مغرب کے لیے ایک اسٹریٹجک اثاثہ کے طور پر اسرائیل کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل کے بغیر مغرب کو مشرق وسطیٰ میں فوجی اڈے قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے بے پناہ مالی اور انسانی اخراجات اٹھانے پڑتے۔ نتیجے کے طور پر، اسرائیل کے قیام سے پہلے صیہونیت کی حمایت اور اس کے بعد اسرائیل کے لیے، مغربی سیاسی دھڑوں کے درمیان ایک مستقل پالیسی رہی ہے، جس میں امریکہ میں ڈیموکریٹس اور ریپبلکن اور برطانیہ میں لبرلز اور کنزرویٹو جیسے مسابقتی گروپ شامل ہیں۔

نیتن یاہو نے اپنی یادداشتوں میں اس متحرک کو اجاگر کیا، ایک امریکی کانگریس مین کے ایک بیان کو یاد کرتے ہوئے، "اگر افغانستان میں ہمارے پاس اسرائیل ہوتا تو ہم اپنے آپ کو ایک ٹریلین ڈالر بچاتے اور برے لوگوں کے خلاف ایک قابل اعتماد اتحادی رکھتے۔[2]" یہ نقطہ نظر ہرزل کے وژن سے مطابقت رکھتا ہے، جو ایک صدی قبل بیان کیا گیا تھا، ایک یہودی ریاست کے بارے میں جو "ایشیاء میں یورپ کے لیے ایک دفاعی دیوار کے حصے

[1] قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ بیان امریکی صدور کے درمیان دو سخت حریفوں: ٹرمپ اور بائیڈن نے دیا تھا۔

[2] نیتن یاہو، بی بی: میری کہانی، صفحہ 758 (ص574 میں پرنٹ)

کے طور پر کام کر رہی ہے۔[1]" اس تعلق نے بعض تجزیہ کاروں کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ وسیع تر عالمی جدوجہد کا مرکز فلسطین کے تنازعے میں ہے۔[2]

تاہم، یہ متحرک یہ تجویز نہیں کرتا کہ یہودی یا صیہونی صرف مغربی طاقتوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اس کے بجائے، وہ لوگ ہیں جن کا اپنا آزادانہ وژن اور ایجنڈا ہے، جو اپنی ریاست کو مضبوط کرنے، اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور مغربی اداروں میں اپنی رسائی کو بڑھانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ بہر حال، متحرک مغرب کی حمایت کرتا ہے، کیونکہ اس نے اس رشتے میں بالادستی برقرار رکھی ہے۔ دونوں جماعتوں کے درمیان اختلافات کو بالآخر ان کے مشترکہ اسٹریٹجک اہداف کے فریم ورک کے اندر منظم کیا جاتا ہے۔

اس نتیجے کی بنیاد پر، مندرجہ ذیل بصیرت ابھرتی ہے: اگر اسرائیل خطے میں تسلط کے مغربی منصوبے کے مرکزی ستون کے طور پر کام کرتا ہے، تو یہ منطقی طور پر، مکمل سیاسی یا تاریخی تجزیے کی ضرورت کے بغیر، یہ کہتا ہے کہ موجودہ عرب حکومتیں بھی اسی منصوبے کے اجزاء ہیں۔ چاہے مغربی مفادات کا براہ راست تحفظ ہو یا اسرائیل کی سلامتی کو ترجیح دے کر، جو اس ایجنڈے کا اہم حصہ ہے، ان حکومتوں نے اسی کے مطابق اپنا کردار ادا کیا ہے۔

عرب حکومتوں نے سب سے پہلے اس امر کو تسلیم کیا۔ اقتدار کے ہر دعویدار نے اسرائیل کی پوزیشن کو محفوظ بنانے پر خاص زور دیتے ہوئے مغربی ترجیحات کو آگے بڑھانے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے شدید نظریاتی اور ساختی اختلافات کے باوجود چاہے وہ بادشاہتیں ہوں یا جمہوریہ، سوشلسٹ ہوں یا سرمایہ دار، سویلین ہوں یا فوجی یہ حکومتیں ایک متحد عزم رکھتی ہیں: اسرائیل کا تحفظ۔ اندرونی رقابتیں اکثر دھڑوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر مجبور کرتی ہیں تاکہ وہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے اور گہرا تعلق قائم کرنے پر آمادگی کا اشارہ دے سکیں۔ مزید برآں، جب ان حکومتوں میں سے کسی کا

---

[1] راشد الخالدی، ص23

[2] ڈاکٹر جمال حمدان کا خیال ہے کہ عالمی تنازعہ اور سامراج کی قسمت تیسری دنیا کی تقدیر پر منحصر ہے، جس کے نتیجے میں، عرب دنیا کی تقدیر کا انحصار ہے۔ مزید برآں، عرب دنیا کی تقدیر اسرائیل کے ساتھ جدوجہد کے نتائج سے جڑی ہوئی ہے۔ دیکھیے جمال حمدان، استعماریت اور آزادی کی حکمت عملی، صفحہ۔ 351.

استحکام خاص طور پر صف اول میں رہنے والی ریاستوں کو خطرہ ہوتا ہے تو وہ عام طور پر خبر دار کرتے ہیں کہ ان کا زوال اسرائیل کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دے گا۔

اس سے ایک نازک حقیقت پر روشنی پڑتی ہے: اسرائیل کے قیام سے لے کر اب تک کسی عرب ریاست نے اس کے خلاف کارروائی نہیں کی اور نہ ہی فلسطین کی آزادی کے لیے کوئی ٹھوس حکمت عملی وضع کی۔ مذہبی یکجہتی، عرب فخر، یا یہاں تک کہ قومی سلامتی کے شدید خطرے کو کم کرنے کے عملی مقصد سے باہر نہیں۔ یہ تضاد بر قرار ہے باوجود اس کے کہ یہ حکومتیں اکثر اسلام کے محافظ، عرب شناخت کے چیمپئن، یا قومی خود مختاری کے محافظوں کے طور پر پیش آتی ہیں۔

اس حقیقت کا کھلم کھلا اعتراف جمال عبد الناصر کی طرف سے ہوا، جس نے غزہ میں فلسطینی نیشنل کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "جو بھی آپ کو یہ کہتا ہے کہ ان کے پاس فلسطین کو آزاد کرانے کا منصوبہ ہے، وہ جھوٹ بول رہا ہے، اور اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میرے پاس فلسطین کو آزاد کرنے کا منصوبہ ہے تو میں آپ سے جھوٹ بولوں گا۔[1]

یہ حکومتیں نہ صرف ان لوگوں کی حمایت کرنے میں ناکام رہیں جو اسرائیل کے خلاف مزاحمت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے خلاف فعال طور پر کام کرتے ہیں، مزاحمت کرنے والوں کا تعاقب کرتے ہیں، قید کرتے ہیں، اذیتیں دیتے ہیں اور یہاں تک کہ انہیں قتل کرتے ہیں۔ یہ جنگ کے وقت اور امن دونوں میں مسلسل ہوتا رہا۔ ان حکومتوں کی جیلوں میں فلسطین کے لیے لڑنے یا لڑنے کی کوشش کرنے والوں کو درپیش حالات اکثر اس قدر کربناک ہوتے تھے کہ وہ سمجھ سے باہر ہو جاتے تھے۔

مزید برآں، فلسطین کی تاریخ کا جائزہ لینے سے ایک واضح نمونہ سامنے آتا ہے: فلسطینی مزاحمت صرف کمزور حکومتوں میں پروان چڑھی۔ اس کے برعکس، مضبوط حکومتوں نے اپنی سرحدوں کے اندر مزاحمتی سرگرمیوں پر سختی سے پابندی لگا دی۔ مثال کے طور پر، جب کہ مصر اور شام جیسی حکومتوں نے نہ تو فلسطین کی آزادی کے لیے

[1] احمد منصور، ص 61؛ احمد جبریل، صفحہ 57

جنگ کی اور نہ ہی ایسا کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنایا، لیکن اردن اور لبنان جیسی کمزور حکومتوں نے عارضی طور پر مزاحمت کو اپنے علاقوں سے کام کرنے کی اجازت دی۔ تاہم، جب اس طرح کی مزاحمت زور پکڑ گئی، تو ان حکومتوں نے اسے دبانے کے لیے مداخلت کی۔ یہ 1970 میں اردن اور 1982 میں لبنان میں واضح ہوا، جہاں فلسطینی مزاحمت کو زبردستی کچل دیا گیا یا نکال دیا گیا۔ جیسا کہ ایک مبصر نے مناسب طور پر خلاصہ کیا، "فلسطین میں پیدا ہونے والے ہر انقلاب کو عرب دارالحکومتوں میں ختم کر دیا گیا تھا۔[1]

مزاحمت پر کلیدی بصیرت

اگر میں مزاحمت میں شامل لوگوں کو مشورہ دوں، یا اگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری تحریر کو پڑھیں گے، تو میری بنیادی توجہ مندرجہ ذیل بصیرت کو پہنچانا ہوگی:

.1

فلسطین کی تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا زوال قاہرہ، دمشق اور استنبول جیسے بڑے دارالحکومتوں کے زوال کے ساتھ ہوا۔ اس کے برعکس، اس کی سلامتی، خوشحالی اور استحکام کے ادوار ان شہروں کی طاقت اور جانداروں کے ساتھ منسلک تھے۔ اسی طرح اسرائیل کا قیام لندن، واشنگٹن اور ماسکو جیسے طاقتور دارالحکومتوں کے فیصلوں کا نتیجہ تھا۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ مستقل مغربی حمایت کے بغیر اسرائیل یا تو خود ہی ٹوٹ جائے گا یا کم سے کم کوشش یا مزاحمت سے آسانی سے شکست کھا جائے گا۔

ہ مشاہدہ خود فلسطین کے اندر مزاحمتی کوششوں کو محدود کرنے کی موجودہ حکمت عملی کا از سر نو جائزہ لینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہ توجہ ایک مخصوص تاریخی تناظر میں قابل فہم ہو سکتی ہے، لیکن یہ ان مفروضوں کے ذریعے کارفرما تھی جو اس کے بعد سے گمراہ ثابت ہوئے ہیں، یعنی عرب اتحاد یا حتیٰ کہ ان کے اپنے قومی مفادات کے لیے عرب حکومتوں کے اخلاص پر یقین۔

[1] صلاۃ خلف، صفحہ 13،65۔

یروشلم کو آزاد کرانے کی چابیاں قاہرہ، عمان اور دمشق میں ہیں۔ ان دارالحکومتوں میں حکومتوں کی تبدیلی بنیادی طور پر جدوجہد کے توازن کو بدل سکتی ہے۔ جب تک یہ حکومتیں برسراقتدار رہیں گی فلسطین کی آزادی کی توقع رکھنا غیر حقیقی ہے۔

اسلامی تحریکوں نے تاریخی طور پر فلسطین کی آزادی کے لیے اسلامی ریاست کے قیام کے تصور کو اپنانے کے بجائے مسلح تصادم میں براہ راست شمولیت سے دستبردار ہو کر غلطی کی ہے۔ اس حکمت عملی کے باوجود معقولیت کے بغیر، اس کے نتیجے میں اہم مواقع ضائع ہوئے۔ اس کی وجہ سے فعال اراکین کی سیکولر یا قوم پرست مزاحمتی تحریکوں جیسے الفتح کی طرف ہجرت ہوئی، جن کا خیال تھا کہ آزادی عرب ریاستوں کے اتحاد سے پہلے ہو سکتی ہے۔

یہ عقیدہ صرف اسلامی تحریکوں کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ قوم پرست جماعتوں نے بھی اسے قبول کیا تھا، جو کہ اسی طرح فلسطین کی آزادی کے لیے عرب اتحاد کی شرط رکھتی تھیں۔ حکمت عملی میں اس اختلاف نے مزاحمتی کوششوں کی رفتار کو تشکیل دیا ہے اور علاقائی سیاست اور آزادی کی جدوجہد کے درمیان پیچیدہ تعامل کو نمایاں کیا ہے۔ ہاں، اسلامی تحریک نے 1980 کی دہائی کے اوائل میں اپنی حکمت عملی کو دوبارہ ترتیب دیا، ایک اسلامی ریاست کے قیام کا انتظار کرنے کی بجائے آزادی کی جدوجہد میں قدم رکھا۔ تاہم، یہ اس سے پہلے کی دلیل کو باطل نہیں کرتا کہ فلسطینی تنہا آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ نقطہ درست رہتا ہے، لیکن دفاعی جہاد فوری کوشش اور عمل کا مطالبہ کرتا ہے، جو بدلے میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کو آگے بڑھاتا ہے اور قریب لاتا ہے۔

اگر اسلامی تحریک اپنے اصل اصول پر سختی سے کاربند رہتی اور حماس اور اسلامی جہاد جیسی تنظیموں کی بنیاد نہ رکھتی تو موجودہ منظر نامہ کہیں زیادہ تاریک ہو سکتا تھا۔ یہ قابل فہم ہے کہ اب ہمارا سامنا ایک ایسے اسرائیل سے ہو رہا ہے جو دریائے نیل سے فرات تک پھیلا ہوا ہے۔

غیر فعالی سے دور تحریک کے محور نے ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کی۔ غیر متناسب طاقت کے باوجود اس نے جدوجہد میں حصہ لیا اور اپنے محدود وسائل کے پیش نظر غیر معمولی نتائج حاصل کئے۔ پھر بھی، قوم پرست تحریک پر غور کرنا ضروری ہے، خاص طور پر الفتح، جس کا ابتدائی طور پر خیال تھا کہ آزادی آزادانہ طور پر حاصل کی جاسکتی ہے، الجزائر کی مثال سے متاثر ہو کر۔ یہ تصور بالآخر ترک کر دیا گیا۔

الفتح نے اپنے تجربات کے ذریعے عرب حکومتوں کو آزادی کی راہ میں حقیقی رکاوٹوں کے طور پر تسلیم کیا۔ صلاح خلف (ابو عیاد) نے مشہور تبصرہ کیا کہ فلسطینی مزاحمت خود اسرائیل سے زیادہ عرب حکومتوں کے لیے خطرہ ہے۔ اس نے اس کی مثال ایک تشبیہ کے ساتھ بیان کی: تصور کریں کہ کوئی شخص سنتری کے درخت کو پھل حاصل کرنے کے لیے ہلا رہا ہے، لیکن ایسا کرتے ہوئے، وہ دوسرے سڑے ہوئے سنتریوں کو پہلے گرانے کا سبب بنتا ہے۔ اس تشبیہ میں مطلوبہ پھل اسرائیل ہے جبکہ بوسیدہ پھل عرب حکومتیں ہیں جن کا مقدر اسرائیل کے سامنے گرنا ہے[1]۔

.2

اقتدار کا حصول ایک ناگزیر ضرورت ہے، چاہے انتخابات کے ذریعے ہوں یا دیگر ذرائع سے، فلسطین میں اور عرب اور اسلامی دارالحکومتوں میں۔

ابتدائی طور پر، مزاحمتی تحریکیں، بشمول زیادہ تر اسلامی گروپ، یا تو عسکریت پسند یا مشنری تنظیموں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ تاہم، جب حماس نے 2006 کے انتخابات میں حصہ لیا تو اس نے ایک اہم فیصلہ کیا۔

اگر اس نے شرکت نہ کی ہوتی تو شاید محمود عباس فلسطینی کاز کو ختم کر دیتے، علاقائی اور عالمی طاقتوں کی حمایت یافتہ قانونی اتھارٹی کے بہانے ان تحریکوں کو بے اثر کر دیتے۔ اس کے بجائے، سیاسی میدان میں داخل ہو کر، حماس نے مقصد کو ختم کرنے کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی اور غداری کے خلاف اپنا دفاع کیا، بالآخر غزہ میں

[1] صلاۃ خلف، ص6

خود مختاری حاصل کی۔ اس خود مختاری نے سخت حالات کے باوجود غزہ کو مزاحمت کے ایک مضبوط گڑھ میں تبدیل کر دیا۔

آج انتخابات قانونی حیثیت کا ایک تسلیم شدہ راستہ ہیں، خاص طور پر جب شفاف طریقے سے منعقد کیے جائیں۔ یہ قانونی حیثیت سب سے اہم ہے۔ کوئی بھی اسلامی یا مزاحمتی گروہ اقتدار کے حصول کے راستے بنانے یا بنانے میں ناکام ہو جائے تو مختصر یا درمیانی مدت میں اپنی موت کا خطرہ ہے۔ ایسی تحریکیں جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہیں اگرچہ شاذ و نادر ہی ہوں۔

اندرونی کمزوری یا جبر یا لالچ کے تحت غالب قوتوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے زوال۔

غزہ اور مغربی کنارے کے درمیان فرق اس نکتے کو واضح کرتا ہے۔ غزہ میں اسلامی قیادت نے میزائلوں کی تیاری اور علاقائی دفاع میں نمایاں پیش رفت حاصل کی ہے۔ دریں اثنا، مغربی کنارے میں مزاحمت چھرا گھونپنے یا گاڑیوں کے حملوں جیسی انفرادی کارروائیوں تک کم ہو جاتی ہے، جس کا اختتام اکثر مجرم کی موت پر ہوتا ہے۔

اسی طرح مصر میں محمد مرسی کے مختصر مگر اثر انگیز دور کا ان سے پہلے مبارک اور ان کے بعد سیسی کے ساتھ موازنہ کرنا تفاوت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کمزور اسلامی حکومت نے کسی بھی آمرانہ حکومت سے کہیں زیادہ بامعنی نتائج حاصل کیے ہیں۔

.3

بلاشبہ، ایک گہرا مسئلہ جس نے برطانوی قبضے کے بعد سے فلسطینی مزاحمت کی رفتار کو متاثر کیا ہے، وہ فلسطینی قیادت کے درمیان اندرونی تقسیم ہے۔ ان تقسیموں کو، جنہیں قبضے نے مزید بڑھانے کے لیے کام کیا، عرب حکومتوں کے ذریعے مزید ہوا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اختلافات نے اہم وقت، توانائی اور وسائل ضائع کیے ہیں۔ تاہم، ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ فلسطینی کاز میں حقیقی پیش رفت صرف اس وقت عمل میں

آئی جب غزہ نے فوجی قرارداد حاصل کی اور خود کو فلسطینی اتھارٹی سے آزاد کر لیا، جس نے مزاحمت کو کمزور کرنے والی ایک اور غدار قوت کے طور پر کام کیا تھا۔ در حقیقت فلسطینی اتھارٹی اپنے مقامی علم، تجربے اور فطرت کے ساتھ وہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب رہی جو اسرائیلی قبضہ بھی نہ کر سکے۔

کسی بھی مزاحمتی تحریک کے لیے، سب سے خطرناک چیلنجوں میں سے ایک دو متضاد ترجیحات میں توازن پیدا کرنا ہے: مقصد کا اتحاد، یا کم از کم موثر انتظام اور اندرونی تقسیموں پر قابو پانا، اور ساتھیوں کے خلاف جنگ اور ان تقسیموں کے پیچھے چھپے ہوئے غدار منصوبوں کے خلاف جنگ۔ ان کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے اکثر لچکدار اور تیز، سخت اصولوں کے بجائے حالات کے مطابق فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاہم حماس پر ایک تنقید یہ ہے کہ اس نے مسلسل خاموشی سے برداشت کی حکمت عملی اپنائی ہے، فتح کی طرف سے کیے جانے والے جرائم کو جذب کیا ہے۔ غزہ میں مبارک فوجی قرارداد بھی ایک حکمت عملی، میدان جنگ کا فیصلہ تھا، سیاسی نہیں۔ آج تک، الفتح اور فلسطینی اتھارٹی کی طرف نقطہ نظر ایک غیر فعال بقائے باہمی میں سے ایک ہے، جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اس اتھارٹی کو غیر قانونی قرار دینے، اس کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے، اور بعض اوقات، مغربی کنارے میں اس کا سامنا کرنے کے متعدد مواقع ضائع ہوئے ہیں۔

فلسطینی اتھارٹی اور اس کے اتحادیوں نے، جن میں الفتح کے ساتھ وابستگی کے پیچھے چھپے ہوئے لوگ بھی شامل ہیں، نے اس طریقہ کار سے اہم فوائد حاصل کیے ہیں۔ تاہم، انہوں نے مزاحمتی جنگجوؤں کا سراغ لگانے، قتل کرنے اور ان پر تشدد کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، ان کے انتہائی قابل مذمت رویوں کو بے نقاب کیا۔ یہ خاص طور پر جاری "فلڈ آف الاقصی" جنگ کے دوران واضح ہوا، جو تحریر کے وقت تک نو ماہ تک جاری ہے۔

وہی حکمت عملی جو الفتح کے ساتھ معاملات پر لاگو ہوتی ہے عرب حکومتوں کے ساتھ بات چیت پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ ان حکومتوں کے ساتھ دشمنی سے بچنے اور ان کے اندرونی تنازعات سے دور رہنے کی پالیسی اپنانے سے تحریک کو فتح اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن سے سبق حاصل کرتے ہوئے بہت سے مسائل سے بچنے میں مدد ملی ہے۔ تاہم، یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کی پالیسی کو لچک کی ضرورت ہوتی ہے اور سختی سے کسی ایک

عمل پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک مقررہ نقطہ نظر کی پابندی کی وجہ سے مواقع ضائع ہوئے، خاص طور پر عرب بہار کے دوران۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ عرب حکومتیں مسلسل حماس اور دیگر مزاحمتی تحریکوں کی مخالف ہیں اور قوم پرست اصولوں یا قومی سلامتی کے خدشات سے منقطع ہیں، صورت حال قدرتی طور پر ان حکومتوں کو ہٹانے کے لیے کارروائی کی ضرورت کو جنم دیتی ہے۔ اگر یہ حکومتیں حقیقی طور پر قوم پرست تھیں تو اس طرح کی پالیسی معنی رکھتی ہے، لیکن حقیقت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ نہیں ہیں۔ اس لیے دشمنی سے گریز، ان حکومتوں کو خوش کرنے اور ان کو چیلنج کرنے کے مواقع کو نظر انداز کرنے کا موقف برقرار رکھنا فلسطینی مزاحمت کے لیے ایک سنگین تاریخی غلطی ہو گی۔

اس بات پر زور دینا بہت ضروری ہے کہ PA اور عرب حکومتوں کی طرف نقطہ نظر لچکدار ہونا چاہئے، مواقع سے فائدہ اٹھانے پر زور دینے کے ساتھ، ایک ایسی سخت پالیسی کے بجائے جو اندرونی جدوجہد کو حد سے باہر سمجھے یا عرب حکومتوں کی مخالفت کو مجموعی حکمت عملی سے انحراف سمجھے۔

فلسطینی مزاحمت کی تاریخ کا جائزہ لیتے وقت ایک اہم مشاہدہ یہ ہے کہ 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں ابھرنے والی تنظیمیں ماڈرن، یا حتیٰ کہ ماڈرنسٹ نوعیت کی تھیں۔ یہ درجہ بندی کے ڈھانچے تھے جو روایتی سماجی بندھن جیسے خاندان، قبیلہ یا برادری کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس تبدیلی کا سراغ دو بنیادی عوامل سے لگایا جا سکتا ہے: پہلا، فلسطینی معاشرے کے اندر سماجی اتھل پتھل، خاص طور پر پناہ گزین کیمپوں میں جہاں یہ تنظیمیں قائم ہوئیں، جس نے اس کے سماجی تانے بانے کو تبدیل کر دیا۔ اور دوسرا، ان نئے لیڈروں کا 1930 اور 1940 کی دہائیوں کی مزاحمتی حکمت عملیوں کے بارے میں منفی سوچ۔ انہوں نے مزاحمت کی اس شکل کو دیکھا، جو بڑی حد تک فضہ کے تصور پر مبنی تھی، ایک بے ساختہ اور قلیل مدتی، طویل مدتی منصوبہ بندی یا مرکزی قیادت کی کمی کے طور پر ضرورت مندوں کی مدد کے لیے نچلی سطح پر متحرک ہونا۔ ان کے نقطہ نظر سے، اس قسم کا متحرک ہونا ان عوامل میں سے ایک تھا جو نکبہ میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور ان سے بچنے کی ضرورت تھی۔

یہ عکاسی ایک اور نازک مسئلے کی طرف لے جاتی ہے جس نے فلسطین میں پے در پے ناکامیوں میں حصہ ڈالا: جدوجہد میں فعال شرکت سے لوگوں کا اخراج۔ یہ مسئلہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے، بشمول:

1. **جدید ریاست کی نوعیت:** جدید ریاست کی ثقافت اور نظام کا ایک وسیع اثر ہے، حتیٰ کہ مزاحمتی رہنماؤں پر بھی، جدوجہد کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو تشکیل دیتے ہوئے ایک منظم، مسلح فوج پر انحصار کرتے ہوئے خصوصی شاخوں کے ساتھ، جس میں عوامی شرکت کو خارج کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت، لوگوں کو شامل کرنے میں اکثر ہچکچاہٹ ہوتی ہے، کیونکہ فوج عوامی مزاحمت کو لڑائی میں وسائل کی بجائے ایک بوجھ کے طور پر دیکھتی ہے۔

2. **جدید ہتھیاروں کی نوعیت:** جدید جنگ اب بنیادی ہتھیاروں جیسے تلواروں، نیزوں یا تیروں کے بارے میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ آسان ترین ہتھیار جیسے رائفل، پستول اور گولے بھی ایک پیچیدہ پیداواری عمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ مسئلہ جدید ریاست کی نوعیت سے براہ راست جڑا ہوا ہے، جہاں ریاست کا ڈھانچہ اور اس کی فوج ہتھیاروں کی پیداوار کو متاثر کرتی ہے۔ نتیجہ سخت نکلا: ہم ایک ایسی قوم ہیں جس میں جنگجوؤں کی کمی نہیں ہے، لیکن ایک ایسی قوم ہے جس میں جنگجو اکثر ضروری ہتھیاروں اور گولہ بارود تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ کمی نکبہ میں ایک بڑا عنصر تھا۔ قابض اور اس کے اتحادی نظاموں نے جان بوجھ کر فلسطینیوں کو اسلحے تک رسائی سے انکار کیا اور جو جنگ میں نہیں مرے وہ یہودی فوجی ہتھیاروں کی زبردست برتری کی وجہ سے بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

3. **تکنیکی اور فوجی برتری:** صہیونی دشمن اور اس کے مغربی حامیوں کے پاس زبردست تکنیکی اور فوجی فائدہ اکثر بہادری، جرات اور یہاں تک کہ بڑی تعداد میں جنگجوؤں کو بے اثر کر دیتا ہے۔

4. صورتحال اس وقت پیچیدہ ہو جاتی ہے جب ہماری افواج ایسے دھڑوں میں بٹ جاتی ہیں جن میں ہم آہنگی، رسمی اور بھاری ہتھیاروں کا فقدان ہوتا ہے، جب کہ دشمن ایک انتہائی لیس، تکنیکی طور پر جدید فوج تیار کرتا ہے، جو پیچھے سے مسلسل سپورٹ کرتی ہے۔

یہ عوامل، دوسروں کے درمیان، ہمیں ایک "مسلح لوگوں" کے نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کرتے ہیں جہاں ہم جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کو جو بھی ہتھیار ہم کر سکتے ہیں ان سے لیس کرتے ہیں، اور ہمارے لیے دستیاب ماحول کی رکاوٹوں کے اندر وسائل فراہم کرتے ہیں۔

یہ کام تخلیقی صلاحیتوں اور جدت طرازی کے ساتھ مسلسل استقامت کا متقاضی ہے۔ یہ ایسے ہتھیاروں کی ڈیزائننگ پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو مقامی طور پر بڑی مقدار میں تیار کیے جاسکتے ہیں، جس سے عوام کو وسیع پیمانے پر مسلح کیا جاسکے۔ اختراعی ذہنوں نے پہلے ہی اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے متعدد خیالات پیش کیے ہیں۔ مرکزی سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل اور شہری آلات کو مزاحمت کے ہتھیاروں میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ اس کے لیے انجینئرز، ٹیکنیشنز، اور موجدوں کو اپنی مہارت کو عملی حل کی طرف منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ سوال بھی اتنا ہی اہم ہے کہ ڈیٹرنٹ ہتھیار کیسے تیار کیا جاسکتا ہے؟ اگر طیارہ شکن نظام تیار کرنا یا درآمد کرنا ناقابل حصول ثابت ہوتا ہے، تو فضائی بمباری سے نمٹنا اہم ہو جاتا ہے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے سے، فضائی حملے علاقائی تنازعات میں سب سے بڑا چیلنج ہیں۔ اس خطرے کو بے اثر کرنا جنگ کے نتائج کو یکسر تبدیل کر دے گا اور ممکنہ طور پر تاریخ کو دوبارہ لکھے گا۔ اگر فضائی طاقت کا براہ راست مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے تو کیا مزاحمتی قوتیں اپنے ذرائع میں اختراعات کر سکتی ہیں؟

اگرچہ ایک مسلح آبادی اور ہتھیاروں کی دستیابی کے بارے میں خدشات قابل فہم ہیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اچھی طرح سے مسلح آبادی کو زیر کرنا مشکل ہے، اگر ناممکن نہیں تو۔ کمیونٹیز کو اسلحے سے پاک کرنا اکثر قابضین کا کنٹرول کرنے کا پہلا قدم رہا ہے۔ خطے کے بہت سے بڑے دھچکے اس کے لوگوں سے ہتھیار چھیننے سے پیدا ہوئے، جس سے وہ اعلیٰ قوتوں کے لیے خطرے میں پڑ گئے۔

مزید برآں، وسیع پیمانے پر اسلحہ سازی سماجی دھڑوں، شہریوں اور حکام کے درمیان، اور آبادیوں اور قابضین کے درمیان متوازن سماجی حرکیات کو فروغ دے سکتی ہے۔ مسلح کمیونٹیز غیر مسلح افراد کے مقابلے میں کم جرائم کی شرح کا تجربہ کرتی ہیں، جہاں غیر چیک شدہ جرائم پیشہ عناصر کا غلبہ ہوتا ہے۔ عدم توازن اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جب قوانین کو نافذ کرنے والے خود کرپٹ یا جابر ہوتے ہیں۔

مسلح آبادی میں وقار اور لچک کا مضبوط احساس بھی پیدا ہوتا ہے، جس سے ہمت کو فروغ ملتا ہے اور قبضے کے خلاف مزاحمت کرنے کی زیادہ خواہش ہوتی ہے۔ یہ مقبول مزاحمت کے لیے ایک مضبوط بنیاد بناتا ہے، جو منظم تحریکوں کو ثابت قدم حمایت فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ ان معاملات سے متعلق خدشات فطری ہیں، لیکن یہ ناقابل تسخیر نہیں ہیں۔ "شیروں" کے ایک گروپ کو فوج میں منظم کرنا ناممکن سے بہت دور ہے — جو واقعی بیکار ہے وہ بھیڑوں یا مرغیوں کو سپاہیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے!

حوالہ جات

مائیکل اورین، پاور، فیتھ، اینڈ فینٹسی: امریکہ ان دی مڈل ایسٹ، 1776 تا حال، 2007۔

عبد العزیز عواد، ہجرت الیہود الا فلستین و مواقف الدولہ العثمانیہ منہا، مجلہ کلیات الادب، جامعۃ الریاض، 1974۔

عبد الوہاب المسیری، موصعات الیہود و الیہودیہ و السحیونیہ۔ پہلا ایڈیشن قاہرہ: دار الشرق، 1999۔

عبد الوہاب المسیری، موصعات الیہود و الیہودیہ و السحیونیہ (یہودیوں، یہودیت اور صیہونیت کا انسائیکلوپیڈیا)۔ قاہرہ: دار الشروق، 1999۔

عبد الوہاب الکیالی (ایڈیٹر)، الموسوع السیاسیہ (سیاست کا انسائیکلوپیڈیا)۔ بیروت: المعصصۃ العربیہ ل الدراسات و النشر۔

عبد اللہ الطال، کریتہ فلستین: مدحکیرات عبد اللہ الطال قدس معرکۃ القدس (فلسطین کی تباہی: عبد اللہ الطال کی یادداشتیں، یروشلم کی جنگ کے کمانڈر)۔ دوسرا ایڈیشن۔ دار الھدا، 1990۔

عبد اللہ عزام، الذخائر العزام، پشاور: مرکز عزام العلامی، 1997۔

احمد جبریل، ذاکرت الثورۃ الفلستینیہ المصرہ۔ دار الدلمون الجدیدہ، 2022۔

احمد منصور، احمد یاسین: شاہد عَلَی عصر الانتفاضہ (احمد یاسین: انتفاضہ پر گواہ)۔ قاہرہ: المکتب المصری الحدیث، 2004۔

Anis Sayigh, ʿAn Anis Sāyigh (انیس صیغ پر)۔ پہلا ایڈیشن۔ بیروت: ریاض الریئس، 2006۔

عارف المعارف، نقبت فلستین و فردوس المفقود۔ کفر قرأ، فلسطین: دار الھدا، 1956۔

اسد رستم: دی مصری رائل آرکائیوز: لیونٹ کے دستاویزات کا ایک بیان اور ان کو سمجھنے میں کیا مدد کرتا ہے اور محمد علی پاشا کے مقاصد کو واضح کرتا ہے، بیروت: امریکن یونیورسٹی، 1940، 1/ 44

اوطیف عبدالرحمن، مصر و فلسطین (مصر و فلسطین)۔ عالم المعرفہ سلسلہ نمبر 26۔ کویت: نیشنل کونسل آف کلچر، فروری، 1980۔

عونی فرسخ، التھادی والاستجابۃ فی السیرۃ العربی السحیونی: جو دور السیرۃ و قوانیۃ الدبیتہ (1949-1799)۔ پہلا ایڈیشن بیروت: مرکز دراسات الوحدہ العربیہ، جون 2008۔

بہجت ابو غربیہ، فی خدام الندال العربی الفلستینی۔ بیروت: مؤسسات الدراسات الفلستینیہ، 1993۔

بین ہالپرن اور یہوداریں ہارز، صیہونیت اور ایک نئے معاشرے کی تخلیق۔ آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1998۔

بینجمن نیتن یاہو، بی بی: میری کہانی۔ تھریشولڈ ایڈیشنز۔ نیو یارک: 2022۔

کارل بروکلمین، اسلامی لوگوں کی تاریخ۔ 5ویں عربی ایڈ۔ نبیح اے فارس اور منیر البابکی نے ترجمہ کیا۔ بیروت: دار العلوم لی المالعین، 1968۔

کونڈولیزا رائس، کوئی اعلیٰ اعزاز نہیں: واشنگٹن میں میرے سالوں کی یادداشت۔ عربی ایڈیشن۔ بیروت: دار الکتاب العربی، 2012۔

قسطنطین بازیلی، شام اور فلسطین عثمانی حکومت کے تحت، طارق مسرانی نے ترجمہ کیا، ماسکو: پروگریس پبلشرز، 1989 ڈیوڈر یوبنی، یومیت ڈیوڈر یوبنی (دی ڈائریز آف ڈیوڈر یوبنی)۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ استنبول: دارالاصول العلیمیہ، 2021۔

داؤد طارق، بہادر فاتح ابراہیم، قاہرہ: ہنداوی فاؤنڈیشن، 2014۔ ایرک ہوفر، دی ٹروبیلیور: تھیٹس آن دی نیچر آف ماس موومنٹس۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ ابوظہبی: Haiat ابوظہبی ل الثقفہ، 2010۔

عصام سخنی، طبریہ: تاریخ معاؤی (طبریہ: ایک انسائیکلوپیڈک تاریخ)۔ پہلا ایڈیشن بیروت: المعصصۃ العربیہ ل الدراسات والنشر، 2009۔

یوجین روگن، دی عربز: اے ہسٹری۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ قاہرہ: کلیمۃ العربیہ، 2011۔

فہمی الحویدی، ایران من الدخیل (اندر سے ایران)۔ پہلا ایڈیشن۔

قاہرہ: معاصص الاحرام، 1987۔

فتح الشقاقی، رحلت الدم ال لدھی حزم الصیف، (مکمل کام: خون کا سفر جس نے تلوار کو شکست دی)، قاہرہ: یافا سینٹر فار اسٹڈیز، 1997۔

فوزی القویقجی، فوزی القویقجی کی یادداشت۔ دوسرا ایڈیشن۔ دمشق: دار النمیر، 1995۔

جمال حمدان، اسراطیجیات الاستعمار والتحریر (نو آبادیات اور آزادی کی حکمت عملی)۔ پہلا ایڈیشن قاہرہ: دار الشروق، 1983۔

جارج ٹینٹ: طوفان کے مرکز میں: سی آئی اے میں میرے سال۔ عربی ایڈیشن۔ بیروت: دار الکتاب العربی، 2007۔

غازی الغوصیبی، الوزیر المرفیق۔ پہلا ایڈیشن۔ بیروت: المعصصۃ العربیہ ل الدراسات والنشر، 2010۔

ہیملٹن گِب اور ہیرالڈ بوون، اسلامی معاشرہ اور مغرب۔ پہلا عربی ایڈ۔ ترجمہ اور ترمیم احمد ابیش نے کی۔ ابو ظھبی: ابو ظھبی ٹورازم اینڈ کلچر اتھارٹی، 2012۔

حرب فلستین: الروایاہ الاسرائیلیہ الرسمیہ۔ ترجمہ احمد خلیفہ، دوسرا ایڈیشن۔ بیروت: معصصات الدراسات الفلستینیہ، 1986۔ ہیرالڈ ٹیمپرلے، انگلینڈ اینڈ دی نیئر ایسٹ، لندن، لانگ مینز گرین کمپنی، 1936۔

حسن سلامہ، خمستہ الف یوم فی البرزخ (برزخ کے دائرے میں پانچ ہزار دن)۔ پہلا ایڈیشن۔ بیروت: مرکز الزیتونہ، 2022۔

ہنری کسنجر، ورلڈ آرڈر: ریفلیکشنز آن دی کریکٹر آف نیشنز اینڈ دی کورس آف ہسٹری۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ بیروت: دار الکتاب العربی، 2015۔

ہلیری کلنٹن، مشکل انتخاب: ہلیری روڈھم کلنٹن کی یادداشت۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ بیروت: شرح المطبوط، 2015۔

حسین بن طلال، میرا کام بادشاہ ہے (مہناتی کا ملک)۔

ابن اثیر، الکامل فی التاریخ۔ پہلا ایڈیشن۔ بیروت: دار الکتاب العربی، 1997۔

ابراہیم غوشہ، المذنۃ الحمراء: سیرۃ دھتیہ (سرخ مینار: ایک خودنوشت)۔ دوسرا ایڈیشن۔ بیروت: مرکز الزیتونہ، 2015۔

جلال کشک، ثورات یون الامریکیہ (امریکی انقلاب

جولائی)، دوسرا ایڈیشن۔ قاہرہ: الزہراءلی الامام العربی، 1988

جوناتھن فرانکل، دمشق افیئر: رسمی قتل، سیاست، اور یہودی 1840 میں، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1997۔

کامل الشریف، الاخوان المسلمون فی حرب فلستین (فلسطین جنگ میں اخوان المسلمین)۔ تیسرا ایڈیشن۔ زرقا: مرتکبۃ المنار، 1984۔

کیرن آرمسٹرانگ، یروشلم: ایک شہر، تین عقائد (عربی ایڈ.)، قاہرہ: سوتر، 1998۔

لطیفہ سلیم، شام میں مصری حکومت ()۔ قاہرہ: مکتبۃ المدبولی، ایڈیشن 2۔ 1990.

ایم ایچ ہیکل، کلام فی السیاس: قدایاور جال (بات چیت: مسائل اور اعداد و شمار)۔ 7واں ایڈیشن۔ قاہرہ: المصریۃ لی النشر، 2002۔

محمود شیث خطاب، ارادت القتال فی الجہاد الاسلامی (اسلامی جہاد میں لڑنے کی خواہش)۔ دوسرا ایڈیشن۔ دمشق: دار الفکر، 1973۔

محمود عبد الحلیم، الاخوان المسلمون: احدث ثناء التاریخ۔ 5ویں ایڈیشن اسکندریہ: دار الدعوہ، 1994۔

ملیکہ اوفکر، چوری شدہ زندگی: صحرائی جیل میں بیس سال۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ بیروت: دار الجدید، 2006۔

میری ولسن، شاہ عبداللہ، برطانیہ اور میکنگ آف اردن۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ بیروت: قدموس، 1987۔

مائیکل اورین، پاور، فیتھ، اینڈ فینٹسی: امریکہ ان دی مڈل ایسٹ، 1776 ٹو دی پریزنٹ، (عربی ایڈیشن)، ترجمہ الہندوی فاؤنڈیشن، لندن، 2009۔

مائیکل ونٹر، سلطان اور غیر یہودی معاشرے کے ساتھ یہودی تعلقات، عثمانی دور کے دوران مصر میں یہودیوں کی تاریخ میں، یعقوب لینڈرا کی طرف سے، جمال احمد الرفاعی اور احمد عبد اللطیف حماد نے ترجمہ کیا۔ قاہرہ: سپریم کونسل آف کلچر، 2000۔

میخائل فینٹر: * یہودیوں کے حکام اور غیر یہودی معاشرے کے ساتھ تعلقات *، میں: یعقوب لنڈاؤ: * عثمانی دور کے دوران مصر کی آزادی *، قاہرہ: نیشنل سینٹر فار ٹرانسلیشن، 2000، صفحہ۔ 522.

موشے ساسن، مصریوں کی سرزمین میں 7 سال۔ پہلا عربی ایڈیشن۔ قاہرہ / دمشق: دار الکتاب العربی، 1994۔

محمد الہامی، فی عروقات التاریخ۔ پہلا ایڈیشن استنبول: دارالاصول العلیمیہ، 2022۔

محمد فرید، البہجۃ التوفیقیہ فی تاریخ مقصس الأعلاء الخودایۃ (کھیڈیویل خاندان کے بانی کی تاریخ کا خوش گوار حساب کتاب)۔2، قاہرہ: دار الکتب والوثاق القومیہ، 2005۔

محمد فوزی، حرب اکتوبر: دراسہ ودورس (اکتوبر کی جنگ: مطالعہ اور اسباق)۔ قاہرہ: الحیۃ المصریۃ العامۃ لی الکتاب، 2015۔

محمد حسنین ہیکل، قصات السویس: اخر المارک فی عصر العمالقہ (سویز کی کہانی: جنات کے دور میں آخری لڑائیاں)۔ دوسرا ایڈیشن۔ بیروت: شریعت المتبعات، 1982۔

منیر شفیق، من جمر الاجمر: صفات من مدخرات منیر شفیق۔

بیروت: مرکز دراسات الوحدہ العربیہ، 2021۔

مصطفٰی السباء، جہاد نا فی فلستین (فلسطین میں ہماری جدوجہد)۔ پہلا ایڈیشن۔

بیروت: دارالوراق، 2000۔

مصطفی کامل پاشا، المسعلہ الشرقیہ (مشرقی سوال)۔ دوسرا ایڈیشن مصر: مطبع اللواء، 1909۔

قاسم الریماوی، دخیل السور القدیم (پرانی دیوار کے اندر)۔ پہلا ایڈیشن۔ دوحہ: المرکز العربی لی العباح، 2020۔

ثقافت، دسمبر 1985۔

ریجینا شریف، غیر یہودی صیہونیت۔ عربی ایڈیشن۔ الام المعرفہ سلسلہ نمبر 96۔ کویت: قومی کونسل برائے ثقافت، دسمبر 1985۔

رابرٹ گیٹس، ڈیوٹی: جنگ میں سیکرٹری کی یادداشتیں۔ پہلا عربی ایڈیشن۔

بیروت: شریعت المتبعات، 2017۔

شکیب ارسلان، عروۃ التحاد بین اہل الجہاد۔ پہلا ایڈیشن شوف (لبنان): الدار التقدومیہ، 2009۔

Stanford J. Shaw، The Jews of the Ottoman Empire and the Turkish Republic، Hampshire: Macillan Press LTD، 1991۔

سلیمان ابو سیطح، حق العودہ (واپسی کا حق)۔ غزہ: نیشنل سینٹر فار اسٹڈیز اینڈ ڈاکیومنٹیشن، 1999

سوزان طحہ حسین، ماک (آپ کے ساتھ!) پہلا عربی ایڈ۔ قاہرہ: معاصسات ہنداوی، 2015۔

طہٰ الہاشمی، مذکرات طہٰ الہاشمی (طحہ الہاشمی کی یادداشت)۔ پہلا ایڈیشن۔ بیروت: دار التعلیٰ، 1978۔

طارق البشری، الحرکۃ السیاسیہ فی مصر (مصر میں سیاسی زندگی)۔ دوسرا ایڈیشن قاہرہ: دار الشروق، 2002۔

ایریل شیرون، ایریل شیرون کی خودنوشت، عربی ایڈیشن۔ ترجمہ انتوان عبید، بیروت: مکتبات بیسان، 1992۔

تھامس واکر آرنلڈ، تبلیغ اسلام۔ ویسٹ منسٹر: آرچیبالڈ کانسٹیبل، اینڈ کمپنی، 1896۔

نامعلوم مصنف، مذکر تطہیریہ عن حملت ابراہیم پاشاعالا سوریا، احمد غسان صبانو نے ترمیم کی۔

ولید سیف، الشہد و مشہود (گواہ اور گواہ)۔ پہلا ایڈیشن۔ عمان: العالیہ، 2016۔

ظاہر جبرین، حکمت الدم: من شرعین القسام (خون کی کہانی: القسام کی شریانوں سے)۔ پہلا ایڈیشن۔ دمشق: معاصسات فلستین لی الثقفہ، 2012۔



محمد الہامی اسلامی تاریخ اور تہذیب کے محقق ہیں، مصری انسٹی ٹیوٹ فار پولیٹیکل اینڈ اسٹریٹجک اسٹڈیز (استنبول) میں اسلامی تحریکوں کے یونٹ کے ڈائریکٹر ہیں، اور کئی عربی سائنسی جرائد کے لیے ترکی پیر کے جائزہ نگار ایسوسی ایشن آف عرب اکیڈمکس کے رکن ہیں۔

• اسلامی معاشیات میں امتیاز کے ساتھ ڈپلومہ رکھتا ہے۔

• صباحتین زیم یونیورسٹی (ترکی) میں اسلامی معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنا۔

• متعدد اشاعتوں میں معاون، بشمول المجتمع (کویت)، البیان (سعودی عرب)، اور ویب سائٹس جیسے الجزیرہ اور ترکی پوسٹ۔

• ترکی، مصر، قطر، سوڈان اور دیگر ممالک میں متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت کی۔

• الجزیرہ، TRT عربی)، الشرق، میکا میلین، اور الرفیدین جیسے چینلز پر تقریباً300 ٹیلی ویژن انٹرویوز میں نمایاں، اسلامی فکر اور تاریخ پر درجنوں لیکچرز اور کورسز دینے کے علاوہ۔

انہوں نے 10 کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں شامل ہیں:

- تاریخ کی راہداریوں میں–پہلا حصہ (2017)
- تاریخ کی راہداریوں میں– حصہ دو(2018)
- اسلامک فاؤنڈیشن آف آکسیڈینٹلزم کی طرف(2015)
- سوسائٹی کی تعمیر میں اسلام کا طریقہ کار(2015)
- محی الدین پیری رئیس(2014)
- خلافت عباسیہ کا سفر (3 جلدیں)(2013)

- عکاسی(2010)

مزید برآں، اس نے مصری اور عرب تحقیقی مراکز اور سائنسی جرائد میں متعدد ہم مرتبہ نظر ثانی شدہ تعلیمی مطالعات شائع کیں۔